رشتوں کی بازی

محی الدین نواب

فہرست

رشتوں کی بازی 5

اے طائر لاہوتی 71

دو پاٹن کے بیچ 160

رشتوں کی بازی

مجھے یقین ہے' جو میری روداد کو سمجھ پائے گا' تو وہ مجھے بھی اچھی طرح سمجھ سکے گا۔ وہ سمجھ سکے گا کہ میں اپنی عمر کی دوسری لڑکیوں کی طرح نہیں ہوں۔ مجھے عام لڑکیوں کی طرح دیکھا سمجھا اور پرکھا نہیں جاسکتا۔

میں کوئی گیند نہیں ہوں کہ مجھے ٹھوکروں میں رکھا جائے۔ گم ہوجانے کے لئے دور کہیں فضا میں اچھال دیا جائے پھر اسے بھلا دیا جائے کہ اونہہ' کہیں پڑا رہنے دو اسے' کوئی اٹھا کر لے جائے گا۔ ہوسکتا ہے' میری طرح دوسری لڑکیاں بھی خود کو خصوصی حیثیت دیتی ہوں لیکن میں پھر کہتی ہوں کہ میں دوسری لڑکیوں کی طرح نہیں ہوں۔ مجھے کوئی سمجھنے والا ہو' میں فہمیدہ عرف فہمی ہوں' غلط فہمی نہیں ہوں۔

غضب خدا کا۔ لوگ اتنے کند ذہن کیوں ہوتے ہیں؟ ایک لڑکی کو سمجھ نہیں پاتے تو مجھے ایسا لگتا ہے' جیسے پتھر سے سر ٹکرا رہے ہیں۔ میں تو ان کی ناشناسائی کے عذاب میں مبتلا ہوگئی ہوں۔

میرے سوتیلے والد موٹے بھدے اور ایک دم فضول سے آدمی ہیں۔ ان کی سوچتی ہوئی سنجیدہ گہری آنکھیں ایسے انتظار میں ڈوبی رہتی ہیں' جیسے کوئی ان کے سر پر چپت مار کر گزرنے والا ہو مگر کوئی گزرتا نہیں ہے۔ اس لئے آنکھوں میں سہا ہوا انتظار رہتا ہے۔

میری ممی کو رونا نہ آئے تب بھی منہ بسورتی رہتی ہیں۔ ناک پر رومال رکھ کر زور سے سانس باہر پھینکتی ہیں۔ سانس کے ساتھ نزلے کی سوغات باہر آتی ہے۔ نظر نہیں آتی' رومال میں چھپ جاتی ہے۔ وہ رومال لپیٹ کر مجھے یوں دیتی ہیں' جیسے کوئی تحفہ دے رہی ہوں۔ کوئی پوچھے کہ میں نے کچھ مانگا نہیں' وہ دیتی ہیں اور کیا کمال کی چیز دیتی ہیں؟

میں سمجھتی ہوں' ان کے دماغوں میں کوئی آسیب پھنسا ہوا ہے۔ دراصل انہوں نے مجھے جیسا بنایا' میں ویسی بن گئی اور وہ یہ بات بھول نہیں پاتے ہیں۔ میں خوب سمجھتی ہوں۔ اب اتنی بڑی ہوگئی ہوں کہ ان کے لئے ناقابلِ علاج ہوگئی ہوں۔ یہ بات انہیں ہلاک کرتی رہتی ہے۔ اوپر سے نہیں' اندر سے کرتی رہتی ہے۔ وہ مجھے بڑے تحمل سے

جھیل رہے ہیں۔

یہ بات بھی وہ برداشت کر رہے ہیں کہ ڈاکٹر زیدی میرے علاج سے مایوس ہو گئے ہیں۔ وہ میری بات کا جواب نہ دے سکا یا میری بات سمجھ نہ سکا۔ میں نے پوچھا۔ "ماضی اہم ہے یا حال..........؟"

اس نے عام سا جواب دیا "ماضی کچھ دے کر جاتا ہے' لیکن حال اہم ہے۔"

میں نے کہا۔ "ماضی میرا باپ بشیر احمد ہے۔ حال میرا سوتیلا باپ بدر عالم ہے۔ اب بولو' ماضی اہم ہے یا حال..........؟"

"زندگی کا جو دور تمہاری ماں کے لئے اہم ہے' وہی تمہارے لئے اہم ہے۔"

"ہر فرد کی اپنی زندگی ہے۔ مجھے بھی اپنی زندگی جینا ہے۔ ماں سوتیلے باپ کے نام سے جئے گی۔ میں کس باپ کے نام سے جیوں..........؟"

"تم فہمیدہ بنت بدر عالم کہلاتی ہو۔ اسی نام سے باقی زندگی گزارنی ہے۔"

"برتھ سرٹیفکیٹ میں فہمیدہ بنت بشیر احمد ہے۔ ماں میرے لئے سوتیلا باپ لے آئی۔ اسکول میں فہمیدہ بنت بدر عالم لکھوا دیا۔ میرے باپ سے لہو کے ایک قطرے کا حق چھین کر سوتیلے باپ کو دے دیا۔ ماضی میں لہو کا سچا قطرہ ہے۔ حال میں چھینا جھپٹی ہے۔ بولو ماضی اہم ہے یا حال..........؟"

"حال سے سمجھوتا کرو۔"

"ڈاکٹر زیدی! آپ اپنے باپ کا نام مٹا کر سوتیلے باپ کی ولدیت لکھیں گے؟"

"میرا ایک ہی باپ ہے۔"

"ماں چاہے گی تو سوتیلا آجائے گا۔ سگا چھوٹ جائے گا۔"

"کیا بکواس کر رہی ہو؟ میری ماں تمہاری ماں جیسی نہیں ہے۔ میری ماں.........."

وہ کہتے کہتے ٹھٹک گیا۔ میری ممی نے ناگواری سے پوچھا۔ "ڈاکٹر! تمہاری ماں میرے جیسی نہیں ہے۔ کیا کہنا چاہتے ہو؟ کیا میں آوارہ ہوں؟ بدچلن ہوں؟ میں نے باقاعدہ دوبارہ نکاح نہیں پڑھوایا ہے؟"

وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ یہ کہتا ہوا چلا گیا۔ "میں اس کا علاج نہیں کر سکوں گا۔ یہ ایب نارمل ہے۔ ایب نارمل رہے گی۔"

ممی نے تھوڑی دیر تک مجھے بے بسی سے دیکھا پھر کہا۔ "تم ایب نارمل نہیں ہو۔ خوامخواہ بنتی ہو۔ میرے اندر احساسِ جرم پیدا کرتی رہتی ہو۔"

میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "آپ کو جرم کا احساس نہیں ہونا چاہئے۔ کیونکہ آپ نے تو باقاعدہ دوسرا نکاح پڑھوایا ہے۔"

وہ بولیں۔ "نکاح بھی پڑھوایا ہے اور دل سے بدر عالم کو مجازی خدا مانتی ہوں۔ تم انہیں باپ نہیں مانتیں۔ وہ تمہیں سگی بیٹی کی طرح چاہتے ہیں اور تم سوتیلی بن کر رہتی ہو۔"

میں نے الجھتے ہوئے پوچھا۔ "یہی تو میں پوچھتی ہوں' وہ مجھے سگی بیٹی کی طرح کیوں چاہتے ہیں؟ میرے اپنے باپ کی چاہت کیا کم ہے؟"

"اب وہ تمہارا باپ نہیں ہے۔"

"آپ نے طلاق لی۔ وہ آپ کے شوہر نہیں رہے۔ طلاق کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ میرے باپ بھی نہ رہے۔"

میں نے شیشے کا گلدان اٹھا کر فرش پر پھینک دیا۔ وہ ٹوٹ کر دور تک بکھر گیا۔ وہ ڈانٹ کر بولیں۔ "کیا پھر پاگل پن کا دورہ پڑ رہا ہے؟"

جو دیکھے گا' یہی کہے گا کہ مجھ پر یوں ہی پاگل پن کا دورہ پڑتا ہے۔ کیا واقعی ایسا ہے؟ کوئی مجھے سمجھتا کیوں نہیں ہے؟ میرا سوتیلا باپ شیشے کا گلدان ہے۔ وہ اپنے اندر میری محبت کے جتنے بھی پھول سجائے' پھر بھی ٹوٹ جائے گا۔

ممی نے میرے باپ کو دور پھینک دیا' وہ بیٹی کے دل سے نہ ٹوٹا ہے' نہ ٹوٹے گا۔ اتنی سی بات ممی کی سمجھ میں نہیں آتی کہ خون' خون ہوتا ہے' شیشے کا گلدان نہیں ہوتا۔ کسی کے دل میں اور دماغ میں محبت کو جبراً ٹھونس نہیں سکتے۔ میں پتھر کو ابو کہوں گی تو وہ پتھر ہی رہے گا۔ ابو کو پتھر کہا جائے گا' تب بھی وہ میرے ابو ہی رہیں گے۔

شام کو میرے سوتیلے والد بدر عالم دفتر سے آئے۔ ماں نے میری شکایتیں کیں۔

"ڈاکٹر زیدی نے اس کا علاج کرنے سے انکار کر دیا ہے۔"

بدر عالم نے کہا۔ "انکار کرنے دو۔ یہ بیمار ہے' نہ ایب نارمل ہے۔ تم کیوں خوامخواہ اس کے ذہن پر بوجھ ڈالتی ہو؟"

وہ میرے لئے ایک خوبصورت شلوار سوٹ لائے تھے۔ وہ اکثر کچھ نہ کچھ لاتے رہتے تھے۔ میں کبھی کوئی فرمائش نہیں کرتی تھی۔

انہوں نے وہ سوٹ پیس میری طرف بڑھایا۔ میں نے اسے لے کر ایک صوفے پر ڈال دیا۔ ممی نے مجھے تیز نظروں سے گھورا پھر ان سے کہا۔ "آپ کیوں اس کے لئے

چیزیں لاتے ہیں؟ اس کے تیور دیکھیں۔ سیدھے منہ بات نہیں کرتی ہے۔ میں نہیں چاہتی' آپ اس کے لئے تحفے لایا کریں۔"

بدر عالم جب بھی میری ناراضگی دور کرنے کے لئے میرے قریب آتے تو ممی معنی خیز انداز میں بولنے لگتی تھیں۔ میں پندرہ برس کی تھی' آٹھویں جماعت میں پڑھتی تھی۔ یہ بتاتی چلوں کہ میری ممی بہت خوبصورت اور جوان تھیں۔ انہیں دیکھ کر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ دو شوہروں کو بھگتا چکی ہیں اور مجھ جیسی بیٹی کی ماں ہیں۔ دیکھنے والے ہم دونوں کو بہنیں سمجھتے تھے۔

وہ مجھے کہتی تھیں۔ "لوگ ہمیں بہنیں سمجھتے ہیں تو سمجھنے دو۔ تمہیں سچ بولنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بائی داوے۔ تم مجھے باجی کیوں نہیں کہتیں؟"

وہ میری ماں تھیں اور ماں بہت عظیم ہستی ہوتی ہے لیکن انہوں نے میرے ابو کو چھوڑ کر اپنی اہمیت کم کردی تھی اور دوسری شادی کر کے صرف یہ نہیں کہ ابو کو اپنی محبت سے محروم کیا ہے بلکہ میرے حصے کی ممتا بھی کم کردی ہے۔

آئینہ کسی کو نہیں دیکھتا' سب آئینے کو دیکھتے ہیں۔ ممی تو جیسے آئینہ دیکھنے کے لئے ہی پیدا ہوئی تھیں۔ فرصت نہ ملے تب بھی فرصت نکال کر اپنے عکس کے روبرو آجاتی تھیں۔ خود کو جگہ جگہ سے چھو کر دیکھتی تھیں۔ کہیں کوئی کمی تو نہیں رہ گئی ہے؟

وہ دوپٹے کو بوجھ سمجھتی تھیں۔ اسے سلیقے سے اوڑھو تو یہ بدن کے چیختے ہوئے حصوں کو چھپالیتا ہے وہ مجبوراً اسے شانے پر ڈال کر چھوڑ دیتی تھیں۔ وہ زمین پر گھسٹتا ہوا ان کے پیچھے پیچھے چلتا تھا۔ بدر عالم نے شادی سے پہلے ان کے نام ایک کوٹھی اور ایک کار لکھ دی تھی اور ان کے اکاؤنٹ میں پچیس لاکھ روپے جمع کرا دیئے تھے۔ جب وہ فخر سے اپنی کار میں بیٹھتیں تو دوپٹے کا پلو دروازے میں ضرور پھنستا تھا اور باہر کی طرف لہراتا جاتا تھا۔

وہ چاہتی تھیں' کوئی اشارے سے بتائے کہ دوپٹا پھنسا ہوا ہے۔ یوں بتانے والا انہیں دیکھے پھر دیکھتا ہی رہ جائے۔ وہ بڑے شاہانہ انداز میں متوجہ کرتی تھیں۔

ان کے مزاج میں یہ تضاد تھا کہ وہ دوپٹے کو میرے سینے اور سر پر رکھنے کی تاکید کرتی رہتی تھیں۔ کہیں بھی جاؤں' مجھ پر کڑی نظر رکھتی تھیں۔ خود آزادی سے گھومتی پھرتی تھیں لیکن میرے آنے جانے پر پابندیاں لگاتی رہتی تھیں۔ صرف اسکول جانے اور آنے کی آزادی تھی۔ جب میں واپس آتی تو میرے اسکول بیگ کی تلاشی لیتی تھیں کہ

کہیں کسی نے مجھے لَو لیٹر تو نہیں دیا ہے؟ جب کہ میں پندرہ برس کی تھی اور وہ مجھے وقت سے پہلے بالغ بنا رہی تھیں۔

آئینہ کہتا تھا اور دنیا بھی کہتی تھی کہ میں اپنی ممی کی طرح خوبصورت اور پُرکشش ہوں۔ بس ان کی طرح بھرپور جوان نہیں ہوں' لیکن بدن اشارے دے رہا تھا کہ بھرپور ہوجاؤں گی۔ آتی جاتی نظریں مجھے ٹٹولنے لگی تھیں۔

ایک بار اسکول کے گیٹ سے باہر آرہی تھی۔ وہاں دو چار لڑکے کھڑے ہوئے تھے۔ ان میں سے کوئی کہہ رہا تھا۔ "یہ لڑکی جوان ہو کر ستائے گی' جوانوں کو جوانی میں' جوانی کے تقاضوں سے۔"

ایک اور لڑکے کی آواز سنائی دی۔ "ابھی یہ پیدل ہے' اگلے برس دوڑے گی' اس سے اگلے برس اڑتی پھرے گی۔"

ممی پہلے سے زیادہ محتاط ہوگئی تھیں۔ پہلے تو صرف اسکول بیگ کو چیک کیا جاتا تھا مگر اب میرے واش روم کی کیبنٹ اور الماری کی تلاشی بھی لی جانے لگی تھی۔ یہ کوئی دوستانہ رویہ نہیں تھا۔ اس لئے ان سے محبت کم سے کم اور نفرت زیادہ سے زیادہ ہوتی جارہی تھی۔ گھر سے اسکول جاتے میری ایک چھوٹی سی دنیا تھی۔ اس دنیا میں چند سہیلیاں تھیں' اسکول ٹیچر اور میری ممی تھیں۔ مجھے کسی سے بیزاری نہیں تھی۔ سب ہی اچھے لگتے تھے۔ صرف ممی ایسی تھیں جن کی آواز دور سے ہی سن کر میں بیزار ہوجاتی تھی۔

میرے سوتیلے والد حسن پرست تھے۔ تب ہی تو انہوں نے میری ممی سے شادی کی تھی۔ ان جیسے دولت مند کو درجنوں کنواری لڑکیاں مل سکتی تھیں' لیکن ممی میں کچھ خاص باتیں ہوں گی' خاص ادائیں اور غیر معمولی کشش ہوگی۔ اس لئے انہوں نے میرے ابو سے انہیں چھین لیا تھا۔ دوسرے کی عورت کو چھین لینے کی مردانگی سے ایک عجیب طرح کی مسرت حاصل ہوتی ہے۔

عورت بھی کم نہیں ہوتی۔ ممی نے اپنی خوبصورتی اور دلکشی کے چیک کو اچھی طرح کیش کرایا تھا۔ ایک گنجے اور بھدے شخص سے صرف دولت کی خاطر شادی کی تھی۔

میرے اپنے ابو شاعر اور دانشور کہلاتے تھے۔ بس اتنا ہی کماتے تھے کہ ضرورتیں پوری ہوجائیں۔ انہوں نے کوٹھی' کار اور بینک بیلنس کے بارے میں کبھی نہیں سوچا۔ اسی بات پر میری ممی نے پٹڑی بدل لی۔ ابو کو چھوڑ دیا اور بدر عالم کے پاس آگئیں۔

میرے ابو کو یہ اطمینان تھا کہ میں ان کی اپنی بیٹی ہوں' جہاں بھی رہوں گی میری

رگوں میں ان کا خون گردش کرتا رہے گا اور میں ان کے ہی نام سے پہچانی جاؤں گی۔ ممی دوسروں سے کم تر رہنا نہیں چاہتی تھیں۔ انہیں مفلسی اور محتاجی سے ہول آتا تھا۔ میرے ابو سے دن رات جھگڑتی رہتی تھیں۔ ابو نے اپنی محدود دنیا میں پُرسکون رہنے کی خاطر انہیں طلاق دے دی۔

دونوں نے اس لین دین میں مجھے نظر انداز کردیا۔ انہوں نے عام والدین کی طرح سوچا کہ بچے تو کہیں بھی پل جاتے ہیں۔ جب یتیم خانے میں پرورش ہوجاتی ہے تو سوتیلے باپ کے سائے میں بھی ہوسکتی ہے۔

میرے ابو مجھ سے دور ہوگئے۔ میری ممی کے لئے کوئی فرق نہیں پڑا' بدرعالم ان کے قریب آگئے۔ ان کی دل جوئی کرنے والا انہیں مل گیا۔ میری دل جوئی کرنے والا' مجھے سگی محبتیں دینے والا کوئی نہیں رہا۔ میرے اندر محرومیوں کا احساس پیدا کرنے والی میری ممی ہیں۔

میں نے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ انٹر میں داخلہ لیا تو انیس برس کی ہوچکی تھی۔ ایسی بھرپور ہوگئی تھی کہ ممی سے انیس بیس کا فرق رہ گیا تھا۔ وہ بوتیک سے ایک لباس اپنے لئے لائی تھیں۔ مجھے وہ بہت اچھا لگا تھا۔ میں نے اسے پہن کر دیکھا تو وہ مجھے دیکھتی کی دیکھتی رہ گئیں۔ یہ ثابت ہورہا تھا کہ ماں' بیٹی کا بدن ایک ہی ہے۔ ایک ہی طرح دیکھنے والی نگاہوں کو پکارتا ہے۔

وہ پریشان ہوکر بولیں۔ "اسے اتار دو۔ ایسے تنگ لباس نہ پہنا کرو۔"

"آپ کیوں پہنتی ہیں؟"

"میں شادی شدہ ہوں۔ مجھ سے بحث نہ کرو۔"

"کیا مرد شادی شدہ عورتوں کو نہیں دیکھتے؟ آنکھیں بند کرلیتے ہیں؟ آپ صرف شادی شدہ نہیں ہیں۔ ایک جوان بیٹی کی ماں بھی ہیں۔ آپ کو تو چادر لپیٹ کر رہنا چاہئے۔"

"تم میری ماں نہیں ہو کہ مجھے پہننا' اوڑھنا سکھاؤ گی۔"

"نانی جان نے آپ کو میری عمر میں یہ نہیں سکھایا تھا' جو آپ مجھے سکھا رہی ہیں۔ آپ تو یہ کتابی چہرہ لے کر' کتاب کے رنگین سرورق کی طرح خود کو دکھاتی پھرتی تھیں۔ آپ کو میری فکر کیوں ہے؟ میری طرف سے کیا اندیشہ ہے؟ ان دنوں جب آپ کو کوئی بھگا کر نہیں لے گیا تو مجھے کون بھگا کر لے جائے گا؟"

"مجھے میلی نگاہوں سے بچنا آتا ہے۔ میں بدنیت لوگوں کو ان کی باتوں سے اور ان کی گھاتوں سے پہچان لیا کرتی تھی۔ یہ چالاکی تم میں نہیں ہے۔"

"میری عمر کی سب ہی لڑکیاں چالاک ہوتی ہیں۔ کوئی ایک بات کہے تو ہم اس بات کے پیچھے چھپے ہوئے ارادوں کو سمجھ لیتی ہیں۔ آپ کے بدرعالم صاحب' آپ کے لئے بھی شاپنگ کرتے ہیں اور میرے لئے بھی شاپنگ کرتے ہیں۔ میں خوب سمجھتی ہوں' آپ کے لئے کی جانے والی شاپنگ کو وہ بیوی کی ضرورت سمجھتے ہیں اور میرے لئے خریدی ہوئی ہر چیز کو وہ تحفے کے طور پر پیش کرتے ہیں۔"

انہوں نے چونک کر مجھے دیکھا۔ انہیں یہی بات کھٹکتی تھی کہ بدرعالم صاحب ان کے ساتھ مجھے بھی کیوں شاپنگ کے لئے لے جاتے ہیں؟ اگر نہ بھی لے جائیں تو میرے لئے پرفیوم اور کاسمیٹک کا سامان کیوں لے کر آتے ہیں؟ اور مجھے ان کے لائے ہوئے پرفیوم کیوں پسند آتے ہیں؟

میں ان کی لائی ہوئی چیز بھلا کیوں پسند کروں گی؟ مجھے تو وہ گنجا اور بھدا سا آدمی زہر لگتا تھا۔ میں تو ان حضرت کی چیزیں اس لئے قبول کرتی تھی کہ وہ ممی کے کچھ لگتے تھے۔ یوں بھی شاپنگ کسے بری لگتی ہے؟ دل پھینکنے والے نوٹ پھینک پھینک کر شاپنگ کراتے ہیں۔ جو تیز طرار ہوتی ہیں وہ شاپنگ کرتی ہیں بعد میں ٹھینگا دکھا دیتی ہیں پھر وہ حضرت تو سوتیلے باپ کی حیثیت سے شاپنگ کراتے تھے۔

رہ گئی پرفیوم کی بات تو یہ میری کمزوری ہے۔ مجھے بچپن ہی سے خوشبوؤں اور رنگوں سے پیار ہے۔ میری سہیلیاں میرے مزاج کو سمجھتی تھیں۔ جب میں کلاس میں اول آتی تھی' یا کبھی سالگرہ مناتی تھی تو وہ مجھے تحفے کے طور پر پرفیوم ہی پیش کرتی تھیں۔ بدرعالم بھی بزنس کے سلسلے میں لندن اور پیرس جاتے تو میرے لئے ایسے ایسے پرفیوم لاتے تھے جو یہاں نایاب ہوتے ہیں۔ یہ بات ممی کو کھٹکتی تھی۔

میں پوچھتی ہوں' وہ کھٹکتی کیوں تھیں؟ کیوں اندیشوں میں مبتلا رہتی تھیں؟ دوسری شادی کرتے وقت یہ کیوں نہ سوچا کہ بیٹی دو چار برسوں میں جوان ہونے والی ہے؟ سوتیلا تو پھر سوتیلا ہی ہوتا ہے۔ وہ سگی بیٹی کبھی نہیں سمجھے گا۔ میں بدر عالم کو جتنا نظرانداز کرتی تھی' وہ اتنا ہی میری محبت کا دم بھرتے رہتے تھے۔ ان کی محبت کچھ سمجھ میں نہیں آتی تھی۔

ویسے ایک بات ایمان کی کہوں گی۔ انہوں نے کبھی کوئی چھچھوری حرکت نہیں کی۔

وہ مجھے للچائی ہوئی نظروں سے نہیں، تعریفی نظروں سے دیکھتے تھے۔

میرے بال لانبے تھے۔ کمر سے نیچے تک آتے تھے۔ میں چوٹی گوندھتی تھی تو وہ میری چال کے ساتھ متوالی ہوجاتی تھی۔ اس کولہے سے اس کولہے تک جھومتی اور ٹکراتی تھی۔ ممی تو دیکھ کر جل جاتی تھیں۔ چوٹی تو بری لگتی ہی تھی کھلے ہوئے بال کالی گھٹا بن کر چہرے کو چاند بنا دیتے تھے۔ وہ کہتی تھیں۔ "بالوں کو سمیٹ کر رکھا کرو۔ اتنے لمبے بال کیا ضروری ہیں؟ کچھ چھوٹے نہیں کراسکتیں؟"

وہ میرے بالوں کو ہی نہیں میری پرسنالٹی کو بھی چھوٹا کرنا چاہتی تھیں۔ ان کے اندر خیال چبھتا رہتا تھا کہ میں ان کے مقابلے میں نمایاں ہوتی جارہی ہوں۔ اس میں میرا کیا قصور تھا؟ عمر کے ساتھ ساتھ از خود شادابیاں نکھرتی جاتی ہیں۔

ایک روز وہ یونہی اچانک میرے کمرے میں آگئیں۔ میں آئینے کے سامنے بال کھولے بیٹھی تھی۔ کبھی سر جھٹک کر کالی گھٹاؤں کو دائیں شانے پر لارہی تھی، کبھی بائیں شانے پر لاکر مختلف زاویوں سے اپنے آپ کو دیکھ رہی تھی۔ ایسے ہی وقت آئینے میں ان کا عکس دکھائی دیا۔ وہ گہری سوچتی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھیں۔ ان کا ایک ہاتھ دوپٹے میں چھپا ہوا تھا۔ ان کے چہرے سے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ پس و پیش میں ہوں۔ اندر ہی اندر جیسے جنگ جاری تھی کہ یہ کہنا چاہئے۔ نہیں ابھی نہیں کہنا چاہئے۔ ابھی یہ کر گزرنا چاہئے۔ نہیں ابھی کچھ کرنا مناسب نہیں ہے۔

میں نے کہا۔ "آپ کے وہ ایک بجے کی فلائٹ سے آنے والے ہیں، اور ایک بج چکا ہے۔"

"تم بدر عالم کو کبھی میرا ہزبینڈ کہتی ہو، کبھی "وہ" کہتی ہو، کبھی انہیں مخاطب کرنا ہو تو سنئے، دیکھئے، جیسے الفاظ استعمال کرتی ہو۔ کتنی بار کہا ہے، انہیں ڈیڈی یا پاپا کہا کرو۔"

"اور میں نے کتنی بار جواب دیا ہے کہ میرا ایک ہی باپ ہے۔ میں کسی اور کو پاپا یا ڈیڈی نہیں کہوں گی۔"

"تم تو پہلے دن سے انہیں باپ تسلیم نہیں کر رہی ہو۔ بیویوں کی طرح انہیں مخاطب کرتی ہو۔ کچھ شرم حیا ہے بھی یا نہیں؟"

"میرے بارے میں ایسی رائے قائم کرتے وقت آپ کو شرم آنی چاہئے۔"

"میں پوچھتی ہوں، دوپہر کو ایک بجے آئینے کے سامنے بن سنور رہی ہو۔ کس کے لئے؟ وہ ابھی بنکاک سے آرہے ہیں۔ اس لئے؟ یہ جانتی ہو کہ وہ تمہارے لئے بڑے قیمتی

تحفے لائیں گے۔"

میں نے وہاں سے اٹھ کر کہا۔ "پلیز ممی! آپ یہاں سے جائیں۔ ورنہ میں یہاں کی چیزیں توڑنا پھوڑنا شروع کروں گی تو آپ ہمیشہ کی طرح ایب نارمل کہنے لگیں گی۔"

انہوں نے مجھے گھور کر دیکھا پھر پلٹ کر دروازے تک گئیں۔ اسے کھولنے کے لئے ہینڈل کو گھمایا۔ ایسے ہی وقت کچھ گرنے کی آواز سنائی دی۔ وہ فوراً ہی جھک کر اسے اٹھانے لگیں۔ میں نے ذرا آگے بڑھ کر دیکھا، ان کے پیروں کے پاس ایک قینچی پڑی ہوئی تھی۔ وہ اسے اٹھا کر دوپٹے میں چھپاتی ہوئی دروازے سے باہر چلی گئیں۔

میں سوالیہ نظروں سے کھلے ہوئے دروازے کے باہر دیکھ رہی تھی۔ ذہن میں بہت سے سوالات گڈمڈ ہو رہے تھے۔ بات کچھ کچھ سمجھ میں آرہی تھی۔ میں تھوڑی دیر تک گم صم سی رہی، پھر آئینے کے سامنے آکر بیٹھ گئی۔ کھلے ہوئے بالوں کو سمیٹ کر چوٹی گوندھنے لگی۔

بنکاک سے آنے والی فلائٹ لیٹ تھی۔ ممی نے فون کیا تو پتا چلا کہ فلائٹ ایک گھنٹہ لیٹ ہے۔ میں دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد لاؤنج میں آکر ٹی وی دیکھنے لگی۔ ممی بے چینی سے کبھی بیڈ روم میں جارہی تھیں، کبھی لاؤنج میں آرہی تھیں اور کبھی باہر لان میں چلی جاتی تھیں پھر انہوں نے لاؤنج میں آکر کہا۔ "بند کرو یہ ٹی وی۔ میں یہاں پریشان ہوں اور تمہیں تفریح کی سوجھ رہی ہے۔"

میں نے ان کی بات ایک کان سے سنی، دوسرے کان سے اڑا دی۔ ان کی طرف دیکھا تک نہیں، ٹی وی کی طرف دیکھتی رہی۔ وہ پاؤں پٹختی ہوئی ٹی وی کے پاس گئیں پھر ایک بٹن دبا کر اسے بند کر دیا۔ دراصل وہ کچھ کرنا چاہتی تھیں اور کر نہیں پارہی تھیں۔ اس لئے جھنجلاہٹ کا مظاہرہ کر رہی تھیں۔

میرے قریب اسٹول پر ایک ایش ٹرے رکھی ہوئی تھی۔ میں نے اسے اٹھا کر کہا۔ "اگر آپ نے ٹی وی آن نہیں کیا تو میں اسے توڑ دوں گی۔"

میں نے ایش ٹرے سے ٹی وی کا نشانہ لیا۔ ڈاکٹر نے انہیں سمجھایا تھا کہ مجھے غصہ نہ دلایا جائے ورنہ میں ایب نارمل ہوتی جاؤں گی۔ انہوں نے ناگواری سے منہ بنا کر اسے آن کر دیا پھر پاؤں پٹختی ہوئی وہاں سے چلی گئیں۔ ریموٹ کنٹرول میرے ہاتھ میں تھا۔ میں چینل بدل بدل کر دیکھنے لگی پھر ایک چینل پر رک گئی۔ وہاں ایک فلم چل رہی تھی۔ اس کا ایک سین دیکھتے ہی دلچسپی پیدا ہوگئی۔ ایک شخص ڈائننگ ٹیبل پر کھا رہا تھا۔ اچانک

ہی اس کے ہاتھ سے لقمہ چھوٹ گیا۔ وہ اپنے حلق پر ہاتھ رکھ کر سانسیں لینے کی کوشش کر رہا تھا لیکن سانسیں ساتھ نہیں چھوڑ رہی تھیں۔ قریب ہی اس کی بیوی قہقہہ لگا رہی تھی۔ دوسرا شخص وہاں آیا تو اس سے لپٹ گئی۔ کہنے لگی۔ "زہر اپنا اثر دکھا رہا ہے۔ یہ چند گھڑیوں کا مہمان ہے۔"

اس کا شوہر بے دم ہو کر میز پر اوندھے منہ گر پڑا۔ اس کے دیدے پھیل گئے۔ وہ مر چکا تھا۔ دوسرے شخص نے کہا۔ "یہاں سے چلو۔ ورنہ یہ الزام آئے گا کہ ایک بیوی نے اپنے خاوند کو زہر دے کر ہلاک کیا ہے۔"

وہ مردہ شوہر کو وہاں چھوڑ کر اپنے یار کے ساتھ دروازہ کھول کر باہر چلی گئی۔ فلم کی کہانی دلچسپ تھی اسی وقت کار کا ہارن سنائی دیا۔ میں نے اٹھ کر کھڑکی سے باہر دیکھا۔ دربان گیٹ کھول رہا تھا بدر عالم کی کار احاطے میں داخل ہو رہی تھی۔ میں نے دوسری طرف دیکھا۔ ممی کے بیڈ روم کا دروازہ بند تھا۔ وہ کار کی آواز سن کر بھی باہر نہیں آ رہی تھیں۔

یہ ان کے ناز نخرے تھے۔ وہ شوہر کا استقبال کرنے کے لئے بنگلے کے باہر نہیں آتی تھیں۔ آنے والا خود ان کے بیڈ روم میں جا کر ان کی خیریت معلوم کرتا تھا۔ بدر عالم شروع ہی سے ان کے ناز نخرے اٹھاتا آیا تھا۔ پتا نہیں کیوں ممی کا اتنا دیوانہ تھا۔ اس نے انہیں سر پر چڑھا رکھا تھا۔

میں پھر فلم دیکھنے میں مصروف ہو گئی۔ وہ لاؤنج کا دروازہ کھول کر اندر آیا۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں بڑے بڑے شاپنگ بیگ تھے۔ وہ انہیں ایک سنٹر ٹیبل پر رکھ کر ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ میں اسے نظر انداز کر رہی تھی۔ وہ مسکرا کر بولا۔ "میں باہر سے آتا ہوں تو تم مجھے سلام ضرور کرتی ہو۔ معلوم ہوتا ہے' ممی سے پھر جھگڑا ہوا ہے۔ ہے نا یہی بات؟ ویسے وہ محترمہ کہاں ہیں؟"

میں نے ٹی وی سے نظریں ہٹائے بغیر کہا۔ "اپنے کمرے میں.........."

"تم اتنی ناراض ہو کہ میری طرف دیکھنا بھی نہیں چاہتیں۔ بھئی جھگڑا ممی سے ہوتا ہے اور غصہ مجھے دکھاتی ہو۔ تم مجھے گنجا کہتی تھیں نا؟ اب میں گنجا نہیں رہا۔ ایک بار مجھے دیکھ تو لو۔"

میں نے سر گھما کر دیکھا۔ اس نے وگ پہنی تھی۔ چہرہ بدل سا گیا تھا۔ اب اسے دیکھا جا سکتا تھا۔ میں نے کہا۔ "صورت بدل گئی ہے۔ شخصیت بدل گئی ہے۔ اچھے لگ

رہے ہیں۔ ممی کو یہ صورت دکھائیں۔"

"جب تمہارا موڈ ایسا ہے تو تمہاری ماں کا موڈ نہ جانے کیسا ہوگا؟ ویسے اتنے خوبصورت اور مہنگے تحفے خرید کر لایا ہوں کہ بیگم صاحبہ دیکھتے ہی خوش ہو جائیں گی۔"

اس نے اٹھ کر ایک بیگ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "یہ تمہاری ممی کے لئے ہے اور یہ بیگ تمہارے لئے.........."

وہ بیگ اٹھا کر اسے سامنے رکھ کر میرے قریب بیٹھ گیا۔ میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ "تم جتنی بیزاری اور نفرت ظاہر کرتی ہو' مجھے اتنی ہی محبت تم سے ہونے لگتی ہے۔ میرا دل تمہیں بیٹی کہنے کے لئے مچلتا رہتا ہے لیکن میں کہہ نہیں سکتا کیونکہ تم مجھے باپ کا درجہ نہیں دے رہی ہو۔"

اس نے میری کلائی کو مضبوطی سے پکڑا تھا۔ میں نے چھڑانا چاہا تو اس نے ایک جھٹکے سے مجھے صوفے پر بٹھا دیا پھر کہا۔ "ٹھیک ہے' مجھے ڈیڈی نہ کہو لیکن اپنا بزرگ اور سرپرست تو سمجھو۔ اس حوالے سے ہی مجھے محبت اور عزت دو۔ تمہارے اندر ایک سگے باپ سے محرومی ہے۔ یہ محرومی تمہیں اپ سیٹ کرتی ہے۔ اس کا منفی رد عمل مجھ پر ظاہر نہ کرو۔ میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں' اس کا اندازہ یوں لگاؤ کہ مجھے تمہاری سالگرہ کا دن یاد ہے۔ یہ بیگ سالگرہ کا تحفہ ہے۔ ہیپی برتھ ڈے ٹو یو فہمی!"

اچانک جیسے دھماکا ہوا۔ ایک شیشے کی ایش ٹرے ہمارے سامنے فرش پر آ کر گری اور زور دار آواز کے ساتھ ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ وہ لاؤنج کے انٹرنس پر کھڑی ہمیں گھور کر دیکھ رہی تھیں۔ بدر عالم نے فوراً ہی میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔ مجھ سے ذرا دور ہو کر بولا۔ "آؤ۔ آؤ شیریں! آج ہماری فہمی کی سالگرہ ہے۔ اسے مبارک باد دو۔"

اسے گھر کے سربراہ کی حیثیت سے غصہ دکھانا چاہئے تھا۔ یوں ایش ٹرے توڑنے کی وجہ پوچھنا چاہئے تھی لیکن وہ خوشامدانہ انداز میں بول رہا تھا۔ ممی نے اسے نظر انداز کر کے' میری طرف آتے ہوئے کہا۔ "اچھا تو تُو اسی لئے یہاں اکیلی بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھی؟"

اس سے پہلے کہ میں کچھ بولتی' انہوں نے میرے بالوں کو مٹھی میں جکڑ لیا پھر ایک زور دار جھٹکا دیا مجھے یوں لگا جیسے میری گردن کی ہڈی ٹوٹ جائے گی۔ میرے حلق سے چیخ نکل گئی۔ میں اپنے بالوں کو چھڑانے کی کوشش کرنے لگی۔ وہ مجھے بچانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ "یہ.......... یہ کیا کر رہی ہو؟ جوان بیٹی کے ساتھ ایسا سلوک نہیں کرنا

چاہئے۔ چھوڑو اسے..........."

وہ میرے بالوں کو ان کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کرنے لگا۔ انہوں نے ایک اور جھٹکا دیا۔ میں پھر ایک بار چیخ پڑی۔ بدرعالم نے ذرا سختی سے کہا۔ "تم بہت اوور ہو رہی ہو۔ سمجھنے کی کوشش کرو۔ تمہارا غصہ' تمہاری بد مزاجی اسے گستاخ بنا دیتی ہے۔ تمہیں خدا کا واسطہ۔ اسے چھوڑ دو۔"

یہ کہتے ہوئے وہ ہم دونوں کو الگ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ انہیں پیچھے دھکیل رہا تھا۔ میرے بال ان کی مٹھی میں تھے۔ وہ دھکے کھا کر پیچھے جاتیں تو میرے بالوں پر اور کھنچاؤ پڑنے لگتا۔ مجھے تو یوں لگ رہا تھا جیسے آج تمام بال ٹوٹ کر ان کے ہاتھوں میں آجائیں گے۔ میرے بالوں کو چھوٹا کرنے کی حسرت پوری ہو جائے گی۔

جب بدرعالم نے دیکھا کہ وہ جنون میں مبتلا ہو رہی ہیں' سمجھانے سے نہیں سمجھ رہی ہیں تو پھر اس کے سامنے ایک ہی راستہ رہ گیا۔ اس نے ممی کے گال پر ایک زوردار طمانچہ جڑ دیا۔ ان کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی' مجھے نجات مل گئی۔ میں سر کو تھام کر صوفے پر ڈھے گئی۔

وہ بدرعالم کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھنے لگیں۔ ان کی آنکھوں میں غصے کے ساتھ ساتھ حیرانی بھی تھی۔ وہ ایک ایک لفظ کو چباتے ہوئے بولیں۔ "آپ.......... آپ نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا؟ مجھ پر..........؟"

وہ ایسے پوچھ رہی تھیں' جیسے مار کھانے کے بعد بھی یقین نہ آرہا ہو۔ شادی کے پہلے دن سے وہ ناز نخرے اٹھانے والا ایک خوشامدی شوہر ثابت ہوتا رہا تھا۔ آج اس نے بے اختیار مردانگی دکھائی تھی لیکن اب شرمندہ سا ہو رہا تھا۔ ان سے نظریں چرا رہا تھا۔ ممی نے اچانک اس کا گریبان پکڑ لیا اور اسے جھنجوڑتے ہوئے بولیں۔ "آپ نے مجھ پر ہاتھ اٹھانے کی جرأت کیسے کی؟ کیا.......... اس لڑکی کی خاطر..........؟ بولیں۔ جواب دیں۔ کیا آپ سمجھتے ہیں' میں اندھی ہوں؟ کچھ دیکھتی نہیں ہوں؟ کچھ سمجھتی نہیں ہوں..........؟ آپ دونوں نے مجھے عقل کی اندھی سمجھ لیا ہے؟"

بدرعالم نے ایک جھٹکے سے اپنا گریبان چھڑایا۔ وہ جھٹکا کھا کر ایک دم سے پیچھے چلی گئیں۔ اس نے کہا۔ "سمجھنے کی کوشش کرو۔ جب تمہاری بدمزاجی مجھ جیسے صابر کو ہاتھ اٹھانے پر مجبور کر سکتی ہے تو اولاد کو گستاخ اور باغی بھی بنا سکتی ہے۔ تم یہ سمجھنے سے قاصر ہو کہ اپنی بیٹی اور اپنے شوہر کے بارے میں کیسی شرمناک باتیں کر رہی ہو؟"

عورت پھر عورت ہوتی ہے' اپنے مرد پر قبضہ جمائے رکھنے کے لئے بیٹی کو بھی سوکن سمجھنے لگتی ہے۔ حسد اور جلاپے کے وقت رشتوں کے تقدس کو سمجھنا نہیں چاہتی۔

وہ ایک دم سے لپک کر میرے پاس آئیں اور دونوں ہاتھوں سے میرا گلا دبانے لگیں۔ میں بوکھلا گئی۔ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس قدر سمجھانے کے باوجود دوبارہ حملہ کریں گی۔ میں اپنے دونوں ہاتھوں سے ان کے ہاتھوں کو ہٹانے کی کوشش کرنے لگی۔ بدرعالم بھی مجھے نجات دلانے کے لئے ہم دونوں کو الگ کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن وہ تو جونک کی طرح چمٹ گئی تھیں۔ مجھے چھوڑنا ہی نہیں چاہتی تھیں۔ میں اِدھر اُدھر ہاتھ پاؤں مار رہی تھی۔ میرا دم رک رہا تھا۔ آخر میں نے وہ کیا' جو میری سمجھ میں آیا۔ وہ ہمیشہ مجھے ناخن بڑھانے سے منع کرتی تھیں لیکن میں ضد میں آکر انہیں بڑھائے رکھتی تھی۔ اس وقت وہی کام آئے۔ میں اپنا بایاں ہاتھ ان کی پیشانی پر لے گئی۔ میرے ناخن ان کی جلد میں کھب گئے۔ میں نے انگلیوں کا دباؤ ڈالا پھر دباؤ ڈالتی ہوئی پیشانی سے ٹھوڑی تک پہنچ گئی۔

وہ حلق پھاڑ کر چیختی ہوئی' مجھے چھوڑ کر پیچھے ہٹ گئیں۔ ایک ہاتھ سے چہرے کو چھو کر دیکھا تو ہتھیلی پر اپنا لہو دکھائی دیا۔ وہ چیخ کر دوڑتی ہوئی آئینے کے سامنے گئیں۔ ایک ہاتھ سے چہرے کو چھو کر دیکھا تو ہتھیلی پر اوپر سے لے کر نیچے تک لہو کی لکیریں پڑ گئی تھیں۔ وہ حلق پھاڑ پھاڑ کر چیخنے لگیں۔ میں نے ان کے حسن' ان کی دلکشی پر ان کے ہی لہو سے دستخط کئے تھے۔

"میں زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ مار ڈالوں گی۔ آج اسے جان سے مار ڈالوں گی.........."

وہ دونوں مٹھیاں بھینچتی ہوئی میری طرف پلٹیں لیکن اس سے پہلے کہ وہ میری طرف لپکتیں' بدرعالم نے انہیں دونوں بازوؤں میں جکڑ لیا۔ وہ تڑپ کر گرفت سے نکلنا چاہتی تھیں۔ ان کے سر پر خون سوار ہو گیا تھا۔ بدرعالم نے مردانگی کا مظاہرہ کیا۔ انہیں اٹھا کر کاندھے پر لاد کر لے جانے لگا۔ وہ تڑپ رہی تھیں۔ مچل رہی تھیں۔ مجھے گالیاں دے رہی تھیں لیکن اس نے انہیں بیڈ روم میں لے جا کر دروازے کو اندر سے بند کر لیا۔

میں اطمینان کی سانس لے کر صوفے پر گر پڑی۔ اپنی گردن کو سہلانے لگی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ ابھی تک گلا دبا رہی ہیں۔ اف.......... ان کی انگلیاں تھیں یا لوہے کی سلاخیں۔ چھوڑنا ہی نہیں چاہتی تھیں۔ میں آنکھیں بند کئے اپنے حالات پر غور کر رہی تھی۔ اچانک قہقہوں کی آواز سن کر آنکھیں کھول دیں۔ ٹی وی آن تھا۔ اس ہنگامے میں

کسی نے اسے بند نہیں کیا تھا۔ ایک عورت اور مرد قہقہے لگانے کے بعد گلے مل رہے تھے۔ یہ وہی فلم چل رہی تھی۔ اس عورت نے اپنے شوہر کو زہر دے کر ہلاک کیا تھا پھر اپنے یار کے ساتھ چلی گئی تھی۔ میں نے حیرانی سے دیکھا۔ فلم کے آخری سین میں وہ عورت اپنے اسی شوہر سے گلے مل رہی تھی' جسے زہر دے کر ہلاک کیا تھا۔ وہ مر چکا تھا پھر زندہ کیسے ہوگیا تھا؟ ان کے قریب ایک اخبار پڑا ہوا تھا۔ اخبار میں اس عورت کے یار کی تصویر چھپی تھی اور جلی حرفوں میں لکھا تھا کہ اس شخص کو زہر دے کر ہلاک کیا گیا ہے۔

فلم ختم ہوگئی۔ میں اس کا درمیانی حصہ نہیں دیکھ پائی تھی۔ یہ سسپنس سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ عورت کیا بلا تھی۔ آغاز میں اس نے شوہر کو زہر دے کر ہلاک کیا۔ انجام میں اسی مردہ شوہر کو گلے لگا رہی تھی اور اس کے یار کی موت زہر کھانے سے ہوئی تھی۔

میرے اپنے حالات ایسے تھے کہ میرے بدن کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ سر بھاری ہو رہا تھا۔ میں اس فلم کی پیچیدہ کہانی کو سمجھنے کے موڈ میں نہیں تھی۔ میں نے ریموٹ کنٹرول اٹھا کر ٹی وی کو بند کر دیا۔ وہاں سے اٹھ کر اپنے بیڈ روم میں آئی اور بیڈ پر اوندھے منہ گر کر ایک دم سے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ایسے وقت میرے ابو شدت سے یاد آ رہے تھے۔ میں ہفتے میں ایک دن ان کے پاس جاتی تھی اور اکثر ایک رات گزار کر وہاں سے آتی تھی۔ اس وقت جی چاہ رہا تھا' ان کے پاس جاؤں اور ان سے بھی جھگڑا کروں۔

"آپ نے ممی سے شادی کیوں کی؟ اور شادی کی تو مجھے پیدا کیوں کیا؟ اور جب پیدا کیا تو خود میری ذمے داریاں کیوں نہیں اٹھا رہے ہیں؟ مجھے سوتیلے باپ کے گھر میں کیوں پھینک دیا ہے؟"

میں نے سوتیلے باپ کے بارے میں سوچا۔ پہلی بار دل نے کہا' وہ سوتیلا نہیں ہے۔ میری ممی سوتیلی ہیں۔ سوتیلی ماں سے بھی بدتر ہیں۔ اس عالی شان کوٹھی میں آنے کے بعد بدرعالم نے پہلے ہی دن سے مجھے محبتیں دی تھیں لیکن میرے دماغ میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ اس نے میرے ابو سے میری ممی کو چھین لیا ہے۔ اب یہ حقیقت سمجھ میں آ رہی تھی کہ ایسی تبدیلیاں عورت کی رضامندی سے ہوتی ہیں۔ ممی میرے ابو کو چھوڑ کر بدرعالم کے پاس آئی ہیں۔

میں سوتیلے باپ کو سمجھ نہیں پائی۔ وہ ممی سے جتنی محبت کرتا تھا۔ اتنی ہی محبت مجھ سے بھی کرتا تھا۔ میری بیزاری اور نفرت کے باوجود ہمیشہ شفقت سے پیش آتا تھا۔ اس روز اس نے بڑی محبت اور بڑے دکھ سے کہا تھا۔ "تم مجھے باپ کا درجہ نہیں دیتیں' نہ

دو۔ مجھے ڈیڈی نہ کہو لیکن اپنا بزرگ اور سرپرست تو سمجھو۔ اس حوالے سے ہی مجھے محبت اور عزت دو۔"

مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ میں ناانصافی کر رہی ہوں۔ محبتیں دینے والے کو ایک ذرا سی محبت نہیں دے رہی ہوں۔ بے شک.......... وہ میرے سرپرست ہیں' میں ان کا دیا ہوا کھاتی پیتی ہوں اور عیش و آرام سے رہتی ہوں۔ مجھے احسان تو ماننا چاہئے۔ بے شک.......... وہ میرے بزرگ ہیں' میں ان کی عزت تو کر سکتی ہوں لیکن بدتمیزی سے کہتی ہوں۔ "وہ آتا ہے۔ جاتا ہے۔ کھاتا ہے۔ پیتا ہے۔"

نہیں.......... میں نے بہت زیادتی کی ہے۔ آئندہ میں انہیں ادب سے مخاطب کروں گی۔ اگر انہیں ڈیڈی نہیں کہنا چاہتی تو بدرعالم بھی نہیں کہوں گی' انہیں انکل کہا کروں گی۔

میں ان کے بارے میں محبت سے سوچنے لگی تو ممی کی ایک بات یاد آئی۔ انہوں نے کہا تھا۔ "میں اور بچے پیدا کرنا نہیں چاہتی۔ خدا کا شکر ہے' بدرعالم سے کوئی اولاد نہیں ہوگی۔ وہ بانجھ ہیں۔ میڈیکل رپورٹ کے مطابق وہ کبھی باپ نہیں بن سکیں گے۔"

ممی کی یہ بات یاد آئی تو سمجھ میں آیا' وہ میری بے نیازی اور بیزاری کے باوجود مجھ سے محبت کیوں کرتے ہیں؟ وہ ہمیشہ اولاد سے محروم رہیں گے۔ یہ محرومی انہیں میری طرف کھینچتی ہے۔ مجھے اپنی بدمزاجی پر ندامت ہوئی۔ میں ان کے پیار کی صداقت کو سمجھ نہیں پائی تھی۔ ان کے اندر کبھی نہ پیدا ہونے والی اولاد چھپی ہوئی ہے۔ وہ اس کی تمام محبتیں مجھ پر نچھاور کرتے رہتے ہیں۔

میں اپنے بیڈ روم کا دروازہ اندر سے بند کر کے لیٹ گئی۔ باہر انکل (بدرعالم) ممی کو سمجھا منا رہے تھے۔ انہوں نے فون کر کے ڈاکٹر کو بلایا تھا۔ اس نے چہرے پر پڑی ہوئی خراشوں کو دیکھ کر کہا۔ "زخم گہرے نہیں ہیں۔ میں انجکشن لگا رہا ہوں۔ کھانے کے لئے دوائیں اور لگانے کے لئے مرہم دے رہا ہوں۔ یہ زخم جلد ہی بھر جائیں گے۔"

ممی چاہتی تھیں کہ حسین چہرے پر زخم کا نشان تک نہ رہے ڈاکٹر نے کہا۔ "زخم بھرنے کے بعد کچھ تو نشانات رہیں گے۔ شاید مہینوں یا برسوں میں وہ نشانات مٹ جائیں۔"

وہ روتی ہوئی انکل سے بولیں۔ "کیا میں مہینوں اور برسوں تک منہ چھپا کر رہوں گی؟ گھر سے باہر کیسے نکلوں گی؟ اس دشمن لڑکی نے مجھے منہ دکھانے کے قابل نہیں

چھوڑا ہے۔“

انہوں نے ممی کو تھپک کر کہا۔ ”تمہارے چہرے پر کوئی نشان نہیں رہے گا۔ یہ پہلے کی طرح بے داغ رہے گا۔“

”آپ مجھے جھوٹی تسلیاں نہ دیں۔“

”میں سچ کہہ رہا ہوں۔ زخم بھرنے کے بعد نشانات رہیں گے تو میں چہرے کی پلاسٹک سرجری کرادوں گا۔“

ممی کو ذرا اطمینان ہوا۔ وہ بولیں۔ ”آپ میڈم سیمی کو بلائیں۔ وہ بہت تجربے کار بیوٹیشن ہے۔ وہ مجھے صحیح مشورہ دے گی۔“

میڈم سیمی ایک بہت معروف بیوٹی پارلر کی مالکن تھیں۔ ممی انہی کے پاس بنتی سنورتی رہتی تھیں۔ اپنے حسن کو اور فگر کو پُرکشش رکھنے کے لئے ماہانہ پچیس‘ پچاس ہزار روپے میڈم سیمی کو دیتی رہتی تھیں۔ انہیں بلایا گیا تو وہ فوراً ہی دوڑی چلی آئیں۔ ممی کے چہرے کو دیکھ کر کہا۔ ”شیریں! فکر نہ کرو۔ میں تو برسوں کے داغ دھبے چہروں سے مٹا دیتی ہوں۔ تمہارا چہرہ پہلے کی طرح نکھر جائے گا۔“

ممی کو اطمینان ہوا تو گھر میں بھی امن و امان قائم ہوگیا۔ رات کے کھانے پر میں ڈائننگ روم میں نہیں گئی۔ ان سے سامنا کرتی تو وہ مجھے دیکھ کر پھر غصے سے بھڑکنے لگتیں۔ میں نے کچن میں جاکر روٹی کھالی۔ انکل کھانے کے بعد لان میں ٹہلتے تھے پھر اپنے معمول کے مطابق گیارہ بجے تک نیند کی گولیاں کھاکر سوجاتے تھے۔

وہ لان میں ٹہلنے آئے تو مجھے دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولے۔ ”آج تم بھی ٹہلنے آئی ہو؟“

”میں آپ سے باتیں کرنے آئی ہوں۔ آپ سے معافی مانگنے آئی ہوں۔“

انہوں نے حیرانی سے پوچھا۔ ”کس بات کی معافی؟“

”میں آپ سے بدتمیزی سے پیش آتی رہی ہوں۔ میں آپ کی محبت کے جواب میں نفرت اور بیزاری کا مظاہرہ کرتی رہی ہوں۔ میں آئندہ کسی قسم کی گستاخی نہیں کروں گی۔“

انہوں نے خوش ہوکر کہا۔ ”خدا تمہیں نیکی دے۔ کیا تم مجھے بیٹی کا پیار دو گی؟“

میں نے ہاں کے انداز میں سرہلایا۔ انہوں نے میرے سرپر بڑی شفقت سے ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”میں دولت مند ہونے کے باوجود تمہیں اتنی خوشیاں نہیں دے سکتا۔ جتنی

خوشیاں آج تم مجھے دے رہی ہو۔ بیٹی! مجھے ڈیڈی کہو گی نا؟“

میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ”وہ.......... بات یہ ہے کہ.......... آپ برا نہ مانیں۔ باپ تو ایک ہی ہوتا ہے۔ صرف اسی کو ابو‘ ڈیڈی یا پاپا کہنا چاہئے۔“

”ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ میں تمہارے احساسات کو سمجھ رہا ہوں۔ تم اپنے ابو کا حق کسی کو نہیں دینا چاہتیں۔ کوئی بات نہیں۔ تم نے آج تک کسی رشتے سے مجھے مخاطب نہیں کیا۔ تم چاہو تو مجھے انکل کہہ سکتی ہو۔“

”جی ہاں۔ میں یہی کہنا چاہتی ہوں۔“

وہ خوش ہوکر مجھے دعائیں دینے لگے۔ پہلی بار وہ میرے ابو کے دشمن اور رقیب نہیں لگ رہے تھے۔ ایک اچھے انسان لگ رہے تھے۔ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ میں پہلی بار ایک انسان کو پہچان رہی تھی۔

تھوڑی دیر تک باتیں کرتے رہنے کے بعد ہم اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ میں بستر پر آکر لیٹ گئی۔ شام پانچ بجے سے رات آٹھ بجے تک سوتی رہی تھی۔ اس لئے نیند نہیں آرہی تھی۔ میں لاؤنج میں آکر ٹی وی آن کرکے دیکھنے لگی۔ تھوڑی دیر تک چینل تبدیل کرتی رہی۔ نظریں ٹی وی اسکرین پر تھیں لیکن گہری سوچ میں تھی۔ اپنے حالات پر غور کررہی تھی۔ آئندہ انکل مجھے پہلے سے زیادہ محبتیں دیں گے اور ممی پہلے سے زیادہ مشتعل ہوتی رہیں گی۔ مجھے کبھی سکون سے رہنا نصیب نہیں ہوگا۔ میں نے سوچا۔ انکل سے کہوں گی کہ ایم اے کرنے تک میرا انتظام کسی گرلز ہاسٹل میں کرادیں۔

میں نے ٹی وی کو آف کردیا۔ آدھی رات ہوچکی تھی۔ میں اپنے بیڈ روم میں آئی۔ ہم سب کے بیڈ روم اوپری منزل پر تھے۔ میرے اور ممی کے بیڈ رومز کی بالکونیاں ایک دوسرے کے قریب تھیں۔ میں بالکونی میں آئی تو ممی کی آواز سنائی دی۔ وہ کسی سے کہہ رہی تھیں۔ ”ہاں۔ وہ گولیاں کھاکر سوگئے ہیں۔ اب صبح ہی ان کی آنکھ کھلے گی..........“

میں نے سر گھماکر دیکھا۔ وہ بالکونی کی ریلنگ سے ٹیک لگائے کھڑی تھیں۔ موبائل فون کان سے لگائے بول رہی تھیں۔ ”وہ چار دنوں کے لئے بنکاک گئے تھے۔ ہمیں دن رات ملنے کی آزادی تھی۔ اب پھر محتاط رہنا ہوگا..........“

ان کی پشت میری طرف تھی۔ کسی سے کہہ رہی تھیں۔ ”آج میرے ساتھ بڑی ٹریجڈی ہوئی ہے۔ اس کتے کی بچی نے اپنے لانبے ناخنوں سے میرا منہ نوچ لیا ہے۔“

وہ دوسری طرف کی باتیں سن کر بولیں۔ ”اسے گالی نہ دوں تو اور کیا کروں؟ بدر

نے اسے بچالیا۔ ورنہ میں اسے جان سے مار ڈالتی۔ اس نے میری صورت بگاڑ دی ہے۔ آئینہ دیکھتی ہوں تو رونا آتا ہے۔"

وہ ریلنگ سے ٹیک لگائے ہوئے تھیں۔ سیدھی کھڑی ہوگئیں۔ میں دیوار کی آڑ میں آگئی۔ وہ گھوم کر میری بالکونی اور کمرے کو دیکھ رہی تھیں اور کہہ رہی تھیں۔ "کمرے کی لائٹ آف ہے۔ زیرو پاور کی روشنی ہے۔ مجھ سے دشمنی کرکے اسے سکون مل گیاہے۔ ذلیل کمینی سو رہی ہے۔"

وہ ذرا چپ ہوئیں پھر بولیں۔ "غصہ تھوک رہی ہوں۔ بدرعالم بھی کہہ رہے تھے کہ اولاد ہے۔ پہلی غلطی سمجھ کر معاف کردو۔ اونہہ......... معاف کیا کروں گی؟ اس کی تو صورت دیکھنے کو جی نہیں چاہتا۔ وہ میرے سامنے آئے گی۔ مجھ سے بات کرے گی تو زہر لگے گی۔"

میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اکثر گھروں میں ماں بیٹیوں کے درمیان جھگڑے ہوتے ہیں لیکن ایسی دشمنی نہیں ہوتی ہوگی' جیسی ممی مجھ سے کررہی تھیں۔

اب گفتگو کا موضوع بدل گیا تھا۔ وہ بڑے رومانٹک لہجے میں بول رہی تھیں۔ "یہ تو میرا دل ہی جانتا ہے کہ میں تم سے دور رہ کرکیسے زندگی گزار رہی ہوں۔ آخر ہم چوری چھپے کب تک ملتے رہیں گے۔"

وہ چپ ہوئیں پھر بولیں۔ "نہیں ایک بار طلاق لے کر مطلقہ کہلاتی رہی ہوں۔ اب دوسرے شوہر سے طلاق لے کر تمہارے پاس نہیں آؤں گی۔ تمہیں انتظار کرنا ہوگا۔"

میں شدید حیرانی سے ان کی باتیں سن رہی تھی۔ یہ نیا انکشاف ہو رہا تھا کہ وہ دوسرے کے بعد تیسرا شوہر کرنے والی ہیں۔ میں کان لگا کر توجہ سے سن رہی تھی۔ وہ کہہ رہی تھیں۔ "میں نے ایکسرے دیکھا ہے۔ اس کے دل میں سوراخ ہے۔ ڈاکٹر نے مجھے تنہائی میں کہا تھا' زندگی کم ہوگئی ہے۔ وہ جتنے مہینے یا سال تک جی لے' یہ اس کی قسمت ہے۔ ویسے کسی دن بھی وہ اللہ کو پیارا ہوسکتا ہے۔ اس کے بعد ہی میں تمہاری زندگی میں آسکوں گی۔"

ایک دم سے میرے دماغ میں آندھی سی چلنے لگی۔ صاف سمجھ میں آرہا تھا کہ وہ انکل (بدرعالم) کے بارے میں بول رہی ہیں۔ ان کے دل میں سوراخ تھا۔ ان کی زندگی کم سے کم تھی۔ دل کسی دن بھی دھڑکنے سے انکار کرسکتا تھا۔ "یا خدا! یہ میں کیا سن رہی ہوں۔ وہ اچھے انسان ہیں۔ آج میرے دل میں ان کے لئے محبت پیدا ہوئی ہے اور آج

ہی ایسی دردناک خبر سن رہی ہوں۔"

میں دیوار سے ٹیک لگائے کھڑی تھی۔ میرے پاؤں کانپ رہے تھے۔ میں آہستہ آہستہ اکڑوں بیٹھ گئی۔ ان کے لئے میرا دل محبت اور ہمدردی سے بھر گیا تھا۔ جب ممی دلہن بن کر اس گھر میں آئیں تو میں تیرہ برس کی تھی۔ اب انیس برس کی ہوچکی تھی۔ میں نے اس عرصے میں اس نیک انسان سے نفرت ہی کی تھی۔ اب محبت ہو رہی تھی تو یہ صدمہ پہنچ رہا تھا کہ ان کی عمر کم ہے گویا میری محبت کی عمر کم ہے۔ میں انہیں زیادہ محبتیں نہیں دے سکوں گی۔

ممی کو کسی سے محبت نہیں تھی۔ میرے ابو ان کی ضرورتیں پوری نہیں کرسکتے تھے۔ اس لئے انہیں ٹھکرا دیا۔ دوسرے شوہر سے بھی محبت نہیں تھی۔ ہمدردی بھی نہیں تھی۔ بڑی بے حسی سے دوسرے کی موت کا اور تیسرے کی آمد کا انتظار کر رہی تھیں۔

وہ تیسرا بھی کوئی دولت مند ہوگا۔ پتا نہیں' یہ دولت مند حضرات کسی ایسی حسین عورت کے پیچھے کیوں پڑجاتے ہیں جو غیر معمولی کشش رکھتی ہو۔ انکل بدرعالم کی زندگی میں آنے کے بعد ممی کو اونچی سوسائٹی میں اچھی خاصی مقبولیت حاصل ہوئی تھی۔ وہ قد اور جسامت کے حوالے سے بھی اتنی گریس فل تھیں کہ پہلی ہی ملاقات میں دل والوں کے دل دھڑکا دیتی تھیں۔ غیر معمولی حسین عورتیں دل والوں اور دولت والوں کے لئے چیلنج بن جاتی ہیں کہ ایسی کسی حسینہ سے پہلے کون فیض حاصل کرے گا۔ اگر وہ کسی کی ہوچکی ہے تو کتنی اونچی آفر دے کر اسے حاصل کیا جاسکے گا۔

ممی کو بھی کسی نے بڑی آفر دی ہوگی لیکن وہ دوسرے شوہر کی آخری سانسوں تک یہاں رہنا چاہتی تھیں۔ یہاں رہ کر بیوہ ہونے کے دو فائدے تھے۔ ایک تو مرحوم کی تمام دولت اور جائیداد حاصل ہوجاتی۔ دوسری بات یہ کہ ماتمی لباس میں بیوہ کا حسن اور زیادہ چیختا پکارتا ہے۔ ویسے بھی دستور یہی ہے۔ پرانے مال کو مارکیٹ میں پیش کرنے سے پہلے اسے نئے زاویوں سے چمکایا جاتا ہے۔

مجھے انکل بدرعالم پر ترس آرہا تھا۔ میں ان کے متعلق سوچتی رہی اور آگے سن نہ سکی کہ ممی فون پر کیا کہتی رہی تھیں؟ میں نے دیوار کے پیچھے سے سر نکال کر دیکھا۔ وہ بالکونی میں نہیں تھیں' کمرے میں جاچکی تھیں۔ میں سر جھکائے سوچتی ہوئی اپنے بستر پر آگئی۔

ممی نے دوسری شادی کی تو میں ایب نارمل ہوگئی۔ رفتہ رفتہ نارمل ہوئی تو یہ نئی اور شرمناک بات معلوم ہوئی کہ دوسرے شوہر کی زندگی میں ہی تیسرے سے معاملہ سیٹ کر چکی ہیں۔ میں نے جب سے یہ بات سنی تھی' مجھے شرم آرہی تھی۔ ممی کے لئے یہ شرم کی نہیں فخر کی بات تھی کہ بیٹی کے جوان ہونے کے بعد بھی وہ جوان تھیں۔ حسن' شباب' پرفیکٹ فگر اور گلیمر کے باعث ابھی تک ان کی مارکیٹ ویلیو تھی۔ لعنت ہے۔

میں لعنت بھیج کر سوگئی۔ صبح دیر تک سوتی رہی۔ آنکھ کھلی تو سر بھاری ہو رہا تھا۔ فریش ہونے کے لئے غسل خانے میں چلی گئی۔ تقریباً پندرہ منٹ تک شاور کے نیچے کھڑی رہی۔ بہت سکون ملتا رہا۔ ساری تھکن دور ہوتی رہی۔ غسل سے فارغ ہو کر کمرے میں آئی تو ممی کو دیکھ کر چونک گئی۔ وہ سر جھکائے ایک کرسی پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ میں خلافِ توقع انہیں اپنے کمرے میں دیکھ کر گھبرا گئی۔ انہیں سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔ انہوں نے سر اٹھا کر دیکھا تو چہرے پر خراشوں کے نشانات کھرنڈ کی صورت میں دکھائی دیئے۔ وہ بڑی نرمی سے دھیمی آواز میں بولیں۔ "یہ جو کچھ ہو رہا ہے' اچھا نہیں ہے۔ کبھی تم ایب نارمل ہو جاتی ہو۔ کبھی میں۔ ایسا نہیں ہونا چاہئے۔"

ان کے انداز میں صلح پسندی تھی۔ مجھے اطمینان ہوا۔ میں آئینے کے سامنے آکر ہیئر ڈرائر سے بالوں کو خشک کرنے لگی۔ میں نے جواب نہیں دیا۔ ان کا منہ نوچنے کے سلسلے میں معافی نہیں مانگی کیونکہ میرا قصور نہیں تھا۔ وہ اس قدر جارحیت پر اتر آئی تھیں کہ ان سے نجات پانے کے لئے جوابی حملہ کرنا ضروری ہوگیا تھا۔ انہوں نے پوچھا۔ "کیا مجھ سے نہیں بولو گی؟"

"کیا بولوں؟ آپ مجھ سے زیادہ سمجھ دار ہیں۔ میں پہلے آپ سے بہت کم بولتی تھی۔ آپ نے مجھے زبان چلانے پر مجبور کیا پھر خواہ مخواہ مجھ پر پابندیاں عائد کرنے لگیں تو مجھے بھی ضد ہوگئی۔ آپ سمجھ دار ہو کر بھی نہیں سمجھتیں کہ ہر عمل کا اچھا برا ردِ عمل ضرور ہوتا ہے۔ چیونٹی کو چیونٹی نہیں سمجھنا چاہئے۔ وہ ننھی سی مخلوق مار نہیں سکتی تو کاٹتی ضرور ہے۔ آپ گلا دبا رہی تھیں' میرا دم گھٹ رہا تھا۔ میرے پاس بچاؤ کا اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے مجبور ہو کر پہلی بار آپ پر حملہ کیا......... میں اس کے لئے سوری کہہ سکتی ہوں۔"

وہ کرسی سے اٹھ کر میری طرف آتے ہوئے بولیں۔ "سوری نہ کہو' معافی نہ مانگو پھر بھی میں تمہیں معاف کرچکی ہوں۔"

میں بالوں کو خشک کرتی ہوئی' انہیں آئینے میں دیکھ رہی تھی۔ وہ میرے بالوں کو ایک ہاتھ میں لے کر بولیں۔ "اتنے لانبے بال ہیں' انہیں خشک کرنے میں کتنا وقت لگ جاتا ہے؟ بال چھوٹے ہوں تو فوراً خشک ہو جاتے ہیں۔ انہیں چھوٹے کرا دو۔"

اچانک مجھے قینچی چلنے کی آواز سنائی دی۔ میں ایک دم سے ان کی طرف پلٹ گئی۔ ان کے ایک ہاتھ میں کٹے ہوئے کچھ بال تھے۔ دوسرے ہاتھ میں قینچی تھی۔ میں غم و غصے سے چیخنے لگی۔ "یو وچ لیڈی! تم نے میرے بال کاٹ دیئے۔ تم عورت ہو یا چڑیل ہو؟ میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ تمہیں مار ڈالوں گی۔"

"میں بھی تمہیں مار ڈالنا چاہتی تھی لیکن بیٹی ہو' مار نہیں سکتی۔ تم بھی مجھے مار ڈالنے کی بکواس کرتی ہو لیکن ماں کو نہیں مار سکو گی۔"

ان کے ہاتھ میں میرے بالوں کا گچھا تھا۔ وہ اسے میری طرف پھینکتے ہوئے بولیں۔ "اتنے تو کٹ چکے ہیں کہ باقی کو تم خود کاٹنے پر مجبور ہو جاؤ گی۔ تم نے میرا چہرہ بگاڑا ہے۔ میں تمہارا پورا حلیہ بگاڑ دوں گی۔ اب تمہارے جیسی دشمن کو اپنے گھر میں نہیں رہنے دوں گی۔ تم اپنے باپ کے پاس جا کر رہو گی۔"

وہ پلٹ کر جانے لگیں۔ میں غصے سے چیختے ہوئے لوشن' کریم اور پاؤڈر وغیرہ کے ڈبے اور شیشیاں اٹھا اٹھا کر ان کی طرف پھینکنے لگی۔ وہ اِدھر اُدھر جا کر گرتی رہیں۔ ان کا کچھ نہیں بگڑا۔ وہ دروازہ کھول کر چلی گئیں۔ میں نے تمام بالوں کو سامنے لاکر پھر پلٹ کر آئینے میں دیکھا۔ دائیں طرف کے بال کٹ گئے تھے۔ بائیں طرف کے اسی طرح لانبے تھے۔ اب یہ ایسے چھوٹے بڑے نہیں رہ سکتے تھے۔ بقیہ لانبے بالوں کو بھی تراشنا لازمی ہوگیا تھا۔

آہ! مجھے لانبے بال کتنے اچھے لگتے تھے۔ میں اندر سے کٹ کر رہ گئی تھی۔ کٹے ہوئے بالوں کو اپنے چہرے اور آنکھوں سے لگا کر رونے لگی۔ میں نے جوان ہونے کے باوجود اڑان نہیں بھری تھی اور میرے پر کاٹ دیئے گئے تھے۔ یقین نہیں آرہا تھا' کوئی ماں اپنی بیٹی کے ساتھ ایسا سلوک کرسکتی ہے۔ مجھے ان سے جو نفرت تھی' وہ شدید ہو رہی تھی۔ میں ان کی صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ اب تو یہی مناسب تھا کہ میں ابو کے پاس چلی جاؤں۔

ایسے غم و غصے کے وقت انکل بدر عالم یاد آئے۔ مجھ سے زیادہ مظلوم تو وہ تھے' موت کی دہلیز پر کھڑے تھے اور ان سے محبت اور ہمدردی کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ ممی ان

کی موت کا انتظار فرما رہی تھیں۔ دور کے رشتے دار بھی خود غرض تھے۔ انکل کسی پر بھروسا نہیں کرتے تھے۔ انہیں جیسے شروع سے اعتماد تھا کہ مجھ سے محبتیں ملیں گی اور پچھلی رات ہی میں نے دل سے محبت کا اظہار کیا تھا پھر یہ سننے کے بعد کہ ان کے دل میں سوراخ ہوگیا ہے اور وہ موت کے قریب جارہے ہیں' ان سے محبت اور بڑھ گئی تھی۔ دل چاہتا تھا کہ میں ان کے لئے کچھ کروں۔ انہیں اپنی عمر نہیں دے سکتی مگر ان کی آخری سانسوں تک ان کے پاس رہ سکتی ہوں۔ انہیں محبتیں دے سکتی ہوں۔

میں پہلی بار زندگی کے ایک جذباتی موڑ پر تھی۔ اپنے ابو کے پاس جاکر رہنے کو جی چاہتا تھا لیکن انکل بدر عالم مجھے متاثر کر رہے تھے۔ ہفتے میں ایک دن کے لئے ابو سے ملنے جایا کرتی تھی۔ معمول کے مطابق یہی ملاقاتیں کافی تھیں۔ ان سے زیادہ انکل کو میری ضرورت تھی۔ میں ان کے آخری ایام میں یہ ثابت کرسکتی تھی کہ مکرو فریب سے بھری ہوئی اس دنیا میں کبھی سچی اور بے لوث محبتیں بھی مل جاتی ہیں۔

میں تمام دن اپنے کمرے میں رہی۔ دوپہر کو فون پر انکل سے بات کی۔ وہ خوش ہوکر بولے۔ "پچھلے چھ برسوں میں تم پہلی بار مجھے فون پر مخاطب کر رہی ہو۔ تم خیریت سے ہونا؟"

"آپ کسی ماہر نفسیات سے ممی کا علاج کرائیں پھر میں خیریت سے رہوں گی۔"

"کیا بات ہے؟ پھر کوئی جھگڑا ہوا ہے؟"

"انہوں نے دھوکے سے میرے بال کاٹ دیئے ہیں۔ کتنے لانبے' کتنے خوبصورت بال تھے۔ میرا دل رو رہا ہے۔"

"او گاڈ! تمہاری ممی نے یہ اچھا نہیں کیا۔ میں نے کل انہیں بڑی محبت سے سمجھایا تھا اور وہ مان گئی تھیں۔ مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ آئندہ وہ اپنے غصے پر قابو پائیں گی اور گھر میں امن و امان قائم رکھیں گی۔"

"وہ بولتی کچھ ہیں کرتی کچھ ہیں۔ مجھ سے بھی میٹھی باتیں کرتی رہی تھیں پھر اچانک پیچھے سے میرے بال کاٹ دیئے۔"

"مجھے افسوس ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا' وہ کیوں خوامخواہ تمہارے پیچھے پڑ جاتی ہیں۔

آج انہوں نے فیصلہ کیا ہے کہ مجھے یہاں نہیں رہنے دیں گی۔ ابو کے پاس بھیج

"نہیں۔ میں شیریں کی ہر بات مانتا ہوں۔ یہ بات کبھی نہیں مانوں گا۔ میں تمہیں نظروں سے دور نہیں ہونے دوں گا۔"

"میں نے یہی کہنے کے لئے فون کیا ہے' میں آپ کو چھوڑ کر ابو کے پاس نہیں جاؤں گی۔"

وہ جیسے مسرتوں سے بھر گئے۔ حیرانی سے بولے۔ "تم میرے ساتھ رہو گی؟ مجھے ابو پر ترجیح دے رہی ہو؟ میں حیران ہوں' کل رات سے تمہارے اندر ایسی تبدیلیاں کیسے آئی ہیں؟"

"ہر عمل کی کوئی وجہ ہوتی ہے۔ میرے اندر ہونے والی تبدیلیوں کی بھی چند وجوہات ہیں۔ آپ دفتر سے آئیں گے تو میں آپ کو ایک سرپرائز دوں گی۔"

"پھر تو میں ابھی آرہا ہوں۔"

"ابھی میں سیمی آنٹی کے پارلر میں جارہی ہوں۔ ان بے تکے بالوں کو سیٹ کراؤں گی۔"

"وہاں گھنٹے دو گھنٹے لگیں گے۔"

"جی ہاں۔ آپ ایسا کریں۔ ابھی آفس میں رہیں۔ میں بالوں کو سیٹ کرانے کے بعد فون کروں گی۔ آپ وہاں پارلر آجائیں۔ میں آپ کے ساتھ لانگ ڈرائیو پر جاؤں گی۔"

انہوں نے خوش ہوکر کہا۔ "یو ہیو بی کم سو نائس ٹو می۔ میں تمہارے فون کا انتظار کروں گا۔"

میں نے خدا حافظ کہہ کر فون بند کردیا۔ آئینے کے سامنے آکر اپنے بے تکے بالوں کا جوڑا بنایا پھر ڈرائیور کو بلا کر کہا۔ "گاڑی نکالو۔ میں طارق روڈ تک جاؤں گی۔"

وہ چلا گیا۔ میں نے اپنے کمرے سے نکل کر ممی کے دروازے پر دستک دی۔ اندر سے آواز آئی۔ "کون ہے؟ آجاؤ۔"

میں دروازہ کھول کر اندر آئی تو وہ سہم گئیں۔ بیٹھی ہوئی تھیں' اٹھ کر کھڑی ہوگئیں۔ ذرا دور جاکر بولیں۔ "کیا بدلہ لینے آئی ہو؟ یہاں سے چلی جاؤ۔ ورنہ.........."

وہ قینچی میز پر رکھی ہوئی تھی۔ وہ قینچی کی طرف جانا چاہتی تھیں۔ ان سے پہلے میں وہاں پہنچ گئی پھر بولی۔ "آپ کو کسی بھی ہتھیار تک پہنچنے میں کچھ وقت لگے گا۔ میرا ہتھیار تو دن رات میرے ساتھ رہتا ہے۔"

میں نے ایک ہاتھ بڑھا کر اپنے لمبے ناخن دکھائے پھر کہا۔ "کبھی میرے قریب نہ

آنا۔ ورنہ دو چار خراشوں کا اضافہ ہوجائے گا۔ اپنے حسین چہرے کی سلامتی کے لئے نارمل رہا کریں۔"

"تم میرے کمرے میں کیوں آئی ہو؟"

"یہ کہنے آئی ہوں کہ یہ بال کاٹنا آپ کو منگا پڑے گا۔ میں ایسی چال چلنے والی ہوں کہ آپ کے ہوش اڑ جائیں گے۔ آخر آپ ہی کی بیٹی ہوں۔ اینٹ کا جواب پتھر سے دینا جانتی ہوں۔"

میں دروازہ کھول کر کمرے سے باہر آئی۔ بنگلے کے باہر جانے لگی۔ وہ دروازے کے باہر آکر بڑبڑانے لگیں۔ "مجھے کیا دھمکی دے رہی ہو۔ شام کو بدر عالم آئیں گے۔ میں انہیں اپنا فیصلہ سناؤں گی پھر تمہیں یہاں سے دھکے دے کر تمہارے باپ کے پاس پہنچا دوں گی۔ نہ رہے گا بانس' نہ بجے گی بانسری.........."

میں سنی ان سنی کرکے باہر آئی پھر کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ ڈرائیور نے مجھے بیوٹی پارلر کے سامنے پہنچا دیا پھر کہا۔ "میں کسی مناسب جگہ گاڑی پارک کرکے آجاتا ہوں۔"

میں نے کہا۔ "میں واپس نہیں جاؤں گی۔ گاڑی لے جاؤ۔"

وہ چلا گیا۔ میں پارلر میں داخل ہوئی۔ تین چار کسٹمرز خواتین اندر موجود تھیں۔ وہاں کی بیوٹیشن لڑکیاں انہیں سنوار رہی تھیں۔ سیمی آنٹی نے مجھے دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ "آؤ فہمی! تمہاری ممی کیسی ہیں۔ چہرے کا زخم کیسا ہے؟"

"آپ ممی کی بات نہ کریں۔ میرا پرابلم حل کریں۔"

وہ مسکرا کر بولیں۔ "کیا بات ہے؟ پھر ماں بیٹی میں جھگڑا ہوا ہے؟"

میں نے جوڑا کھول کر بال دکھائے۔ وہ دنگ رہ گئیں۔ "او گاڈ' فہمی! یہ تم نے بالوں کا کیا حشر کیا ہے؟"

"میں نے نہیں' ممی نے کیا ہے۔ مجھ سے انتقام لیا ہے۔"

وہ افسردگی سے بولیں۔ "سو سیڈ۔ مجھے شیریں پر غصہ آرہا ہے۔ جھگڑے تو ہوتے ہی رہتے ہیں' اسے ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔"

میں نے آئینے کے سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "جو ہوا سو ہوا۔ آپ انہیں خوبصورتی سے سیٹ کر دیں۔"

وہ میرے بالوں پر برش پھیرتے ہوئے بولیں۔ "یہ سیٹ ہو کر شانوں تک رہ جائیں

گے۔"

میں آنکھیں بند کئے بیٹھی رہی۔ وہ میرے بالوں کو مہارت سے تراشتی رہیں۔ میں نے اس وقت آنکھیں کھولیں جب آنٹی نے میرے شانے کو تھپتھپا کر کہا۔ "دیکھو۔ یہ سیٹ اپ کیسا ہے؟"

میں نے آئینے میں دیکھا۔ انہوں نے بڑی مہارت اور خوبصورتی سے تراشا تھا۔ میں نے کہا۔ "بے شک آپ نے مہارت دکھائی ہے۔ یہ بہت خوبصورت لگ رہے ہیں لیکن قدرتی لانبے بالوں کی خوبصورتی بے مثال ہوتی ہے۔ میں ان مثالی بالوں سے محروم ہوگئی ہوں۔"

انہوں نے تسلیاں دیں کہ دو چار برسوں میں یہ پھر لانبے ہوجائیں گے۔ میں نے انکل کو فون کیا کہ وہ وہاں آجائیں۔ وہ آدھے گھنٹے میں پہنچ گئے۔ میں ان کی کار میں آکر ان کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ انہوں نے کہا۔ "بیٹی! مجھے اپنی پوری زندگی میں اتنی خوشیاں حاصل نہیں ہوئیں' جتنی تم سے مل رہی ہیں۔ میں تمہاری اس خوشگوار تبدیلی سے حیران بھی ہوں اور تمہیں دعائیں بھی دے رہا ہوں۔"

"میں آپ سے تنہائی میں بہت ساری باتیں کرنا چاہتی ہوں۔ کسی ایسی جگہ چلیں جہاں سکون سے باتیں ہوسکیں۔"

"میں بھی تم سے بہت ساری باتیں کرنا چاہتا ہوں اور سب سے پہلے یہ معلوم کرنا چاہوں گا کہ تم مجھے کیا سرپرائز دے رہی ہو؟ لیکن ابھی آدھے گھنٹے بعد ایک اہم میٹنگ ہے۔ ایک جاپانی فرم سے کروڑوں روپے کی ڈیلنگ ہونے والی ہے۔ کیا تم دو گھنٹے تک میرا انتظار کرسکتی ہو؟"

"نو پرابلم' میں ابھی ابو کے پاس جاؤں گی۔ آپ دو گھنٹے بعد مجھے وہاں لینے آجائیں۔"

انہوں نے کار اسٹارٹ کی۔ ابو جہانگیر روڈ کے ایک مکان میں رہتے تھے۔ انکل وہاں مجھے ڈراپ کرکے چلے گئے۔ میں نے دروازے پر آکر دستک دی۔ ابو نے دروازہ کھول کر مجھے دیکھا پھر خوش ہو کر دونوں بازو پھیلا کر کہا۔ "میری بیٹی آئی ہے۔"

میں نے ان کے بازوؤں میں سما کر کہا۔ "آپ بہت یاد آرہے تھے۔ اس لئے ہفتے کا انتظار نہیں کیا۔ تھوڑی دیر کے لئے آئی ہوں۔"

انہوں نے میری پیشانی کو چوم کر کہا۔ "اندر آؤ۔"

میں ایک کمرے میں آکر کرسی پر بیٹھ گئی۔ انہوں نے میرے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا۔
"یہ بتاؤ' ماں بیٹی کی مہابھارت کیسی چل رہی ہے۔"
"آج کل زوروں پر ہے۔ کل وہ اس قدر ایب نارمل ہوگئی تھیں کہ میرا گلا دبوچنے لگی تھیں۔ میں نے ان کا منہ نوچ ڈالا۔ اب وہ کچھ عرصے تک کسی کو اپنا منہ نہیں دکھائیں گی۔ کسی کے سامنے نہیں جائیں گی۔"
"تمہیں ماں کے ساتھ ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔"
"پھر مجھے کیا کرنا چاہئے تھا؟ وہ گلا دبا کر مار رہی تھیں کیا میں مرجاتی؟ یہ دیکھیں' میرے بال کتنے لانبے اور خوبصورت تھے' انہوں نے دھوکے سے کاٹ ڈالے۔ میں ابھی انہیں سیٹ کرا کر آرہی ہوں۔"
"وہ ذرا مغرور ہے۔ گرم مزاج ہے مگر بیٹی کے ساتھ ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔"
"آخر وہ اتنی مغرور کیوں ہیں؟"
"جنہیں مقدر سے غیر معمولی حسن ملتا ہے' وہ مغرور ہوجاتی ہیں۔ بچپن ہی سے ان کے مزاج میں گرمی اور شاہانہ تکبر پیدا ہوجاتا ہے۔ وہ اپنی تعریفیں سنتے سنتے جوان ہوتی ہیں۔ جوانی میں دیوانے پروانے ان کی قدر و قیمت بڑھاتے ہیں۔ ان کے ناز نخرے اٹھا کر انہیں بدمزاج بنا دیتے ہیں پھر وہ ناک پر مکھی بھی نہیں بیٹھنے دیتیں۔"
میں نے کہا۔ "اور وہ ایک شوہر کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا شوہر قبول کرتی رہتی ہیں۔ جیسا کہ ممی کر رہی ہیں۔"
انہوں نے چونک کر مجھے دیکھا پھر پوچھا۔ "تم کیا کہہ رہی ہو؟ اپنی ماں کے بارے میں ایسا نہ سوچو۔"
"میں نہیں سوچوں گی۔ وہ انکل بدر عالم کی موت کا انتظار کر رہی ہیں۔ انکل کے دل میں سوراخ ہوگیا ہے۔ وہ زیادہ دن نہیں جئیں گے۔ ممی پہلے سے تیسرے شوہر کا انتظام کر چکی ہیں۔"
وہ حیرانی اور بے یقینی سے مجھے دیکھ رہے تھے پھر انہوں نے پوچھا۔ "تم یہ ساری باتیں کیسے جانتی ہو؟"
"کل رات وہ کسی ہونے والے تیسرے شوہر سے فون پر بول رہی تھیں۔ میں چھپ کر ان کی باتیں سن رہی تھی۔"
"تم نے اور کیا سنا؟ وہ اور کیا کہہ رہی تھیں؟"

"اور کچھ نہ پوچھیں۔ وہ دولت کی لالچی ہیں۔ انکل بدر عالم کے ساتھ اس امید پر دن گزار رہی ہیں کہ ان کی موت کے بعد تمام دولت اور جائیداد انہیں ملے گی۔ ان کے بعد وہ تیسرے سے شادی کریں گی اور وہ تیسرا بھی یقیناً بہت زیادہ دولت مند ہوگا۔"
"مجھے یقین نہیں آرہا ہے کہ شیریں ابھی سے کسی تیسرے کے ساتھ معاملات طے کر رہی ہے۔"
"معاملات طے ہوچکے ہیں۔ وہ اس سے چوری چھپے ملتی بھی ہیں۔"
"کیا بکواس کر رہی ہو۔ اپنی ماں کو بے حیا کہہ رہی ہو۔ مانتا ہوں کہ وہ دولت کی طلب گار ہے۔ اس نے مجھے ٹھکرا دیا۔ اس کے باوجود یہ کہوں گا کہ وہ بے حیا نہیں ہے۔ تم سے سننے میں غلطی ہوئی ہے۔"
وہ بڑے اعتماد سے کہہ رہے تھے کہ ممی بے حیائی نہیں کرسکتیں۔ ان کا اعتماد دیکھ کر میں نے تسلیم کرلیا کہ مجھ سے سننے میں غلطی ہوئی ہے۔ وہ کچھ پریشان سے ہوگئے تھے۔ مجھے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے تھے پھر انہوں نے پوچھا۔ "تم نے فون پر ہونے والی گفتگو کیسے سن لی؟"
میں نے بتایا کہ ہمارے کمروں کی بالکونیاں ایک دوسرے کے قریب ہیں۔ وہ اپنی بالکونی میں میری طرف پشت کئے کھڑی تھیں۔ میں نے اپنی بالکونی کی ایک نصف دیوار کے پیچھے چھپ کر سنا ہے۔ وہ بولے۔ "تم دونوں ایک دوسرے کی ٹوہ میں لگی رہتی ہو۔ اسی لئے جھگڑے بڑھتے رہتے ہیں۔ دوسروں کی باتیں چھپ کر سننے سے فساد بڑھتا ہے۔ کم نہیں ہوتا۔ تمہاری ماں کو چاہئے کہ وہ تمہارے معاملات میں مداخلت نہ کرے۔ تم اب سمجھ دار ہوگئی ہو۔ اپنا بھلا برا خوب سمجھتی ہو۔ اسی طرح تمہیں اپنی ماں کی باتیں چھپ کر نہیں سننی چاہئیں۔ اس کے اپنے ذاتی معاملات میں مداخلت نہیں کرنا چاہئے۔"
"میں مداخلت نہیں کر رہی ہوں۔ انہیں تیسرے شوہر کو سگنل دینے سے نہیں روک رہی ہوں۔ چھپ کر سننے سے یہ تو معلوم ہوا کہ بے چارے انکل مریض ہیں اور ان کی زندگی مختصر ہوگئی ہے۔"
"تم اسے بے چارہ کہہ رہی ہو؟ تعجب ہے' تم تو اس سے نفرت کرتی تھیں۔"
"میں غلطی کر رہی تھی۔ مجھے صرف ممی سے نفرت کرنا چاہئے کیونکہ انہوں نے ہی ایک سوتیلے باپ کو مجھ پر مسلط کیا ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ میں ان کی ٹوہ میں نہ رہوں۔ نہیں رہوں گی تو ان کی کمزوریاں معلوم نہیں ہوں گی۔ وہ میری کمزوریاں گنواتی رہیں گی

اور میں جواباً کچھ نہیں کرپاؤں گی۔"

"کیا تم بدر عالم کو بتاؤ گی کہ تمہاری ماں اس سے بے وفائی کر رہی ہے؟ اس کی موت کا انتظار کر رہی ہے اور کسی ہونے والے تیسرے شوہر سے چھپ کر ملتی ہے؟"

"انہیں دولت اور ہائی اسٹیٹس کا غرور ہے۔ انکل کو ان کی اصلیت معلوم ہوگی تو وہ انہیں دھکے دے کر اپنے گھر سے نکال دیں گے۔ وہ انہیں اپنی دولت اور جائیداد میں سے ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں دیں گے۔"

وہ کرسی کھینچ کر میرے قریب آگئے پھر بولے۔ "تم اس انکل کے سامنے اپنی ماں کے خلاف کچھ نہیں کہو گی۔"

انہوں نے دونوں ہاتھوں سے میرا ہاتھ تھام لیا اور کہا۔ "وعدہ کرو' جس ماں نے تمہیں دودھ پلایا ہے' اس کی توہین نہیں کرو گی۔ اسے بدر عالم کی نظروں سے نہیں گراؤ گی۔"

میں نے اپنا ہاتھ چھڑا کر ناگواری سے کہا۔ "انہوں نے اپنا دودھ نہیں پلایا ہے۔ آپ ہی نے ایک بار کہا تھا کہ وہ اپنی فگر کا بہت خیال رکھتی تھیں۔ مجھے اوپری دودھ پلایا کرتی تھیں۔"

"چلو اپنا دودھ نہیں پلایا۔ تمہیں نو ماہ پیٹ میں رکھ کر پیدا تو کیا ہے۔"

"دل پر پتھر رکھ کر پیدا کیا ہے۔ انہیں دو ماہ بعد پتا چلا تھا کہ وہ امید سے ہیں.......... ان دنوں وہ بیمار اور کمزور تھیں۔ ڈاکٹر نے اسقاط سے منع کیا تھا۔ کمزوری اور خون کی کمی کے باعث ان کی موت واقع ہو سکتی تھی۔ وہ اپنی سلامتی کی خاطر مجھے پیدا کرنے پر مجبور ہو گئی تھیں۔ یہ بات وہ کئی بار غصے میں مجھ سے کہہ چکی ہیں۔ مجھے محبت سے پیدا نہیں کیا گیا۔ میں زبردستی اس دنیا میں آئی ہوں۔"

ابو نے سر جھکا لیا۔ میں نے کہا۔ "ممی نے آپ سے وفا نہیں کی' پھر بھی ان کی حمایت میں بولتے ہیں۔ میں نے آپ کے بیڈ روم میں ان کی تصویر دیکھی ہے۔ اب تو وہ نامحرم ہیں پھر ان کی تصویر بیڈ روم میں کیوں ہے؟"

"محرم اور نامحرم کا مسئلہ نہ اٹھاؤ۔ کیلنڈروں' کتابوں اور رسالوں میں عورتوں کی تصاویر شائع ہوتی رہتی ہیں۔ یہ تصاویر ہزاروں لاکھوں گھروں میں جاتی ہیں۔ جب کہ وہ نامحرم ہوتی ہیں۔ مجھ سے شادی کے بعد تمہاری ماں نے کئی اشتہاری فلموں میں ماڈلنگ کی تھی۔ وہ دنیا والوں کے لئے نامحرم تھیں لیکن لاکھوں افراد انہیں اسکرین پر دیکھتے تھے

تمہاری ماں کی وہ تصویر ہی میرے پاس نہیں ہے۔ ان کی اور کئی یادگاریں میرے پاس محفوظ ہیں۔"

"ممی کے پاس آپ کی کوئی یادگار چیز نہیں ہے۔ انہوں نے اپنی یادوں سے آپ کو حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا ہے۔ ایسا لگتا ہے' آپ بھی ان سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ ہار پچھتا کر آپ کے پاس چلی آئیں گی۔"

"وہ نہ آئے مگر میں تو امید رکھتا ہوں' کتنے ہی لوگ اپنی غلطیوں پر برسوں بعد بھی پچھتاتے ہیں۔"

"ایک عام گھریلو بیوی سے کوئی غلطی ہو تو اسے مار پیٹ کر گھر سے نکال دیا جاتا ہے لیکن حسین عورت ٹھوکر مار کر جائے تو اس کے لئے آہیں بھری جاتی ہیں۔ اس کی واپسی کی توقع کی جاتی ہے۔"

"میں ظاہری حسن کا دیوانہ نہیں ہوں۔ دوسرے دیوانوں کی طرح میں نے تمہاری ماں کی خوشامدیں نہیں کیں۔ اسے دل کی گہرائیوں سے چاہتا رہا۔ میں نے اس پر شاعری کی۔ اسے دینے کے لئے میرے پاس دولت نہیں تھی۔ میرے کلام کا مجموعہ شائع ہوا تھا۔ میں نے اس کتاب کو اس کے نام سے منسوب کیا تھا لیکن وہ بدر عالم کے پاس چلی گئی۔ کیونکہ میں کتاب لکھتا ہوں اور وہ چیک لکھتا ہے۔"

باہر سے کار کا ہارن سنائی دیا۔ میں نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کہا۔ "انکل آئے ہیں۔ میں چلتی ہوں۔"

وہ میرے ساتھ دروازے تک آتے ہوئے بولے۔ "تم یہاں آکر جاتی ہو تو ایک دم سے تنہائی کا احساس اور شدید ہوتا ہے۔"

"اور میں جانتی ہوں' آپ تنہائی دور کرنے کے لئے شادی نہیں کریں گے۔ ساری عمر ممی کے لئے یہ دروازہ کھلا رکھیں گے۔"

انہوں نے دروازہ کھول دیا۔ میں انہیں خدا حافظ کہہ کر کار میں آکر بیٹھ گئی۔ انکل نے کار اسٹارٹ کرکے آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "مجھے ذرا دیر ہو گئی۔ میٹنگ بہت اہم تھی۔ میرا خیال ہے' تمہارا وقت یہاں اچھا گزرا ہو گا۔"

"جی ہاں۔ یہ بتائیں میٹنگ کیسی رہی؟"

"بہت کامیاب رہی ہے۔ دو سو کروڑ کی ڈیلنگ ہوئی ہے۔ کیا تم میرے کاروبار میں دلچسپی لینا چاہو گی؟"

"پتا نہیں حالات مجھے کہاں سے کہاں لے جائیں گے؟ ممی تو مجھے آپ کی چھت کے نیچے نہیں رہنے دیں گی۔"

"تم شیریں کی فکر نہ کرو۔ میں اس سے نمٹ لوں گا۔"

"ایک بات پوچھوں؟"

"بے شک۔ ضرور پوچھو۔"

"خوبصورت بیوی بہتر ہوتی ہے یا خوب سیرت؟"

"یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ سبھی کہیں گے' خوب سیرت بیوی بہتر ہوتی ہے۔"

"اس کے باوجود سبھی خوبصورت بیوی پر جان دیتے ہیں۔ یہ نہیں سمجھتے کہ دکھ بیماریوں میں ایک خدمت کرنے والی بیوی کام آتی ہے۔ آپ بھی نہیں سمجھتے۔ ممی آپ کی کوئی خدمت نہیں کرتی ہیں۔ صبح سے شام تک آئینے کے سامنے رہتی ہیں یا پھر کلبوں اور دوسری تفریحات میں وقت گزارتی ہیں۔"

"میں ایک بیوی کی خدمت گزاری کا محتاج نہیں ہوں۔ ملازمائیں اور ملازم سارا کام کرتے ہیں۔ بیماری میں نرسوں کی خدمات حاصل ہو جاتی ہیں۔ البتہ ایک پہلو سے تمہاری بات درست ہے۔ بیماری کے دوران پاس آکر بیٹھنے' اچھی باتیں کرنے اور اچھا وقت گزارنے والی نہ ہو تو تکلیف ہوتی ہے۔ میں اپنے آپ سے پوچھتا ہوں' تمام عمر جدوجہد کی' دولت کمائی مگر محبت کا ایک رشتہ نہیں کمایا۔ صرف مجھے وقت دینے والی' صرف مجھے بھرپور محبت دینے والی بیوی ہوتی یا بچے ہوتے تو آج یوں تنہا تنہا نہ رہتا۔"

"آپ بیمار ہیں۔ آپ کی بیماری تشویش ناک ہے۔ ڈاکٹر کیا کہتے ہیں؟"

"وہ کیا کہیں گے؟ بس ٹھیک ہی ہے۔ میں سوچتا تھا' اچھا ہے کہ زندگی کم سے کم ہو گئی ہے۔ بہت کچھ کمانے کے بعد بھی کنگال ہوں۔ کیا فائدہ ہے جینے کا؟ لیکن کل رات سے تم نے میری سوچ اور میرا مزاج بدل دیا ہے۔ یہ زندگی بہت خوبصورت لگ رہی ہے۔ میری بچی! میں جینا چاہتا ہوں۔"

"آپ گاڑی کہیں روکیں۔"

انہوں نے ایک سروس روڈ پر گاڑی روک دی۔ میں اپنی جگہ سے کھسک کر ان کے قریب ہو گئی۔ ان کے شانے پر ایک ہاتھ رکھ کر کہا۔ "آپ جئیں گے۔ میں آپ کی بیماری اور موت سے لڑوں گی۔ دن رات آپ کے ساتھ رہوں گی۔"

انہوں نے حیرت اور مسرت سے مجھے دیکھا۔ ان کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ ان کے ہونٹ کھلے۔ وہ کچھ کہنا چاہتے تھے۔ فرطِ جذبات سے کہہ نہیں پا رہے تھے۔ انہوں نے میرے دوسرے ہاتھ کو دیکھا۔ میں نے وہ ہاتھ ان کی طرف بڑھا دیا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے میرا ہاتھ تھام کر پھر کچھ کہنے کی کوشش کرنے لگے لیکن سارے جذبات آنسو بن گئے تھے۔ زبان نہ بول سکی۔ آنکھیں بولنے لگیں۔ آنسو رواں ہو گئے۔ انہوں نے میرے ہاتھ کو اپنے چہرے سے لگا لیا۔

ایسے وقت کچھ بولنا مناسب نہیں تھا۔ میں چپ رہی۔ انہیں خاموشی سے جذبوں کا اظہار کرنے دیا پھر کہا۔ "میں آپ کو سرپرائز دینا چاہتی تھی اور سرپرائز یہ ہے کہ میں آپ کو انکل نہیں کہوں گی۔"

انہوں نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ میں نے کہا۔ "میں آپ کی بیٹی ہوں۔ آپ کو پاپا کہوں گی۔"

وہ خوشی سے کھل گئے۔ میں نے اپنا سر ان کے بازو پر رکھا۔ وہ میرا سر سہلاتے ہوئے بولے۔ "میں اپنی ساری دولت لٹا دوں تب بھی یہ خوشی' یہ محبت اور یہ سچا رشتہ نہیں ملے گا' جو تم مجھے دے رہی ہو۔ آئی لو یو مائی بے بی!"

"آئی لو یو ٹو پاپا!"

میں نے ان کے بازو سے الگ ہو کر مسکراتے ہوئے دیکھا۔ وہ کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھاتے ہوئے بولے۔ "آج سے تم میری بیٹی بھی ہو اور بیٹا بھی۔ کل سے تم میرے ساتھ دفتر جایا کرو گی اور بزنس کے سلسلے میں ٹریننگ حاصل کرو گی۔"

"میں بھی یہی چاہتی ہوں۔ کسی پر انحصار نہیں کرنا چاہتی۔ اپنی محنت اور لگن سے کوئی نمایاں مقام حاصل کرنا چاہتی ہوں۔ میں آپ کی سرپرستی میں اپنا بہترین کیریئر بنا سکوں گی۔"

وہ دن ہم دونوں کے لئے عید سے بھی زیادہ خوشی کا دن تھا۔ وہ زندگی کے آخری ایام گزار رہے تھے۔ ان کے پاس سب کچھ ہوتے ہوئے بھی کوئی ان کا پرسانِ حال نہیں تھا۔ ایسے میں انہیں بیٹی کی سچی اور بے لوث محبتیں مل رہی تھیں۔

میں بیس برس کی ہونے والی تھی۔ عمر کی ایسی بھری بہار میں کسی خوب رُو اور بد مست جوان کی تمنا ہوتی ہے۔ اس دور میں ہر نوجوان لڑکی کے نام لاٹری نکلنے والی ہوتی ہے۔ انتظار ہوتا ہے' پتا نہیں کون دھڑکنوں کی دہلیز پر آنے والا ہے؟

میں نے ابتدا میں کہا تھا' میں دوسری لڑکیوں سے مختلف ہوں۔ مجھے کسی خوب رُو آئیڈیل کی تمنا نہیں تھی۔ اسے جب آنا ہوگا' وہ مقدر سے چلا آئے گا۔ میں رشتہ چاہتی تھی' ماں کا رشتہ' باپ کا رشتہ' دنیا کے دستور کے مطابق میں نے لہو کے رشتوں میں بے لوث محبتیں تلاش کیں لیکن اس تلاش میں ہارتی جارہی تھی۔ ممی کو تو دن رات بھگت ہی رہی تھی۔ ابو سے بھی کچھ شکایتیں تھیں۔ ان کے بیڈ روم میں اب تک ایک حسین اور مغرور بیوی کی تصویر تھی۔ بیٹی کی ایک بھی تصویر نہیں تھی۔ ان کی والہانہ محبت سے یہ تسلی ہوتی تھی کہ وہ مجھے دل و جان سے چاہتے ہیں لیکن چاہت کا کوئی عملی ثبوت نہیں تھا۔

ذہن کے کسی گوشے میں یہ تکلیف دہ خیال چھپا ہوا تھا کہ وہ بھی ممی کے فرماں بردار شوہر تھے۔ اگر ممی بیمار اور کمزور نہ ہوتیں' ان کے بدن میں خون کی کمی نہ ہوتی اور لیڈی ڈاکٹر حمل ضائع کرنے پر آمادہ ہوجاتی تو ابو بھی راضی ہوجاتے' مجھے پیدا ہونے سے پہلے مار ڈالتے۔ یہ بڑا ہی تکلیف دہ خیال تھا۔ ہم اپنی دنیا میں رشتوں کا کھیل کھیلتے ہیں' کبھی بازی ہار جاتے ہیں' کبھی بازی جیت لیتے ہیں۔ ممی بازی ہار گئی تھیں۔ اس لئے میں نے اپنی یہ زندگی جیت لی۔

ابو نے تو ہارنا ہی سیکھا ہے۔ ممی نے ضد کی کہ وہ ایک دولت مند سے شادی کریں گی۔ انہیں حکم دیا۔ "مجھے ہار جاؤ۔" اور دیوانہ وار چاہنے والے ابو انہیں ہار گئے۔ اگر وہ بیمار نہ ہوتیں۔ تندرست و توانا ہوتیں اور یہ حکم دیتیں "اولاد کی تمنا نہ کرو۔" تو وہ مجھ جیسی بیٹی کو بھی ہار جاتے۔

ایسے ہی حالات نے مجھے سمجھایا ہے کہ لہو کے رشتوں میں بھی سچائی نہیں ہوتی۔ دنیا کے بے شمار ماں باپ بدن کا کھیل کھیلتے ہیں تو ہم پیدا ہوجاتے ہیں۔ اس طرح رشتوں کا کھیل شروع ہوجاتا ہے۔ ممی کا ایک ایک رویہ' ایک ایک حرکت بتاتی ہے کہ میں ان کی کوکھ میں کیوں آئی تھی؟ اگر نہ آتی' اگر پیدا نہ ہوتی تو وہ آج سے بھی زیادہ حسین اور گلیمر گرل دکھائی دیتیں۔

سب ہی کے اعمال کا حساب ہوتا ہے اور اسی دنیا میں ہوتا ہے۔ میرے پاس اپنے ماں باپ کا حساب تھا' یہ حساب بہت غلط تھا' بڑا تکلیف دہ تھا۔ میں غلطی سے پیدا ہوگئی تھی۔

ہم اپنی کوٹھی کے احاطے میں آکر کار سے اتر گئے۔ ممی نے گاڑی کا ہارن سنا تھا۔

ڈرائنگ روم میں ایک صوفے پر تن کر بیٹھی ہوئی تھیں۔ انہیں جس بات کا غصہ تھا وہ میں پہلے بتا دوں۔ ہوا یہ تھا کہ جس ڈرائیور کے ساتھ میں یہاں سے گئی تھی انہوں نے اس سے انکوائری کی تھی۔ پتا چلا میں سیمی آنٹی کے پاس ہوں۔ انہیں ذرا اطمینان ہوا تھا لیکن جب دو گھنٹے گزر گئے' پھر تین گھنٹے گزر گئے تو انہوں نے سیمی آنٹی کو فون کیا۔ انہوں نے بتایا کہ میں نے بال سیٹ کرائے ہیں پھر بدر عالم مجھے وہاں لینے آئے تھے۔ میں ان کے ساتھ کار میں بیٹھ کر گئی ہوں۔

بس یہ سنتے ہی ان کا سکون برباد ہوگیا۔ ان کے اندر بے چینیاں بھر گئیں۔ جہاں بیٹھی تھیں۔ وہاں انگارے بچھے ہوئے تھے۔ اٹھ کر کھڑی ہوگئیں۔ جہاں کھڑی ہوئی تھیں وہاں بھی انگارے بچھے ہوئے تھے۔ وہ اِدھر سے اُدھر جانے لگیں' اُدھر سے اِدھر آنے لگیں۔ کہیں ٹھہر نہیں سکتی تھیں۔ اگر رک جاتیں تو بستر پر گر پڑتیں۔ وہاں انگاروں پر لوٹنے لگتیں۔

انہیں میرا چیلنج یاد آرہا تھا۔ میں نے سیمی آنٹی کے پارلر جانے سے پہلے ان کے کمرے میں جاکر کہا تھا۔ "یہ بال کاٹنا آپ کو مہنگا پڑے گا۔ میں ایسی چال چلنے والی ہوں کہ آپ کے ہوش اڑ جائیں گے.........."

اور اب یہ دیکھ کر ان کے ہوش اڑ رہے تھے کہ میں ان کے شوہر کو ٹریپ کرکے کہیں لے گئی ہوں۔ انہوں نے ہراس جگہ فون کیا جہاں پاپا (بدر عالم) کے ملنے کی توقع تھی لیکن ان سے کسی فون پر رابطہ نہیں ہوا۔ پاپا نے اپنا موبائل فون بند رکھا تھا۔ وہ اس بات پر اور سلگ رہی تھیں۔

میں پاپا کے ساتھ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔ وہ صوفے سے اٹھ کر کھڑی ہوگئیں۔ وہ میری طرف تیزی سے آتے ہوئے بولیں۔ "اس بڈھے کے ساتھ کہاں منہ کالا کرنے گئی تھی؟"

ان کے قریب آتے ہی پاپا نے ایک زور دار طمانچہ رسید کیا۔ وہ لڑکھڑا کر پیچھے چلی گئیں۔ وہ نفرت سے بولے۔ "ذلیل عورت! تم نے الزام تراشی کی انتہا کردی۔ تم اپنی بدماغی کے باعث مقدس رشتوں کو نہ سمجھ رہی ہو' نہ احترام کر رہی ہو۔"

وہ پاؤں پٹخ کر بولیں۔ "میں کچھ نہیں سمجھنا چاہتی۔ میں نادان نہیں ہوں کہ آپ سمجھائیں۔ آپ دونوں کے بیچ جو چکر چل رہا ہے۔ اسے میں کئی مہینوں سے.........."

بات ختم ہونے سے پہلے دوسرا طمانچہ منہ پہ پڑا پھر تیسرا پھر چوتھا اور وہ سنٹر ٹیبل

کے پاس جاکر گر پڑیں۔ اب وہ سہم گئیں۔ پاپا نے کبھی پھول پھینک کر بھی نہیں مارا تھا۔ وہ "جی بیگم صاحبہ! جی آیاں نوں........." کہنے والے شوہر تھے۔ ہمیشہ ان کے ناز نخرے اٹھاتے رہے تھے۔ آج خلافِ توقع ان کے تیور بدل گئے تھے۔ انہوں نے ایک ظالم شوہر کی طرح ان کی پٹائی کی تھی۔ تیور بتا رہے تھے کہ وہ اپنی بددماغی سے باز نہیں آئیں گی تو وہ انہیں مار پیٹ کر گھر سے نکال دیں گے۔

وہ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر رونے لگیں۔ پاپا ایک صوفے پر بیٹھ گئے۔ میں ان کے پاس آکر صوفے کے ہتھے پر بیٹھ گئی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپانے کے باوجود انگلیوں کے درمیان سے مجھے ان کے قریب دیکھ رہی تھیں۔ میں انہیں جلا رہی تھی اور وہ جل رہی تھیں۔ اب وہ کوئی غلط الزام نہیں دے سکتی تھیں لیکن دل یہ ماننے کو تیار نہیں تھیں کہ ایک بیٹی اپنے باپ کے پاس آکر بیٹھی ہے۔

وہ اپنے آنسو پونچھتے ہوئے پاپا سے بولیں۔ "آپ نے جاہل گنوار شوہروں کی طرح مجھ پر ہاتھ اٹھایا ہے۔ میں اور بے عزتی برداشت نہیں کروں گی۔ اس گھر میں نہیں رہوں گی۔ ابھی یہاں سے چلی جاؤں گی۔"

پاپا نے کہا۔ "تمہارے سامنے دو راستے ہیں۔ ایک تو یہ کہ اپنی بدمزاجی پر قابو پاؤ۔ خدا کو حاضر ناظر جان کر دل سے یہ تسلیم کرو کہ یہ میری بیٹی ہے اور میں اس کا باپ ہوں۔ اگر تم باپ بیٹی کے رشتے کو گالی بناؤ گی تو میں تمہیں دھکے دے کر نکال دوں گا۔"

وہ فرش پر گرنے کے بعد وہیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ وہاں سے اٹھ کر بولیں۔ "میں اتنی سیدھی نہیں ہوں کہ دھکے کھا کر نکل جاؤں گی۔ اپنے مہر کے......... پچاس لاکھ روپے لے کر جاؤں گی۔"

"میں اتنا نادان نہیں ہوں، جتنا تم سمجھ رہی ہو۔ میں نے اسٹام پیپر پر تمہیں لکھ کر دیا ہے کہ کبھی میں تمہیں طلاق دوں گا تو مہر کی رقم کے طور پر پچاس لاکھ روپے دوں گا اور تم مجھ سے طلاق لو گی تو تمہیں وہی مہر کے طور پر پچاس ہزار روپے ادا کروں گا۔ میں تو کبھی طلاق نہیں دوں گا۔ اس معاملے میں بھی تمہارے سامنے دو راستے ہیں۔ ایک اچھی بیوی اور ایک اچھی ماں کی طرح نارمل رہو یا پھر پچاس لاکھ روپے کے خواب دیکھنا بھول جاؤ۔ طلاق لے کر پچاس ہزار لے جاؤ۔"

"جب آپ طلاق نہیں دیں گے تو اس کوٹھی سے نکال بھی نہیں سکیں گے اور نہ ہی میں یہاں سے جاؤں گی۔"

"میں ایک شوہر کی حیثیت سے تمہیں محل میں بھی رکھ سکتا ہوں اور جھونپڑی میں بھی۔ لہٰذا خود کو محل میں رہنے کے قابل بناؤ۔ ورنہ کسی سستے فلیٹ میں پہنچا دوں گا۔ وہاں تمہیں صرف کھانے اور کپڑے کے اخراجات ملتے رہیں گے۔"

وہ مٹھیاں بھینچ کر بولیں۔ "آپ مجھے کمزور نہ سمجھیں میں کسی وکیل کی خدمات حاصل کروں گی، عدالت سے انصاف مانگوں گی۔ آپ کے خلاف مقدمہ لڑوں گی۔"

وہ ناگواری سے بولے۔ "میں کاروبار اور جائیداد کے سلسلے میں برسوں سے مقدمات لڑتا آیا ہوں۔ تمہاری طرف سے ایک مقدمہ اور سہی۔ ویسے یہ لکھ لو کہ عدالت میں دو چار پیشیاں بھگتنے کے بعد کنگال ہو جاؤ گی۔ میں جانتا ہوں تمہارے بینک اکاؤنٹ میں پورے ایک لاکھ روپے بھی نہیں ہیں۔"

انہوں نے گھور کر مجھے دیکھا پھر پاپا کے سامنے آکر بڑی مظلومیت سے کہا۔ "آپ نہیں جانتے یہ کتنی مکار ہے۔ اس نے شام کو یہاں سے جاتے وقت مجھے چیلنج کیا تھا کہ یہ ایسی چال چلنے والی ہے کہ میرے ہوش اڑ جائیں گے۔ اب یہ دیکھ رہی ہوں، اس نے میرے خلاف آپ کو بھڑکایا ہے۔ کل بھی آپ نے اس کی حمایت میں مجھ پر ہاتھ اٹھایا تھا۔ آج بھی اسی کی خاطر مجھے مارا ہے۔"

انہوں نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "آگے نہ بولو۔ یہاں آتے ہی تم نے مجھ پر بے حیائی کا الزام لگایا۔ یہ بات گرہ میں باندھ لو کہ باپ بیٹی کے مقدس رشتے کو تسلیم نہیں کرو گی، بددماغی سے باز نہیں آؤ گی تو میری نظروں سے گر جاؤ گی۔ میرے گھر سے نکلنے کے بعد فٹ پاتھ پر پہنچ جاؤ گی۔"

وہ اٹھ کر کھڑے ہوگئے۔ مجھ سے بولے۔ "فہمی! خانساماں سے کہو۔ کھانا لگائے۔ مجھے بھوک لگی ہے۔"

وہ اپنے بیڈ روم کی طرف چلے گئے۔ میں کچن میں آگئی۔ ممی وہیں کھڑی رہ گئیں۔ تھوڑی دیر کے بعد میں پاپا کے ساتھ کھانے کی میز پر تھی۔ ممی ہمارے ساتھ کھانے میں شریک نہیں ہوئیں۔ اپنے کمرے میں بند رہیں۔ میں نے کہا۔ "میرا خیال تھا، ممی حالات سے سمجھوتا کرلیں گی اور گھر کے ماحول کو بہتر بنائیں گی لیکن یہ آپ سے مقدمہ لڑنے کی بات کر رہی ہیں۔"

"مقدمہ لڑنا بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ یہ اتنی شاہ خرچ ہے کہ گلیمر گرل بننے کے لئے لاکھوں روپے خرچ کرتی رہی ہے۔ میں جانتا ہوں، یہ دومنزلہ کلب میں جوا کھیلتی ہے اور

ہزاروں روپے ہارتی رہتی ہے۔ ایک ہفتہ پہلے کہہ رہی تھی کہ اس کے بینک اکاؤنٹ میں اب ایک لاکھ بھی نہیں رہے۔ میں اس کے اکاؤنٹ میں پانچ لاکھ روپے جمع کرادوں۔ میں نے اسے ٹال دیا تھا۔ وہ کنگال ہے۔ وکیل کی فیس بھی ادا نہیں کرسکے گی۔"

ہم کھانے کے بعد لان میں آکر ٹہلنے لگے۔ اسی وقت ممی باہر آئیں پھر اپنی کار میں بیٹھ کر کہیں چلی گئیں۔ میں نے کہا۔ "وہ کار فروخت کرکے لاکھوں روپے حاصل کرسکتی ہیں۔"

"میری کوئی جائیداد' کوئی چیز شیریں کے نام نہیں ہے۔ وہ کار میں نے اس کے استعمال میں دی ہے۔ اس کے نام نہیں کی ہے۔ وہ اسے فروخت نہیں کرسکے گی۔"

ہم آدھے گھنٹے بعد کوٹھی کے اندر آگئے۔ میں نے پاپا کے بیڈ روم میں آکر بستر کی چادر اور تکیئے کے غلاف تبدیل کئے' انہیں دوائیں کھانے کے لئے دیں پھر ان کی پیشانی کو چوم کر وہاں سے آگئی۔ اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے ممی کے دروازے پر رک گئی۔ یہ اچھی طرح جانتی تھی کہ وہ میرے خلاف سازش کرنے' مجھے یہاں سے نکال کر پہلے کی طرح اپنے قدم جمانے کے لئے کسی وکیل کے پاس مشورہ لینے گئی ہیں یا ہونے والے تیسرے شوہر سے مدد مانگنے گئی ہیں۔

میں ان حالات میں ان کی کمزوریاں معلوم کرنا چاہتی تھی۔ یہ جاننا ضروری تھا کہ وہ تیسرا کون ہے؟ کتنے پانی میں ہے؟ اور وہ میرے خلاف ممی کے کس طرح کام آسکتا ہے؟

میں نے اپنے سر پر ہاتھ پھیرا۔ سیمی آنٹی نے بال سیٹ کئے تھے۔ کلپ اور ہیئر پن وغیرہ لگائی تھیں۔ میں ایک ہیئر پن نکال کر دروازے کے لاک کے پاس آئی۔ وہ دروازہ مقفل کرکے گئی تھیں۔ میں اسے کھولنے کی کوشش کرنے لگی۔ مختلف سائز کی ہیئر پن آزمانے لگی۔ ذرا سی محنت کے بعد دروازہ کھل گیا۔

میں نے اندر آکر اسے بند کیا پھر الماری کے پاس آکر اسے کھولنا چاہا تو وہ مقفل تھی۔ میں چابیاں تلاش کرنے لگی۔ وہ چابیوں کا بھاری گچھا پرس میں ڈال کر نہیں لے جاتی تھیں۔ کمرے کا دروازہ مقفل کرکے مطمئن ہوجاتی تھیں کہ کوئی اندر نہیں آسکے گا۔ ایک ریک پر درجنوں فیشن میگزین اور حسن و شباب کو برقرار رکھنے کی کئی گائیڈ بکس تھیں۔ وہاں ایک ڈائری رکھی ہوئی تھی۔ اس میں کئی فون نمبر اور کئی بیوٹیشنز کے نام اور پتے لکھے ہوئے تھے۔ میں نے ایک کاغذ پر وہ تمام فون نمبرز نوٹ کئے۔ ان میں سے کوئی اس تیسرے کا فون نمبر ہوسکتا تھا۔

میں نے سنگار میز کی درازوں کو کھول کر دیکھا۔ وہاں میرے کام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ میں نے بیڈ کے پاس آکر تکیوں کو اٹھا کر دیکھا پھر بیڈ کے بھاری گدے کو اٹھایا تو اس کے نیچے چابیوں کا گچھا رکھا ہوا تھا۔ میں نے اسے اٹھا کر الماری کے پاس آکر ایک ایک چابی کو آزمایا تو الماری کھل گئی۔ وہ بہت بڑی تھی۔ اس میں بے شمار ملبوسات تھے۔ میں نے الماری کے سیف کو کھولا۔ وہاں زیورات کے ڈبے رکھے ہوئے تھے۔ نوٹوں کی ایک گڈی تھی۔ میں نے اسے وہیں رکھ دیا۔ ایک خانے میں کئی دستاویزات تھیں۔ میں نے ان پر سرسری سی نظر ڈالی۔ وہ زمینوں کی خریداری کے کاغذات تھے۔ ایک دستاویز سے پتا چلا کہ انہوں نے بہادر آباد میں اپنے نام سے ایک کوٹھی خریدی ہے۔

میں نے کوٹھی کا نمبر اور پتا نوٹ کیا۔ شہر کے تین علاقوں میں زمین اپنے نام سے خریدی گئی تھیں۔ میں نے جلدی جلدی ان زمینوں کی تفصیلات اور ان دستاویز کی تاریخیں اور ریفرنس وغیرہ نوٹ کئے پھر سیف کو بند کیا۔ الماری کو لاک کیا۔ چابیوں کے گچھے کو گدے کے نیچے رکھا پھر کمرے سے نکلتے وقت دروازے کے لاک کا بٹن دبا کر باہر آکر اسے بند کیا۔ وہ دروازہ پہلے کی طرح مقفل ہوگیا۔

میں اپنے بیڈ روم میں آگئی۔ جتنے فون نمبر نوٹ کئے تھے۔ یہاں سے ان نمبروں پر رابطہ کرنا مناسب نہیں تھا کیونکہ ان کے سی ایل آئی نمبر میں میرا فون نمبر پڑھا جاسکتا تھا۔ دوسری صبح پاپا کے ساتھ دفتر جانے والی تھی۔ وہاں سے ان نمبروں پر رابطہ کرسکتی تھی۔ پتا نہیں ممی کتنی رات کو واپس آئی تھیں۔ وہ دوسرے دن دیر تک سوتی رہیں۔ میں پاپا کے ساتھ دفتر میں آئی۔ پوری چار منزلہ عمارت میں ان کے دفاتر تھے۔ میں نے کہا۔ "پاپا! یہ اتنا بڑا بزنس سیٹ اپ ہے کہ مجھے سمجھنے میں برسوں لگ جائیں گے۔"

وہ بولے۔ "پہاڑ بہت بلند ہوتے ہیں۔ ایک بار محنت اور لگن سے چڑھ جاؤ تو ان کی بلندی قدموں کے نیچے آجاتی ہے۔ تم چند ماہ میں تمام بزنس کے انز اینڈ آؤٹس کو سمجھ لوگی اور اپنے طور پر بڑے بڑے کاروباری فیصلے بھی کرسکو گی۔"

انہوں نے آفس کے تمام اہم عہدے داروں سے میرا تعارف کرایا اور حکم دیا کہ میرے لئے ایک علیحدہ دفتر سیٹ کیا جائے اور ہر روز مجھے بزنس کے سلسلے میں ٹریننگ دی جائے پھر میں پاپا کے ساتھ ان کے دفتر میں آئی۔ انہوں نے پوچھا۔ "یہ ماحول کیسا لگ رہا ہے؟"

میں نے کہا۔ "بہت اچھا لگ رہا ہے۔ آپ مجھے ایک نئی دنیا میں لے آئے ہیں۔"

میں اس عمارت کے تمام دفاتر' آپ کی تمام ملز اور فیکٹریاں دیکھنا چاہوں گی۔"

"لنچ کے بعد ہمارا منیجر تمہیں تمام دفاتر میں لے جائے گا۔ ملز اور فیکٹریاں کل دیکھ لینا۔ میں ذرا چند ضروری کام کرلوں پھر تم سے باتیں کروں گا۔"

وہ مختلف فون نمبرز پر کاروباری گفتگو کرنے لگے۔ آدھے گھنٹے بعد انہوں نے چائے کا آرڈر دیا۔ میں نے کہا۔ "جب آپ یہاں کے معاملات سے فارغ ہو جائیں گے تو آپ سے کچھ ضروری باتیں کروں گی۔"

"مجھے فارغ ہی سمجھو۔ تم سے گفتگو کے دوران میں اپنا کام کرتا رہوں گا۔"

"آپ ممی کو ماہانہ کتنی رقم دیتے ہیں؟"

"ویسے تو تیس ہزار روپے دیتا ہوں لیکن وہ کبھی چالیس اور کبھی پچاس ہزار تک لے ہی لیتی ہے۔"

"وہ آپ کے ساتھ پانچ یا ساڑھے پانچ برس سے زندگی گزار رہی ہیں۔ کل رات آپ نے کہا تھا کہ ان کے بینک اکاؤنٹ میں ایک لاکھ روپے بھی نہیں ہیں۔"

"میں نے درست کہا ہے۔ وہ رقم بچانا نہیں' لٹانا جانتی ہے۔"

"ایسا ہے تو انہوں نے نوے لاکھ روپے کی کوٹھی بہادر آباد میں کیسے خریدی ہے؟"

انہوں نے چونک کر پوچھا۔ "یہ کیا کہہ رہی ہو؟"

"پاپا! میں نے عہد کیا ہے' آپ کو بیماری میں تنہا نہیں رہنے دوں گی اور نہ ہی دشمنوں سے دھوکا کھانے دوں گی۔ کل رات میں نے ان کی چابیاں چرا کر ان کا سیف کھول کر چار دستاویزات دیکھی اور پڑھی ہیں۔ ان کی تفصیلات بھی نوٹ کی ہیں۔"

میں نے اپنے پرس میں سے کاغذ نکال کر بہادر آباد کی کوٹھی کا نمبر اور پتا بتایا پھر تین علاقوں میں دس لاکھ' پندرہ لاکھ اور پچیس لاکھ روپے سے جو زمینیں خریدی گئی تھیں' ان کی تفصیلات بتا کر وہ کاغذ انہیں دیا۔ انہوں نے کاغذ کو لے کر پڑھا پھر گہری سوچ میں پڑ گئے۔

میں نے کہا۔ "ان تمام رقومات کو جمع کیا جائے تو ممی نے ایک کروڑ چالیس لاکھ روپے کی جائیداد خریدی ہے' ان کے پاس اتنی رقم کہاں سے آگئی؟"

وہ مجھے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگے پھر بولے۔ "تم نے بیٹی بن کر میری آنکھیں کھول دی ہیں۔ تم نے یہاں جو تاریخیں لکھی ہیں۔ ان کے مطابق تین برس پہلے یہ تمام جائیداد خریدی گئی ہے۔ تمہیں کچھ یاد ہے۔ تین برس پہلے ہماری کوٹھی میں ڈاکہ

پڑا تھا۔ ڈاکو ایک کروڑ ستر لاکھ روپے لے گئے تھے۔"

میں نے چونک کر سوچا۔ مجھے یاد آیا۔ ان دنوں میں نے میٹرک کا امتحان پاس کیا تھا۔ پاپا نے ممی کو بتایا تھا کہ بینک سے ایک کروڑ ستر لاکھ روپے نکالے گئے ہیں۔ ایک ڈیلنگ کے مطابق دوسری صبح ایک پارٹی کو وہ رقم کیش کی صورت میں ادا کرنی ہے۔ دوسری صبح تک ممی کو وہ رقم اپنی الماری میں رکھنی چاہئے۔

ممی نے کہا۔ "ابھی لاہور سے میری سہیلی کا فون آیا ہے۔ اس کی چھوٹی بہن کی شادی ہے۔ میں نے شادی میں شریک ہونے کا وعدہ کیا ہے۔ ایئرپورٹ جا رہی ہوں۔ شاید چانس پر کسی فلائٹ میں سیٹ مل جائے۔"

تین برس پہلے کی یہ باتیں یاد کرنے کے بعد میں پاپا سے کہا۔ "ممی شام کی فلائٹ سے لاہور چلی گئی تھیں۔ کیا آپ ان پر شبہ کر رہے ہیں؟"

"شبہ کرنا چاہئے۔ اس نے خود وہ رقم نہیں چرائی ہے۔ کسی کے ذریعے اسے چرایا ہے۔ لاہور اس لئے چلی گئی کہ اس پر کوئی الزام نہ آئے۔ وہ رقم بیس اپریل کو چرائی گئی تھی۔ اس کے بعد ہی تمہاری ماں نے دو چار ماہ کے وقفے سے وہ تمام جائیداد خریدی ہے۔"

میں نے پریشان ہو کر پوچھا۔ "کیا آپ ممی کے خلاف پولیس انکوائری کرائیں گے؟"

"یہ ضروری ہے۔ اس طرح اصل چور گرفت میں آئے گا۔"

"ایک کروڑ چالیس لاکھ کی جائیداد ممی کے نام ہے۔ انہیں گرفتار کیا جائے گا۔ انہیں ہتھکڑی پہنائی جائے گی۔ وہ جیل جائیں گی۔ انہیں سزا سنائی جائے گی۔"

ایسا کہتے کہتے میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ فوراً ہی اٹھ کر میرے پاس آگئے۔

"ارے! تم تو رو رہی ہو۔"

میں اپنے آنسو پونچھنے لگی۔ انہوں نے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "تم میرے سائے میں رہ کر آنسو بہاؤ گی تو مجھے تکلیف ہوگی۔ تم اس ماں کے لئے رو رہی ہو' جس نے تم سے دشمنی کی انتہا کر دی؟"

"انہوں نے کوئی انتہا نہیں کی ہے۔ وہ میرا گلا دباتی ہیں۔ میرے بال کاٹ دیتی ہیں۔ مجھے ذلیل اور کمتر بنا کر رکھنا چاہتی ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں ماں کو ہتھکڑیاں پہنا دوں۔ انہیں تھانے کچہری میں ذلتیں اٹھانے دوں۔ ایسا ہوگا تو میں شرم سے مر جاؤں گی۔"

میں پھر بے اختیار رونے لگی۔ انہوں نے مجھے تھپک کر کہا۔ "فہمی! میں تمہارے آنسو نہیں دیکھ سکتا۔ خدا کے واسطے چپ ہو جاؤ۔ میں تمہاری ماں کے خلاف کوئی قانونی کارروائی نہیں کروں گا۔"

میں نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ وہ اپنا رومال نکال کر میرے آنسو پونچھتے ہوئے کہنے لگے۔ "میرے کروڑوں روپے کاروبار میں گردش کرتے رہتے ہیں۔ میں پانچ سو کروڑ کی جائیداد کا مالک ہوں۔ یہ ایک کروڑ ستر لاکھ روپے تمہارے سامنے کیا اہمیت رکھتے ہیں! سمجھوں گا' تمہارا پانچ سو کروڑ کا صدقہ اتار کر یہ رقم شیریں کو دے دی ہے۔"

میں نے اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کے سینے پر سر رکھ دیا۔ "پاپا! میں بیٹی ہونے کا حق ادا کر رہی ہوں۔ آپ سے جھوٹ بولتی ہوں' نہ ممی کا جھوٹ فریب چھپاتی ہوں۔ آپ بھی باپ ہونے کا حق ادا کر رہے ہیں۔ اپنی بیٹی کی خاطر ایک بے وفا اور فریبی عورت کو معاف کر رہے ہیں۔ آپ بہت اچھے ہیں' بہت بڑا دل رکھتے ہیں۔"

انہوں نے ایک سرد آہ کے ساتھ کہا۔ "دل کتنا ہی بڑا ہو۔ اس میں سوراخ رہے گا۔"

میں نے ان سے الگ ہو کر کہا۔ "پلیز' آپ مایوسی کی باتیں نہ کریں۔ پچھلے چھ برسوں سے یہ سوراخ ہے اور اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے آپ زندہ سلامت ہیں اور سلامت رہیں گے۔ میں آپ کی دوا اور دعا بن کر آپ کے ساتھ رہا کروں گی۔"

میں ان کا ہاتھ تھام کر ان کی ریوالونگ چیئر تک آئی۔ وہ اس پر بیٹھ گئے پھر بولے۔ "میں اس کے خلاف کوئی قانونی کارروائی نہیں کروں گا لیکن ہم دونوں اس کا محاسبہ کریں گے۔ اس سے سچ اگلوالیں گے۔"

میں نے تائید کی۔ "بے شک۔ ہمیں معلوم ہونا چاہئے کہ اتنی بڑی رقم کیسے چرائی گئی اور کس کے ذریعے ممی نے اسے چرایا ہے؟"

یہ کہتے ہی میں چونک گئی۔ مجھے وہ تیسرا شخص یاد آیا۔ پاپا نے پوچھا۔ "کیا ہوا؟ تم چونک کر کچھ سوچ میں پڑ گئی ہو؟"

میں نے کہا۔ "ایک تیسرا شخص ہے۔ اسی نے وہ رقم چرائی ہے۔"

"وہ کون ہے؟ کیا تم اسے جانتی ہو؟"

میں نے انکار میں سر ہلا کر کہا۔ "نہیں۔ پرسوں رات ممی بالکونی میں کھڑی کسی سے فون پر باتیں کر رہی تھیں۔ ان کی پشت میری طرف تھی۔ انہوں نے مجھے نہیں دیکھا۔

فون پر کہہ رہی تھیں کہ آپ کے دل میں سوراخ ہے۔ آپ کی زندگی کم ہو گئی ہے۔ آپ اللہ کو پیارے ہوں گے تو انہیں آپ کی تمام دولت اور جائیداد ملے گی۔ اس کے بعد وہ اس شخص سے شادی کریں گی۔ ممی بہت ہی بے وفا اور بے مروت ہیں۔ انہوں نے آپ کی زندگی ہی میں تیسرے شوہر کا انتظام کر لیا ہے۔"

وہ تائید میں سر ہلا کر بولے۔ "پھر تو شیریں نے اسی تیسرے شخص کے ذریعے چوری کرائی ہے۔ یہ معلوم کرنا چاہئے کہ وہ کون ہے؟ کیا کرتا ہے؟ اور کہاں رہتا ہے۔"

میں نے ایک کاغذ نکال کر انہیں دیتے ہوئے کہا۔ "یہ چھ فون نمبرز ہیں۔ میں نے ممی کی ڈائری سے نوٹ کئے ہیں۔ میرا خیال ہے۔ ان میں سے کوئی ایک نمبر اس شخص کا ہو گا۔"

وہ مسکرا کر بولے۔ "میری بیٹی تو پکی جاسوسہ ہے۔ تم نے بڑی سمجھ داری سے یہ سب کچھ حاصل کیا ہے۔ اب ایسا کرو' یہ پہلا نمبر ڈائل کرو۔ یہ کسی طفیل احمد کا فون نمبر ہے۔ کیا تم اسے باتوں میں الجھا کر اس کے بارے میں کچھ معلوم کر سکو گی؟"

"میں کوشش کرتی ہوں۔"

میں نے وہ کاغذ لے کر طفیل احمد کے نمبر پنچ کئے۔ رابطہ ہونے پر ایک شخص کی آواز سنائی دی۔ میں نے پوچھا۔ "کیا آپ مسٹر طفیل احمد ہیں؟"

"جی۔ بول رہا ہوں۔"

میں نے پوچھا۔ "کیا آپ مسز درعالم کو جانتے ہیں؟"

"ہاں۔ جانتا ہوں۔ آپ کون ہیں؟"

"میں ان کی بیٹی ہوں۔ ان کی ڈائری میں آپ کا نمبر دیکھ کر فون کر رہی ہوں۔ کیا ممی آپ کے پاس آئی ہیں؟"

"یہاں تو نہیں آئیں۔ بات کیا ہے؟"

"وہ پچھلی رات سے گھر واپس نہیں آئی ہیں۔ ان کی ڈائری میں جتنے فون نمبرز ہیں۔ ان کے ذریعے انہیں تلاش کیا جا رہا ہے۔ وہ شام تک واپس نہیں آئیں گی تو پولیس انکوائری شروع ہو جائے گی۔ آپ کو ناحق پریشانی ہو گی۔"

وہ پریشان ہو کر بولا۔ "آپ کی ممی سے تین برس پہلے ملاقات ہوئی تھی۔ اس کے بعد میرا ان سے مسلسل رابطہ نہیں رہا۔ وہ ایک آدھ بار آئی تھیں اور زمینیں خریدنے میں دلچسپی رکھتی تھیں۔"

"انہوں نے آپ کے ذریعے کوئی زمین خریدی ہے؟"

اس نے ایک علاقے میں زمین کے بارے میں بتایا۔ ممی نے اسے پچیس لاکھ میں خریدا تھا۔

"ہاں۔ میں اس خرید و فروخت کے بارے میں جانتی ہوں۔ آپ کی اسٹیٹ ایجنسی کا پتا کیا ہے؟"

"میرا کوئی باقاعدہ دفتر نہیں ہے۔ میں ایک فلیٹ میں رہتا ہوں۔ اپنے کلائنٹس سے اسی فلیٹ میں ملاقات کیا کرتا ہوں۔"

میں نے اس کا فلیٹ نمبر نوٹ کرکے رابطہ ختم کر دیا۔ پاپا نے مسکرا کر کہا۔ "ماشاء اللہ۔ بہت ذہین ہو۔ تم نے بڑی ذہانت سے اگلوا لیا کہ وہ کون ہے اور کیا کرتا ہے؟"

"ممی نے اس طفیل احمد کے ذریعے وہی پچیس لاکھ روپے والی زمینیں خریدی ہیں۔"

میں نے دوسرے فون نمبرز کو آزمایا۔ ان میں سے چار نمبر مختلف اسٹیٹ ایجنٹس کے تھے۔ میں نے آخری نمبر ڈائل کیا۔ اس نمبر کے ساتھ ممی نے کسی کا نام نہیں لکھا تھا۔ میں ابھی جس سے رابطہ کر رہی تھی اس کا نام نہیں جانتی تھی۔ رابطہ ہونے پر میں نے ذرا بھاری سی آواز میں کہا۔ "ہیلو۔ میں شیریں بول رہی ہوں۔"

یہ کہہ کر میں چپ ہوگئی۔ چند لمحوں کے بعد کسی شخص کی آواز سنائی دی۔ اس نے کہا۔ "اچھا آپ ہیں۔ اچھا۔ سمجھ گیا اچھا۔ ابھی انہیں بلاتا ہوں۔"

دوسری طرف خاموشی چھا گئی۔ میں نے ریسیور کے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر پاپا سے کہا۔ "ممی جس سے باتیں کرتی ہیں' اس کا اپنا فون نہیں ہے۔ معلوم ہوتا ہے' یہ اس کے کسی پڑوسی کا فون ہے۔"

"فون کسی کا بھی ہو۔ یہ کسی طرح معلوم ہونا چاہئے کہ تمہاری ماں کی زندگی میں آنے والا وہ تیسرا شخص کون ہے۔"

میں نے تھوڑی دیر انتظار کیا پھر دوسری طرف سے آواز سنائی دی۔ "ہیلو شیریں! اس وقت کیسے فون کیا ہے؟"

وہ آواز تھی یا بم کا زبردست دھماکا تھا۔ میں حیرت سے اچھل کر کھڑی ہوگئی۔ ریسیور کے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر پاپا کو تکنے لگی۔ انہوں نے پریشان ہو کر پوچھا۔ "کیا بات ہے بیٹے............؟"

میں نے شدید حیرانی سے کہا۔ "ابو کی آواز آرہی ہے۔"

دوسری طرف سے ابو پوچھ رہے تھے۔ "ہیلو۔ شیریں! خاموش کیوں ہو؟"

میں اچانک کھانسنے لگی پھر ممی کی طرح آواز بنانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔ "میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ مجھ پر بڑی مصیبت آنے والی ہے۔"

ابو نے پریشان ہو کر پوچھا۔ "کیا کہہ رہی ہو؟ کیسی مصیبت آنے والی ہے؟"

میں نے کھانستے ہوئے کہا۔ "یہ بدر عالم کو معلوم ہو چکا ہے کہ میں نے اپنے نام سے ایک کروڑ چالیس لاکھ روپے کی جائیداد خریدی ہے۔"

انہوں نے حیرانی سے پوچھا۔ "یہ کیا کہہ رہی ہو؟ بدر عالم کو کیسے معلوم ہو سکتا ہے؟"

"کھوں۔ کھوں۔ کھوں۔ پتا نہیں تمہاری چہیتی میرے سیف تک کیسے پہنچ گئی تھی؟ اس نے میرے سارے ڈاکومنٹس دیکھے ہیں۔ ان کی تمام تفصیلات نوٹ کرکے بدر عالم کو یہ راز بتایا ہے۔ ابھی بدر عالم سے میرا بہت جھگڑا ہو چکا ہے۔ وہ غصے میں یہ کہہ کر گیا ہے کہ میرے خلاف پولیس کارروائی کرے گا اور یہ ثابت کرے گا کہ میں نے اس کے ایک کروڑ ستر لاکھ روپے چرائے ہیں۔ کھوں۔ کھوں۔ کھوں۔"

"تم چوری سے انکار کرتی رہو۔ قرآن پاک اٹھا کر بھی قسم کھا سکتی ہو کہ تم نے چوری نہیں کی ہے۔ چوری تو میں نے کی ہے۔ مجھ پر کسی کو شبہ نہیں ہوگا۔"

میرے ذہن کو ایک زبردست جھٹکا لگا۔ میرے اپنے باپ نے' میرے سگے باپ نے چوری کی ہے۔ میں نے بے اختیار پاپا کی طرف دیکھا۔ انہیں دیکھتے ہی میرا سر شرم سے جھک گیا۔ میں انہیں سوتیلا باپ کہتی تھی۔ آج سگے باپ نے ان کے آگے میرا سر جھکا دیا تھا۔

پاپا مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ میں ایک دم سے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ انہوں نے فوراً ہی ریسیور میرے ہاتھ سے لے کر اس کے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔ "کیا ہوا؟ کیوں رو رہی ہو؟"

میں نے ایک قدم پیچھے ہٹ کر انہیں دیکھا۔ وہ آنسوؤں کے باعث دھندلا رہے تھے۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا لیا۔ ان کی طرف سے منہ پھیر کر بڑے کرب سے بولی۔ "ابو نے۔ چوری ابو نے کی ہے............"

میں آگے نہ بول سکی۔ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ میری بات سن کر یقیناً حیران

ہو رہے ہوں گے۔ میں منہ چھپا رہی تھی' انہیں نہیں دیکھ رہی تھی۔ ریسیور کو کریڈل پر رکھنے کی آواز سنائی دی۔ چند لمحوں کے بعد ان کے دونوں ہاتھ میرے شانوں پر آئے۔ وہ ہولے ہولے تھپک کر بولے۔ "بیٹی! میری جان! تم کیوں منہ چھپا رہی ہو؟ جو مجرم ہیں۔ انہیں منہ چھپانا چاہئے۔"

میں نے روتے روتے' ہچکیاں لیتے ہوئے کہا۔ "کیا یہ شرم کی بات نہیں ہے کہ میں ایک چور کی بیٹی ہوں؟"

انہوں نے ایک دم سے مجھے جھنجھوڑ کر کہا۔ "بکواس مت کرو۔ تم میری بیٹی ہو۔ کیا مجھے چور کہہ رہی ہو؟ میری طرف دیکھو اور مجھے چور کہو۔"

میں ایک دم سے تڑپ کر پلٹ گئی۔ ان سے لپٹ کر رونے لگی۔ وہ سوتیلے تھے۔ کبھی میں ان کے سائے سے بھی نفرت کرتی تھی۔ آج ان سے لپٹ کر رو رہی تھی۔ لہو کے تمام رشتے پانی ہوگئے تھے۔ رشتوں کی بازی ایسے پلٹ گئی تھی کہ تمام سگے جیتے جی مر گئے تھے۔ میرے پیار کی کائنات میں ایک سوتیلے نے اہمیت اختیار کرلی تھی۔

☆======☆======☆

میں ایک کار میں بیٹھ کر جہانگیر روڈ والے مکان کے سامنے آئی۔ پاپا اپنی کار میں بیٹھ کر ممی کا محاسبہ کرنے گئے تھے۔ میں نے دروازے پر دستک دی۔ اس وقت میں اندر آنا نہیں چاہتی تھی۔ پاپا نے سمجھایا کہ مجھے ان سے ملنا چاہئے۔ ان کا محاسبہ کرنا چاہئے۔

ابو نے دروازہ کھولا۔ ان کے چہرے سے پریشانی ظاہر ہو رہی تھی۔ وہ مجھے دیکھتے ہی مسکرایا کرتے تھے۔ اس وقت مسکرانا بھول گئے تھے۔ میں نے اندر آتے ہوئے پوچھا۔ "آپ کچھ پریشان سے ہیں؟"

انہوں نے کہا۔ "پریشانیاں تو زندگی کے ساتھ لگی رہتی ہیں۔ تم آج بے وقت کیسے آگئیں؟"

"میں کل بھی بے وقت آئی تھی۔ آپ کے پاس فون نہیں ہے۔ ہوتا تو میں آنے سے پہلے اطلاع دیتی۔ پڑوسی کے گھر میں ٹیلی فون ہے لیکن آپ نے ایک بار کہا تھا کہ وہ بہت بدمزاج ہے۔ محلے پڑوس والوں کو اپنا فون استعمال کرنے کی اجازت نہیں دیتا ہے۔"

"ہاں۔ میں نے ٹیلی فون کے لئے درخواست دی ہے۔ ایک آدھ مہینے میں فون لگ جائے گا۔"

"کیا آپ پڑوسی کا فون بالکل استعمال نہیں کرتے ہیں؟"

"بیٹی.........! اگر اس کا فون میرے استعمال میں ہوتا تو سب سے پہلے تمہیں اس کا فون نمبر دیتا۔"

میں نے اس پڑوسی کا فون نمبر بتایا۔ وہ سنتے ہی چونک گئے۔ میں نے پوچھا۔ "یہی نمبر ہے نا؟"

"آں.........؟" وہ ہچکچاتے ہوئے بولے۔ "میں۔ میں کیا جانوں۔ یہ کس کا نمبر ہے؟"

"ممی جانتی ہیں۔ یہ نمبر ان کی ڈائری میں لکھا ہوا ہے۔ انہوں نے پرسوں آدھی رات کے بعد اس نمبر پر رابطہ کیا تھا۔ وہ آپ سے بات کرتی رہی تھیں۔"

انہوں نے مجھے دیکھا' پھر سر جھکا کر کرسی پر بیٹھ گئے۔ میں نے بڑے دکھ سے کہا۔ "اولاد اپنے ماں باپ سے سچ بولنا سیکھتی ہے۔ آپ بچپن میں مجھ سے کہتے تھے کہ سچ بولنا چاہئے۔ اس طرح میرے ذہن میں یہ بات نقش ہوگئی تھی کہ آپ سچے اور کھرے ہیں۔ میں نے جو سچائی کا ایک مجسمہ تراشا تھا' وہ پاش پاش ہوچکا ہے۔"

انہوں نے کہا۔ "زیادہ جذباتی نہ بنو۔ میں تم سے جھوٹ نہیں بولتا ہوں۔ فون کے سلسلے میں مصلحتاً جھوٹ بولنا پڑا۔ اس جھوٹ سے تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچ رہا تھا۔"

"مصلحت یہ تھی کہ آپ اس فون کے ذریعے ممی سے بڑی رازدارانہ گفتگو کرتے تھے۔ ابھی دو گھنٹے پہلے بھی ممی نے آپ کو ایک بہت اہم اطلاع دی ہے۔"

انہوں نے چونک کر مجھے دیکھا پھر پوچھا۔ "تم کیسے جانتی ہو کہ شیریں نے پرسوں رات کو بھی فون کیا تھا اور آج بھی فون پر بات کی ہے؟"

"میں تو یہ بھی جانتی ہوں کہ وہ بات کرتے وقت کھانس رہی تھیں۔"

انہوں نے شدید حیرانی سے مجھے دیکھا پھر گہری سنجیدگی سے کچھ سوچنے لگے۔ میں یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ وہ کب تک اپنا جھوٹ اور فریب مجھ سے چھپاتے رہیں گے؟ ایک طرح سے میں انہیں موقع دے رہی تھی کہ وہ اب بھی بیٹی سے سچ بول دیں۔ انہوں نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا' پھر کہا۔ "ابھی دو گھنٹے پہلے مجھے شیریں نے فون نہیں کیا تھا۔ اب سمجھ میں آرہا ہے۔ تم ماں بیٹی کی آوازیں ملتی جلتی ہیں۔ تھوڑا بہت فرق ہے۔ تم اسی لئے کھانس رہی تھیں کہ میں اس فرق کو سمجھ نہ پاؤں۔"

میں نے جواباً کچھ نہیں کہا۔ انہیں گہری سنجیدگی سے دیکھتی رہی۔ وہ بولے۔ "تم فون پر بولتے' بولتے رو پڑی تھیں پھر لائن کٹ گئی تھی۔ میری سمجھ میں آیا کہ شیریں

کھانس رہی ہے۔ ایک تو وہ بیمار ہے اوپر سے ایک مصیبت میں گرفتار ہے۔ اسی لئے رو رہی ہے۔ میں نے اس کی دل جوئی کے لئے اس کے موبائل پر رابطہ کیا۔ اس سے باتیں کرنے پر پتا چلا' نہ وہ کھانس رہی ہے نہ بیمار ہے اور نہ ہی ابھی اس نے مجھے فون کیا تھا۔ یہ سب تمہاری شرارت تھی۔"

"یہ شرارت نہیں کرتی تو آپ کبھی اقرار نہ کرتے کہ وہ ایک کروڑ ستر لاکھ روپے آپ نے چرائے ہیں۔"

انہوں نے فوراً ہی منہ پھیرلیا۔ یا تو وہ نادم ہوگئے تھے یا پھر جھوٹ اور فریب کو چھپانے کی کوشش کررہے تھے؟ میں نے کہا۔ "آپ نے فون پر رونے کی آواز سنی تھی۔ میں اس بات پر رو پڑی تھی کہ آج سے ایک چور کی بیٹی کہلاؤں گی۔ کیا آپ میرے احساسات کو سمجھ سکتے ہیں؟ ایک باپ کو چور کہتے ہوئے میری زبان جل رہی ہے۔ میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا ہے۔"

وہ جھجکتے ہوئے بولے۔ "میں کوئی پیشہ ور چور نہیں ہوں کہ چور کی بیٹی کہلاؤ گی۔ وہ ایک مجبوری تھی۔ وہ چوری ضروری تھی۔ جو ہوگیا' وہ ہوگیا۔ اسے بھول جاؤ۔"

"ایک پیشہ ور حجام کی بیٹی فخر سے اپنے باپ کو باربر کہتی ہے۔ پیشہ ور دھوبی کے بچے خود کو لانڈری مین کہتے ہیں۔ اگر آپ پیشہ ور چور ہوتے تو چوروں اور بدمعاشوں کے ماحول کے مطابق آپ پر فخر کرتی لیکن میں تو بچپن سے شریف زادی ہونے کے فریب میں مبتلا ہوں۔ اس فریب سے نکل کر یوں لگ رہا ہے' جنت سے نکل کر ماں باپ کے جہنمی ماحول میں آگئی ہوں۔"

وہ خاموش رہے۔ اپنی صفائی میں کہنے کے لئے کچھ نہیں تھا۔ میں ہوش سنبھالنے کے بعد انہیں نیک اور نہایت سنجیدہ انسان کی حیثیت سے دیکھتی آئی تھی۔ وہ شاعرانہ ذوق کے حامل تھے۔ دانشور بھی کہلاتے تھے۔ ایک بار ٹی وی سے نشر ہونے والے مشاعرے میں بھی شریک ہوئے تھے۔ میں خوش ہوکر اپنی سہیلیوں سے کہتی تھی' میرے ابو بہت بڑے شاعر ہیں۔ حالانکہ انہوں نے شاعری میں کوئی نمایاں مقام حاصل نہیں کیا تھا۔

میں نے کہا۔ "آج سے آپ شاعری چھوڑ دیں۔ شاعر قوم کے آئیڈیل ہوتے ہیں۔ آپ تو بیٹی کے بھی آئیڈیل نہیں رہے۔"

"بس خاموش رہو۔ میں کہہ چکا ہوں' جو ہونا تھا' وہ ہوگیا اور جو ہوچکا ہے' اس پر

میں شرمندہ نہیں ہوں۔"

"ممی نے ایسا کیا سحر پھونکا ہے کہ آپ ان کے لئے کچھ بھی کر گزرتے ہیں اور آپ کو شرمندگی نہیں ہوتی۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ وہ آپ کی زندگی میں نہ آتیں۔"

"میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ وہ بھی میرے بغیر نہیں رہ سکتی۔"

"اس کے باوجود آپ نے طلاق دی اور انہیں ایک عالیشان کوٹھی میں پہنچادیا۔"

"میں اس کی ہر خواہش پوری کرنا چاہتا ہوں اور اس کی تمام خواہشات وہاں پوری ہو رہی تھیں۔ ایسے میں تم اس کی دشمن بن گئی ہو۔ بیشتر گھروں میں ماں بیٹی کے جھگڑے ہوتے ہیں لیکن ایسی دشمنی نہیں ہوتی جیسی تم نے کی ہے۔ بدرعالم تمہارا کون سا سگا ہے کہ تم نے سگی ماں کے خلاف اس کے سامنے زہر اگل دیا۔"

"اگر میں ان کا جھوٹ اور فریب چھپالیتی۔ چور کی بیٹی بن کر چوروں کے خاندان میں شامل ہوجاتی تو آپ کی فرماں بردار اولاد کہلاتی۔ آپ نے بچپن میں نیکی اور سچائی کی تربیت دی آج خود اس کی نفی کررہے ہیں۔"

"تم اس بحث میں نہ پڑو کہ ہم کیا کررہے ہیں۔ شیریں کہہ رہی تھی کہ بدرعالم تمہارے اشاروں پر ناچنے لگا ہے۔ تم اسے شیریں کے خلاف قانونی کارروائی سے روک سکتی ہو۔"

"وہ میرے باپ ہیں اور باپ اشاروں پر نہیں ناچا کرتے۔ آپ غلط اور بے جا الفاظ استعمال نہ کریں۔"

"میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔ کام کی باتیں کرو۔ بدرعالم کو پولیس کارروائی سے روکو۔"

میں انہیں سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگی۔ انہوں نے پوچھا۔ "ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟"

میں نے کہا۔ "ممی کا خیال ہے کہ میں نے باپ بیٹی کے مقدس رشتے کو پامال کیا ہے۔ بدرعالم کو پھانس رہی ہوں۔ آپ کا کیا خیال ہے؟ میں کس رشتے سے اپنی بات اس سے منوا سکتی ہوں؟"

"مجھ سے ایسی باتیں نہ کرو۔ میں باپ ہوں۔ تمہارے بارے میں بے غیرتی سے رائے قائم نہیں کروں گا۔ تم نے ایک فرمانبردار بیٹی کی حیثیت سے بدرعالم کے دل میں جگہ بنائی ہے۔ اس شخص کے دل میں اپنی ماں کے لئے بھی جگہ رکھو۔ اپنے اس باپ کو

سمجھاؤ کہ تمہاری ماں اسے آئندہ دھوکا نہیں دے گی۔"

"میرے پاپا بہت اچھے ہیں۔ وہ ایک شرط پر مان جائیں گے۔ ممی ان کے ایک کروڑ ستر لاکھ روپے واپس کریں گی یا پھر خریدی ہوئی تمام جائیداد ان کے حوالے کر دیں گی۔"

"پھر تمہاری ممی کے پاس کیا رہ جائے گا؟ میں مانتا ہوں' تمہیں اپنی ماں سے بڑی شکایتیں ہیں لیکن تم اسے نقصان پہنچانے والی بات نہ کرو۔"

"جو نقصان پاپا کو پہنچایا گیا ہے۔ پہلے اسے پورا کرنے کی بات کریں۔ میں حیران ہوں کہ جب سے آئی ہوں' آپ ممی کے فائدے کی اور بہتری کی باتیں کئے جا رہے ہیں۔ آپ کو اپنی فکر نہیں ہے کہ پولیس کارروائی ہوگی تو پہلے آپ کو گرفتار کیا جائے گا۔"

"جب شیریں تسلیم ہی نہیں کرے گی کہ اس نے کسی کے ذریعے رقم چرائی ہے تو پھر میرے خلاف نہ کوئی گواہ ہوگا اور نہ ہی کوئی ثبوت' نہ مجھ پر الزام عائد کیا جائے گا اور نہ ہی میں قانونی گرفت میں آؤں گا۔"

وہ میرے قریب آکر کرسی پر بیٹھ گئے۔ بڑی محبت اور نرمی سے بولے۔ "فہمی! ہمیں آپس میں جتنی بھی شکایتیں ہوں۔ تم ماں بیٹی خواہ کتنا ہی جھگڑا کرو پھر بھی ہم ایک رہیں گے۔ ہم تینوں خون کے رشتوں میں منسلک ہیں۔ پانی میں لاٹھی مارو تو پانی الگ نہیں ہوتا۔ وہ تمہاری ماں کو لاٹھی مار رہا ہے۔ تم ماں بیٹی کو الگ نہیں ہونا چاہئے۔ آپس میں مل کر اسے اُلو بنانا چاہئے۔ اسے ماں کے خلاف قانونی کارروائی کرنے سے روکنا چاہئے۔"

میں جواباً کچھ کہنا چاہتی تھی۔ اسی وقت کمرے کا دروازہ کھلا۔ ممی نظر آئیں۔ وہ بہت خوش نظر آرہی تھیں۔ ابو کو دیکھتے ہوئے خوشی سے چہک کر دونوں بانہیں پھیلا کر تیزی سے آئیں پھر ان سے لپٹ کر بولیں۔ "ہائے بشیر! بہت بڑی خوشخبری سنو گے تو خوشی سے ناچنے لگو گے۔"

میں حیرت سے دونوں کو دیکھ رہی تھی۔ ایک نے طلاق دی تھی۔ دوسری نے طلاق لی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کے لئے نامحرم تھے مگر بے حیائی سے گلے مل رہے تھے۔ انہوں نے مجھے نظر انداز کر دیا تھا۔ مجھے وہ رات یاد آئی' جب ممی بالکونی میں فون کے ذریعے کہہ رہی تھیں۔ "یہ میرا دل ہی جانتا ہے کہ میں تم سے دور رہ کر کیسے زندگی گزار رہی ہوں۔ آخر ہم چوری چھپے کب تک ملتے رہیں گے.......... ویسے وہ کسی دن بھی اللہ کو پیارا ہو سکتا ہے۔ اس کے بعد ہی میں تمہاری زندگی میں آسکوں گی۔"

اور اب وہ میرے سامنے ابو کے گلے لگ کر کہہ رہی تھیں۔ "بہت بڑی خوشخبری

ہے۔ بدر عالم کو اچانک دل کا دورہ پڑا ہے۔"

میں ایک دم سے پریشان ہو کر کھڑی ہوگئی۔ وہ کہہ رہی تھیں۔ "جب میں نے اسے کار سے اتر کر کوٹھی میں آتے دیکھا تو سہم گئی۔ تم نے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ اسے چوری اور میری جائیداد کی خریداری کا علم ہو چکا ہے۔ اس نے دروازہ کھولتے ہی گرج کر آواز دی۔ "شیریں۔" ہائے میرے نام میں کتنی شیرینی ہے۔ گرج کر میرا نام لیتے ہی وہ دل کی جگہ ہاتھ رکھ کر لڑکھڑا گیا۔ اس کے چہرے پر درد و کرب کے آثار دیکھتے ہی سمجھ گئی کہ اسے دورہ پڑا ہے۔"

یہ کہہ کر وہ قہقہے لگانے لگیں۔ کہنے لگیں۔ "اسے فوراً اسپتال پہنچانا چاہئے تھا لیکن میں آرام سے کھڑی دیکھتی رہی۔ فوری طبی امداد نہ ملنے پر وہ مر سکتا تھا لیکن کم بخت ایک ملازم آگیا۔ وہ چیخ چیخ کر دوسرے ملازموں کو بلانے لگا۔ بدر عالم کی جیب میں گولیاں پڑی رہتی ہیں' ان سے عارضی طور پر ذرا آرام آجاتا ہے۔ اس نے دو گولیاں کھائیں۔ ملازموں کے سامنے مجھے وفادار بیوی بننا پڑا۔ وہ سب اسے اٹھا کر کار کی پچھلی سیٹ پر ڈال چکے تھے۔ مجھے اس کے ساتھ اسپتال جانا پڑا۔ وہاں اسے آئی سی یو میں رکھا گیا ہے۔ میں وہاں سے سیدھی یہاں آئی ہوں۔"

پھر انہوں نے نفرت سے مجھے دیکھ کر پوچھا۔ "یہ یہاں کیا کر رہی ہے؟"

ابو نے جلدی سے کہا۔ "پلیز شیریں! غصہ نہ کرنا۔ تم نے مجھ سے وعدہ کیا ہے' بیٹی کو معاف کر دو گی۔ اس سے آئندہ جھگڑا نہیں کروں گی۔"

"کیا میں جھگڑا کرتی ہوں؟"

"تم نہیں کرتی۔ بس آپس میں کبھی ایسا ہو جاتا ہے۔ ذرا سوچو' تم دونوں کے جھگڑوں سے نوبت یہاں تک پہنچی کہ خفیہ طور سے خریدی ہوئی جائیداد کا علم تمہارے شوہر کو ہو گیا۔"

"اس ذلیل کمینی نے اسے بتایا ہے۔ اس سے پوچھو۔ اس کا رشتہ کیا ہے اس سے؟"

"گندی ذہنیت رکھنے والوں کو باپ بیٹی کا رشتہ سمجھ میں نہیں آئے گا۔ آپ اس رشتے پر کیچڑ اچھالیں گی تو میں منہ نوچ لوں گی۔"

میں نے لانبے ناخن دکھانے کے لئے دونوں ہاتھ بڑھائے۔ وہ سہم گئیں۔ ابو کے پیچھے چھپ کر بولیں۔ "بشیر! یہ میرے قریب آئے تو اس کی انگلیاں توڑ دینا۔"

وہ ابو کے پیچھے جا کر چپک گئی تھیں۔ میں نے کہا۔ "ابو! آپ دونوں کو دیکھ کر یقین نہیں ہوتا کہ چھ برس پہلے طلاق ہو چکی ہے۔ ممی کو تو اللہ رسول ﷺ سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ کیا آپ بھی دینی احکامات بھول گئے ہیں؟ جوان بیٹی کا بھی لحاظ نہیں ہے۔ کیا خوفِ خدا بھی نہیں ہے؟"

ممی نے کہا۔ "بکواس مت کرو۔ تم کیا جانو محبت کیا ہوتی ہے۔ ہم کالج لائف سے ایک دوسرے کو چاہتے آ رہے ہیں۔ ہمارے پیار کے راستے میں کتنی ہی رکاوٹیں پیدا ہوئیں اور اب بھی ہوتی ہیں لیکن ہم ان رکاوٹوں کو توڑ کر ملتے رہتے ہیں۔"

ابو نے کہا۔ "میں نے شیریں سے وعدہ کیا تھا کہ اس کی ہر خوشی اور ہر خواہش پوری کروں گا۔ یہ میرے سوا دنیا کے کسی بھی مرد سے محبت نہیں کرے گی۔ اسے بدر عالم سے بھی کوئی لگاؤ نہیں ہے۔"

ممی نے کہا۔ "مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ بدر عالم کے دل میں سوراخ ہے۔ وہ مجھ میں دلچسپی لے رہا تھا۔ میں نے اس کی میڈیکل رپورٹ دیکھی تھی۔ ڈاکٹروں نے کہا کہ وہ زیادہ عرصے تک نہیں جیئے گا لیکن کم بخت چھ برس سے مرنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ میں نے بشیر سے وعدہ کیا ہے کہ اس کی موت کے بعد تمام دولت اور جائیداد میرے نام منتقل ہو گی تو میں یہاں واپس آ جاؤں گی۔ پھر سے بشیر کی شریکِ حیات بن جاؤں گی۔"

میں نے کہا۔ "معاف کیجئے گا ابو! آپ ممی سے محبت نہیں کر رہے ہیں۔ کاروبار کر رہے ہیں۔ آپ محنت مزدوری نہیں کر سکتے آپ ہنر مند نہیں ہیں۔ ضرورت سے زیادہ کما نہیں سکتے۔ اس لئے ممی کے ذریعے کما رہے ہیں۔"

وہ غصے میں آگے بڑھ کر بولے۔ "بکواس مت کرو۔ ورنہ تمہارا منہ توڑ دوں گا۔"

میں نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "وہیں رک جائیں۔ مجھ پر ہاتھ اٹھائیں گے تو میں یہاں سے جاتے ہی پولیس انکوائری شروع کرا دوں گی۔ اگر پولیس والوں سے دور رہنا چاہتے ہیں تو مجھ سے دور رہیں۔"

وہ جہاں تھے' وہیں رک کر بے بسی سے ممی کو دیکھنے لگے۔ میں نے کہا۔ "آپ بیٹھ کر کھا رہے ہیں اور ممی کما رہی ہیں۔ آپ کبھی خواب میں بھی ایک کروڑ ستر لاکھ روپے نہیں کما سکتے تھے۔ ممی کے تعاون سے کما لئے۔ اب پاپا کی موت کے بعد بے انتہا دولت حاصل کرنے کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ اگر میں ممی کی طرح حسین گلیمر گرل ہوتی تو آپ مجھے بھی کمائی کا ذریعہ بنا لیتے۔ لعنت ہے ایسی کمائی پر اور ایسی دولت پر۔ میں جا رہی ہوں

پھر کبھی نہیں آؤں گی۔ بیوی کے دلال کو ابو کبھی نہیں کہوں گی۔"

میں تیزی سے پلٹ کر جانے لگی۔ انہوں نے کہا۔ "رک جاؤ۔ میری بات سنو۔"

ممی نے کہا۔ "جانے دو اسے۔ وہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گی۔"

میں باہر آ کر کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ ڈرائیور نے اسے اسٹارٹ کر کے آگے بڑھایا۔ میں نے کہا۔ "دل کے اسپتال چلو۔"

اسپتال کی طرف جاتے وقت میرا دل رو رہا تھا۔ میں ایسے بے غیرت ماں باپ کی بیٹی تھی' جو تہذیب اور دین اسلام کے اصولوں کے خلاف زندگی گزار رہے تھے۔ دوسری طرف ایک عزت دار غیرت مند پاپا کی بیٹی تھی۔ پتا نہیں' مجھے یہ خوشی اور یہ عزت پاپا سے کب تک ملنے والی تھی۔ وہ زندگی اور موت کے درمیان تھے۔ ان کی سانسیں اکھڑنے والی تھیں۔ ان کے بعد میں کن حالات سے گزرنے والی تھی' یہ خدا بہتر جانتا ہے۔

میں نے اسپتال پہنچ کر دیکھا۔ انہیں آئی سی یو میں رکھا گیا تھا۔ وہ پچھلے کئی برسوں سے علاج کے لئے وہاں آتے رہے تھے۔ تمام ڈاکٹر انہیں اچھی طرح جانتے تھے۔ وہ ان پر پوری توجہ دے رہے تھے۔ ان کی حالت سنبھل گئی تھی۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرانے لگے۔ میں ان کے پاس بیٹھ کر ان کے سینے پر ہاتھ رکھ کر دل کی جگہ سہلانے لگی۔ وہ بولے۔ "میں ٹھیک ہوں۔ تم پریشان نہ ہونا۔"

میں نے کہا۔ "ممی نے جو حرکتیں کی ہیں' ان کے باعث آپ اندر ہی اندر غصے میں تھے۔ اسی غصے کی وجہ سے آپ ذہنی انتشار میں مبتلا ہو گئے۔ آپ کا دل کمزور ہے۔ آپ کو غم و غصے سے پرہیز کرنا چاہئے۔"

انہوں نے میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "ہاں غصہ مجھے نقصان پہنچائے گا لیکن میں اپنی موت سے اس دشمن عورت کو فائدہ پہنچنے نہیں دوں گا۔ وہ تمہاری ماں ہے۔ میں اس کے خلاف قانونی کارروائی نہیں کروں گا۔ کچھ ایسا کروں گا کہ تمہیں شکایت بھی نہیں ہو گی اور اسے سزا بھی ملے گی۔"

ڈاکٹر نے کہا کہ وہ اب نارمل ہیں۔ گھر جا سکتے ہیں۔ میں نے اسپتال کے تمام بل ادا کئے پھر ان کے ساتھ کار میں بیٹھ کر گھر جانے لگی۔ انہوں نے فون کے ذریعے آئی جی پولیس سے رابطہ کیا۔ اس سے کہا۔ "ہیلو! میں بدر عالم بول رہا ہوں۔ ابھی کارڈیو سکولر میں تھا۔ اب گھر واپس جا رہا ہوں۔"

وہ دوسری طرف کی باتیں سن کر بولے۔ "اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ میری

وائف نے ایک مجرمانہ حرکت کی ہے۔ میں اسے ایسی سزا دینا چاہتا ہوں کہ اس کی تشہیر نہ ہو۔ میرے گھر کی کوئی بات پولیس ریکارڈ میں نہ آئے۔"

وہ چپ رہنے کے بعد بولے۔ "شکریہ۔ آپ اپنے جونیئر افسر کو ابھی بھیج دیں۔ اسے سمجھا دیں کہ وائف کے سامنے صرف دھونس اور دھمکی سے کام لیں۔ باقی میں اپنے معاملات سے نمٹ لوں گا۔"

انہوں نے دوسری طرف کی باتیں سن کر شکریہ ادا کیا پھر فون کو بند کردیا۔ میں نے کہا۔ "ممی ڈیڑھ گھنٹے پہلے ابو کے پاس پہنچی ہوئی تھیں۔ آپ معلوم کریں' وہ کہاں ہیں؟"

انہوں نے ممی کے موبائل پر رابطہ کیا پھر پوچھا۔ "تم کہاں ہو؟"

وہ بولیں۔ "کیا فہمی آپ کے پاس نہیں آئی؟ کیا اس نے آپ کو نہیں بتایا ہے؟"

"اگر اسے معلوم ہوتا تو وہ بتاتی۔ تم کبھی اس سے بول کر نہیں جاتیں کہ کہاں جارہی ہو۔"

وہ ذرا مطمئن ہوکر بولیں۔ "میں اسپتال میں آپ کے پاس تھی۔ آپ ہوش میں نہیں تھے۔ ڈاکٹر نے جب اطمینان ظاہر کیا تو میں اپنی ایک سہیلی کے گھر آگئی۔ اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟"

"خدا کے فضل سے ٹھیک ہوں۔ اسپتال سے گھر جارہا ہوں۔ تم کتنی دیر میں آرہی ہو؟"

"میں آدھے گھنٹے میں پہنچ رہی ہوں۔"

پاپا نے فون بند کرکے اس سے ہونے والی باتیں بتائیں پھر افسوس ظاہر کیا۔ "یہ عورت جتنی خوبصورت ہے۔ کاش کہ اس کا دل بھی اتنا ہی خوبصورت ہوتا۔ یہ اپنے پیروں میں آپ کلہاڑی مار رہی ہے۔"

ہم گھر پہنچ گئے۔ میں نے پاپا کو ان کے بیڈ روم میں پہنچایا۔ اسپتال سے لائی ہوئی دوائیں سرہانے والی میز پر رکھیں پھر ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق ایک دوا کھانے کو دی۔ خانساماں کو چکن سوپ لانے کو کہا۔ تھوڑی دیر میں ممی آگئیں۔ مجھے ناگواری سے دیکھ کر پاپا کا حال پوچھنے لگیں۔ انہوں نے کہا۔ "آرام سے بیٹھ کر باتیں کرو۔"

وہ ایک صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولیں۔ "میں اس لڑکی کے سامنے کوئی بات نہیں کروں گی۔"

وہ بولے۔ "یہ میری بیٹی ہے۔ میرے ہر معاملے میں شریک رہے گی۔ یہ کل سے

بزنس کے سلسلے میں ٹریننگ حاصل کرے گی۔ آئندہ میرا کاروبار سنبھالے گی۔"

وہ جل کر بولیں۔ "آپ مجھے نہ سنائیں کہ اپنی چہیتی کے لئے کیا کررہے ہیں؟ اگر یہ کمرے میں رہے گی تو میں یہاں نہیں رہوں گی۔ اپنے کمرے میں چلی جاؤں گی۔"

پاپا نے مجھ سے کہا۔ "فہمی! میں ایک نمبر بتا رہا ہوں۔ میرے وکیل کو فون کرو۔ میں آخری وصیت لکھواؤں گا۔"

وہ جانے کے لئے اٹھ رہی تھیں۔ وصیت کا ذکر سنتے ہی بیٹھ گئیں۔ میں نے ان کے بتائے ہوئے نمبر پنچ کئے پھر رابطہ ہونے پر موبائل فون انہیں دیا۔ وہ اسے کان سے لگا کر بولے۔ "ہیلو! میں بدر عالم بول رہا ہوں۔"

انہوں نے چپ ہوکر سنا پھر کہا۔ "وعلیکم السلام۔ میں خیریت سے ہوں بھی اور نہیں بھی۔ آج پھر دورہ پڑا تھا۔ ابھی اسپتال سے آیا ہوں۔ یہ دل کے دورے دھمکیاں دے رہے ہیں کہ کسی وقت بھی میرا وقت پورا ہوسکتا ہے۔ میں آخری وصیت لکھوانا چاہتا ہوں۔"

انہوں نے وکیل کی باتیں سننے کے بعد کہا۔ "جی ہاں' آپ میرے کاروبار اور میری تمام جائیداد کی تفصیلات جانتے ہیں۔ آپ کل گیارہ بجے میری کوٹھی میں آجائیں۔ جو تفصیلات ہیں' ان کی فائل لے آئیں۔ کل اپنے فیملی ڈاکٹر کو بھی بلاؤں گا۔ وہ تصدیق کرے گا کہ میں نے پورے ہوش وحواس میں رہ کر وہ وصیت لکھوائی ہے۔"

انہوں نے وکیل کی باتیں سن کر شکریہ ادا کرتے ہوئے فون بند کردیا پھر ممی کو دیکھ کر کہا۔ "تم اپنے بیڈ روم میں جارہی تھیں پھر بیٹھ گئیں۔ کچھ کہنا چاہتی ہو؟"

وہ بولیں۔ "آپ نے پچھلے برس ایک وصیت لکھوائی تھی۔ کیا آپ اس میں تبدیلیاں کرنا چاہتے ہیں؟"

"میں اس وصیت کو منسوخ کروں گا اور نئے سرے سے آخری وصیت لکھواؤں گا۔"

وہ کچھ کہنا چاہتی تھیں پھر رک گئیں۔ ایک ملازم نے آکر کہا۔ "ڈی آئی جی صاحب آئے ہیں۔ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔"

ممی نے پریشان ہوکر پوچھا۔ "آپ نے پولیس افسر کو کیوں بلایا ہے؟"

وہ بستر سے اٹھ رہے تھے۔ میں نے کہا۔ "ڈاکٹر نے آرام کرنے کو کہا ہے۔ آپ افسر کو یہاں بلالیں۔"

"نہیں بیٹے! مجھے دو چار قدم چلنا پھرنا بھی چاہئے۔ آؤ چلتے ہیں۔"

میں نے ان کا ایک بازو تھام لیا۔ وہ میرے ساتھ چلنے لگے۔ ممی نے پوچھا۔ "آپ بتاتے کیوں نہیں، پولیس کو کیوں بلایا ہے؟"

"کوئی خاص بات نہیں ہے۔ وہ افسر تم سے کچھ سوالات کرے گا۔ تم جوابات دو گی پھر وہ چلا جائے گا۔"

وہ تڑخ کر بولیں۔ "میں کسی کے سوال کا جواب نہیں دوں گی۔"

"نہ دو۔ وہ جواب اگلوالے گا۔"

ہم ڈرائنگ روم میں آگئے۔ پاپا نے ڈی آئی جی سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ "میں نے آپ کو یہاں تک آنے کی زحمت دی ہے۔ میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ تشریف رکھئے۔"

"کوئی بات نہیں۔ ہم تو آپ کے خدمت گار ہیں۔ آئی جی صاحب نے کہا تھا۔ آپ بیمار ہیں۔ ابھی اسپتال سے آئے ہیں۔"

"جی ہاں۔ یہ میری اکلوتی بیٹی فہمیدہ ہے اور یہ.........."

انہوں نے سر گھما کر دیکھا۔ ممی دروازے پر کھڑی ہوئی تھیں۔ وہ بولے۔ "یہاں آؤ شیریں!"

انہیں مجبوراً آنا پڑا۔ وہ بولے۔ "یہ میری وائف ہیں۔"

وہ افسر کو سلام کرکے ایک صوفے پر بیٹھ گئیں۔ پاپا نے کہا۔ "میری وائف نے تین برس پہلے ایک کروڑ چالیس لاکھ روپے کی جائیداد خریدی ہے۔ اگر میں ان سے پوچھتا کہ ان کے پاس اتنی بڑی رقم کہاں سے آئی تو یہ مجھ سے جھگڑا کرنے لگتیں۔ میں بیمار ہوں۔ ان سے بحث نہیں کروں گا۔ آپ ان سے سوالات کریں۔"

افسر نے ممی سے پوچھا۔ "تین برس پہلے آپ کے اکاؤنٹ میں ایک کروڑ چالیس لاکھ روپے تھے؟ یہ رقم بدر عالم صاحب نے دی تھی یا آپ نے دوسرے ذرائع سے حاصل کی تھی؟"

انہوں نے ہچکچاتے ہوئے افسر کو دیکھا پھر پاپا سے کہا۔ "میں آپ سے تنہائی میں کچھ کہنا چاہتی ہوں۔"

وہ بولے۔ "مجھے تنہائی میں بات کرنی ہوتی تو اتنے بڑے افسر کو یہاں آنے کی زحمت نہ دیتا۔"

وہ پریشان ہو کر بولیں۔ "یہ ہمارے گھریلو معاملات ہیں۔ میں آپ کو تمام رقم کا حساب دوں گی۔ آپ مجھ پر بھروسا کریں۔ میں آپ کی بیوی ہوں۔ گھر کی عزت ہوں۔ آپ اپنی عزت کا تو خیال کریں۔"

"میں عزت کا خیال کرتے ہوئے افسر کا تعاون حاصل کر رہا ہوں۔ ہمارے گھر کی بات گھر میں رہے گی۔ تم اب مجھ سے نہ بولو۔ ان سے باتیں کرو۔"

وہ بری طرح الجھ گئی تھیں مگر بڑی ڈھیٹ تھیں۔ افسر سے بولیں۔ "یہ شوہر حضرات خوامخواہ بیویوں پر شک کرتے ہیں اور مجھ جیسی بیویاں شکی شوہروں سے اپنا بینک بیلنس اور اپنی جائیداد چھپاتی ہیں۔ آپ مجھے مجبور کریں گے تو میں کوئی بات نہیں چھپاؤں گی۔ کل شام تک آپ کو چند اہم کاغذات اور رسیدیں دکھاؤں گی، جن سے ثابت ہوجائے گا کہ تین برس پہلے میرے پاس ایک کروڑ پچاس لاکھ روپے تھے۔ میں نے اسی رقم سے جائیداد خریدی ہے۔"

افسر نے پاپا کو دیکھ کر پوچھا۔ "کیا آپ کل شام تک کی مہلت انہیں دینا چاہیں گے؟"

وہ بولے۔ "یہ خوامخواہ وقت ضائع کریں گی پھر بھی میں مہلت دے رہا ہوں۔ کل شام پھر آپ کو زحمت اٹھانی ہوگی۔"

افسر نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "کوئی بات نہیں میں کل شام پانچ بجے آؤں گا۔"

"آپ ان بیگم صاحب کو سمجھا دیں کہ کل تک یہاں چیخ و پکار نہیں ہوگی۔ لڑائی جھگڑے نہیں ہوں گے۔ اگر انہوں نے ایسی کوئی حرکت کی تو میں آپ کو فون کر دوں گا۔ آپ کسی جونیئر افسر کو بھیج کر انہیں تھانے بلائیں گے۔"

افسر نے ممی سے پوچھا۔ "کیا کہتی ہیں آپ؟"

"میں انہیں شکایت کا موقع نہیں دوں گی۔"

افسر پاپا سے مصافحہ کرکے چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی ممی نے کہا۔ "کیا پولیس والوں کو بلانا ضروری تھا؟ آپ مجھ سے سوال نہیں کر سکتے تھے؟"

"میں تم سے بحث نہیں کروں گا۔ اسے غنیمت سمجھو کہ میں نے افسر کے سامنے ایک کروڑ ستر لاکھ روپے کی ڈکیتی کا ذکر نہیں کیا۔ ورنہ وہ تمہیں کل تک کی مہلت نہ دیتا۔ ابھی تمہیں تھانے پہنچا دیا جاتا۔ وہاں تم پر ٹارچر کیا جاتا اور سچ اگلوا لیا جاتا۔"

وہ گھورنے لگیں پھر بولیں۔ "کیا آپ سمجھتے ہیں' ڈکیتی میں میرا ہاتھ ہے؟"

"مجھ سے نہ پوچھو اور نہ ہی بحث کرو۔ میں تو ایک سوال کا جواب چاہوں گا۔ تم نے جائیداد خریدنے کے لئے اتنی بڑی رقم کہاں سے حاصل کی؟ اس ایک سوال کے جواب سے تمام جوابات سامنے آجائیں گے۔"

وہ سوچتی رہیں۔ صوفے پر پہلو بدلتی رہیں پھر بولیں۔ "فرض کریں' میں نے آپ کو دھوکا دیا ہے۔ آپ کی رقم سے جائیداد خریدی ہے پھر آپ کا رد عمل کیا ہوگا؟"

پاپا نے مجھے دیکھا پھر کہا۔ "بیٹی کہتی ہے' ماں کی غلطی کو معاف کردوں۔ میں اپنی بیٹی کی بات مان کر معاف کر دوں گا۔"

ممی نے مجھے حیرانی سے دیکھا پھر سر جھکا لیا۔ میں نے پہلی بار ان کا سر اپنے آگے جھکتے دیکھا۔ مجھے دکھ ہوا۔ شرمندہ ہوئی' وہ جیسی بھی تھیں' انہوں نے مجھے پیدا کیا تھا۔ ماں کے حوالے سے ایک پیدا کرنے والی کا سر نہیں جھکنا چاہئے۔

میں نے کہا۔ "ممی! میں آپ کے اور ابو کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں نہیں دیکھنا چاہتی۔ ہمیں گھر کی بات گھر ہی میں چھپا کر اپنی عزت بنائے رکھنا ہے۔"

پاپا نے کہا۔ "جائیداد کے تمام کاغذات اسٹیٹ ایجنٹس سے حاصل کئے جاسکتے ہیں۔ جتنی جائیداد تم نے چھپائی ہے' وہ اب چھپی نہیں رہے گی۔ تم ایک کروڑ چالیس لاکھ روپے کا حساب یہاں نہیں دو گی تو عدالت میں دینا ہوگا اور جب حساب نہیں دے پاؤ گی تو یہ ثابت ہوجائے گا کہ تم نے سابقہ شوہر کے ذریعے میرے گھر میں ڈکیتی کرائی ہے۔ پولیس کے ڈنڈے ایسے ہوتے ہیں کہ پتھر کو بھی بولنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ تمہارا بشیر احمد کیا چیز ہے؟"

وہ دوپٹے سے منہ چھپا کر رونے لگیں۔ میں ان کے پاس جانا چاہتی تھی۔ پاپا نے اشارے سے منع کیا۔ میں پھر صوفے پر بیٹھ گئی۔ مجھے ان سے محبت نہیں تھی۔ ہمدردی بھی نہیں تھی۔ انہیں روتے دیکھ کر کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔ میرے اندر شاید یہی بات تھی کہ ماں کو رونا نہیں چاہئے۔ اگر رو رہی ہیں تو ان کے آنسو پونچھنا چاہئیں۔

وہ دوپٹے سے آنسو پونچھتی ہوئی بولیں۔ "آپ نے پہلی وصیت میں میرے لئے بہت کچھ لکھا تھا۔ اب فہمی کی وجہ سے وصیت تبدیل کر رہے ہیں۔ مجھ سے ناانصافی کر رہے ہیں۔"

"میں فہمی کی وجہ سے نہیں' تمہارے جھوٹ اور فریب کی وجہ سے ایسا کر رہا

ہوں۔ میرے گھر میں ڈکیتی کرانے والی عورت یہ کیسے توقع کر رہی ہے کہ میں اسے اپنی دولت اور جائیداد میں سے حصہ دوں گا۔"

"آپ نے ابھی کہا ہے کہ میری اس غلطی کو معاف کر دیں گے۔ معاف کرنے کے بعد بھی ڈکیتی کا طعنہ نہیں دینا چاہئے۔"

"ابھی میں نے معاف نہیں کیا ہے۔ پہلے میرے ایک کروڑ ستر لاکھ واپس کرو۔"

"کیسے کروں؟ اس رقم سے جائیداد خرید چکی ہوں۔"

"تو پھر وہ تمام جائیداد میرے حوالے کر دو۔ نقد رقم ہو یا جائیداد کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں قبول کرلوں گا۔"

وہ پریشان ہو کر بولیں۔ "جائیداد میرے پاس رہنے دیں۔ میں آپ کی شریکِ حیات ہوں۔ یہ سمجھیں کہ آپ نے محبت سے اس جائیداد کو میرے نام کیا ہے۔"

"بے شک تم میری شریکِ حیات ہو۔ میں چوری کی جائیداد تمہارے نام نہیں کروں گا۔ کل صبح جائیداد کے تمام کاغذات میرے حوالے کر دو پھر اپنے اسٹیٹ ایجنٹ سے کہو' وہ سب کچھ میرے نام ٹرانسفر کر دے۔"

"پہلے میں آپ کی آخری وصیت پڑھوں گی۔ آپ میرے نام کروڑوں کی جائیداد لکھیں گے تو میں اپنی موجودہ جائیداد آپ کے حوالے کر دوں گی۔"

"میری آخری وصیت مہر بند ہوگی۔ اسے میری موت کے بعد کھولا جائے گا۔ فی الحال تمہیں یہ فیصلہ کرنا ہے کہ معافی حاصل کرکے یہاں بدستور میری بیوی رہو گی یا پولیس کسٹڈی میں تھانے جاؤ گی۔ آج رات اچھی طرح سوچ لو۔"

وہ میرے ساتھ اپنے بیڈ روم میں آئے۔ ممی وہیں صوفے پر بیٹھی رہیں۔ وہ واش روم میں گئے پھر واپس آکر بستر پر لیٹ گئے۔ میں نے کہا۔ "میں آپ کو تنہا نہیں چھوڑنا چاہتی۔ اِدھر صوفے پر سوجاؤں گی۔"

"نہیں بیٹے! یہاں تمہیں آرام نہیں ملے گا۔ تم سوچ رہی ہو رات کو کسی وقت میری طبیعت خراب ہوسکتی ہے۔ میرا خیال ہے' میں بالکل ٹھیک ہوں۔ اگر اَن ایزی فیل کروں گا تو فون کے ذریعے تمہیں بلالوں گا۔ تم جاکر آرام سے سوجاؤ۔"

میں ان کی پیشانی کو چوم کر شب بخیر کہہ کر وہاں سے ڈرائنگ روم میں آئی۔ ممی وہاں ٹہل رہی تھیں۔ مجھے دیکھ کر رک گئیں۔ میرے قریب آکر بولیں۔ "تمہیں اچھی طرح معلوم ہوگا کہ وہ وصیت میں کیا لکھنے والے ہیں۔"

میں نے انکار میں سرہلایا۔ "نہیں۔ پاپا نے مجھے کچھ نہیں بتایا ہے۔"

"تم جھوٹ بول رہی ہو۔ تم نے بدرعالم کو اچھی طرح شیشے میں اتار لیا ہے۔ وہ تمہارے اشاروں پر چل رہے ہیں۔"

"آپ غلط سمجھ رہی ہیں۔ پلیز ممی! ایسے مخالفانہ خیالات دماغ سے نکال دیں۔ اپنے حالات کو سمجھیں۔ آپ ڈکیتی کے سلسلے میں بری طرح پھنسنے والی ہیں۔ پاپا سے سمجھوتا کریں۔ وہ تمام جائیداد ان کے حوالے کر دیں۔ آئندہ آپ کو اس سے زیادہ مل سکتا ہے۔"

"مجھے زیادہ کا لالچ دے کر میری جائیداد چھین لینا چاہتی ہو۔ میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ میری وہ کوٹھی اور وہ دونوں زمینیں تم اپنے نام کرالو گی۔ وصیت میں میرے لئے پھوٹی کوڑی بھی لکھنے نہیں دو گی۔"

میں نے بڑے افسوس سے انہیں دیکھا پھر کہا۔ "جب میں آپ کی کوکھ میں آئی تھی‘ تب ہی سے آپ مجھے دشمن سمجھ رہی ہیں۔ میری دشمنی یہ ہے کہ آپ ایک کنواری گلیمر گرل کہلاتی تھیں‘ میں نے آپ کو ماں بنا دیا۔ آپ چھپاتی تھیں کہ شادی شدہ ہیں پھر ماں بننے والی بات بھی چھپانے لگیں۔ میرا قد بڑھنے لگا۔ میں جوان ہونے لگی تو آپ اپنی نمائشی دنیا میں مجھے چھوٹی بہن کہنے لگیں۔ میری باجی کہلانے لگیں پھر بھی سچائی نہیں چھپتی تو آپ مجھ پر غصہ اتارنے لگتی ہیں۔"

وہ مجھے گھور کر بولیں۔ "میرا نفسیاتی تجزیہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کل جو وصیت لکھی جائے گی‘ اس کے بارے میں تم اچھی طرح جانتی ہو لیکن مجھے نہیں بتاؤ گی اور میں سمجھ گئی ہوں کہ اس وصیت سے مجھے دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر پھینکا جارہا ہے۔ میری جگہ ایک کم سن خوبصورت لڑکی اس بوڑھے کو مل گئی ہے۔ وہ تو دیوانہ ہو کر سیاہ کو سفید کرتا رہے گا۔"

میں نے حقارت سے کہا۔ "لعنت ہے آپ کی گندی سوچ پر۔ آپ طلاق لینے کے بعد بھی ابو کے ساتھ گناہ آلود زندگی گزار رہی ہیں۔ اپنی طرح مجھے بھی گناہ گار سمجھتی ہیں۔ مائیں اپنی بیٹیوں کے دامن پر کوئی داغ نہیں لگنے دیتیں۔ آپ تو مجھے سر سے پاؤں تک داغ دار بنا رہی ہیں۔ آپ ایسی جھوٹی الزام تراشی سے کیا حاصل کر رہی ہیں؟"

"کیوں پارسا بن رہی ہو؟ کیا تم اس کے ساتھ ابھی بیڈ روم میں رات نہیں گزارو گی؟"

میرا سر گھوم گیا۔ میں یہ شرمناک الزام برداشت نہیں کر سکی۔ ان کے منہ پر ایک زوردار طمانچہ جڑ دیا۔ وہ جواباً حملہ کرنا چاہتی تھیں۔ میں نے لانبے ناخن آگے بڑھائے تو وہ چیختی ہوئی بھاگنے لگیں۔ میں ان کے پیچھے دوڑتے ہوئے بولنے لگی۔ "تم ایسی بے شرم اور گنہگار ہو کہ اب میں تمہیں کبھی ماں نہیں کہوں گی۔ تم لاتوں کی بھوت ہو۔ باتوں سے نہیں مانو گی۔ تمہیں اس عمر میں بھی اپنی خوبصورتی پر ناز ہے۔ میں تمہارا یہ چہرہ بگاڑ دوں گی۔"

وہ بھاگتی ہوئی‘ کوریڈور سے گزرتی ہوئی اپنے کمرے میں گئیں پھر فوراً ہی دروازے کو لاک کر لیا۔ اندر سے چیخ چیخ کر بولنے لگیں۔ "تو حرافہ ہے۔ چھنال ہے۔ تونے میرے مرد کو چھین لیا ہے۔ اگر وہ بڈھا اپنی وصیت میں میرے حقوق نہیں لکھے گا تو میں دنیا والوں سے چیخ چیخ کر کہوں گی کہ اس بڈھے نے مجھے گھر سے نکال کر تجھے داشتہ بنا لیا ہے۔ ذلیل! کمینی! میں تجھے سکون سے نہیں رہنے دوں گی۔ تجھ کو اور تیرے یار کو منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑوں گی۔"

میں ان کی باتیں سن کر شرم سے پانی پانی ہو رہی تھی۔ وہاں سے اپنے بیڈ روم میں آ گئی۔ وہ اپنے غصے اور بدمزاجی کے باعث اپنے پیروں پر آپ کلہاڑی مار رہی تھیں۔ پاپا سے معافی مانگ کر بہت بڑی رقم کی چوری کے الزام سے بچ سکتی تھیں لیکن ان کی کھوپڑی میں یہ بات سما گئی تھی کہ میں پاپا کی دولت اور جائیداد سے انہیں کچھ حاصل نہیں کرنے دوں گی اور وہ اپنی جائیداد پاپا کے حوالے کریں گے تو اِدھر سے کچھ ملے گا‘ نہ اُدھر سے‘ وہ کنگال ہو جائیں گی۔

دوسری صبح میں اور پاپا ناشتے کی میز پر تھے۔ انہوں نے ملازمہ سے کہا۔ "میڈم سے کہو ناشتے کے لئے آجائیں۔"

ملازمہ نے کہا۔ "وہ نہیں ہیں۔ میں ان کے بیڈ روم میں گئی تھی۔ وہاں الماری کھلی ہوئی ہے اور کمرے کا تمام سامان بھی بکھرا ہوا ہے۔"

پاپا نے مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ میں وہاں سے اٹھ کر ان کے بیڈ روم میں آئی۔ الماری کھلی ہوئی تھی۔ ملبوسات باہر پڑے ہوئے تھے سیف کھلا ہوا تھا۔ زیورات کے ڈبے اور زمین کے کاغذات نہیں تھے۔ بیڈ پر چابیوں کا گچھا پڑا ہوا تھا۔ میں نے پاپا کے پاس آکر نائٹ چوکیدار کو بلایا اس سے پوچھا۔ "میڈم رات کو کہیں گئی تھیں؟"

"جی بی بی جی! رات کے دو بجے اپنی کار میں گئی تھیں۔ صبح میری ڈیوٹی ختم ہونے

تک نہیں آئیں۔"

"ٹھیک ہے جاؤ۔"

وہ چلا گیا۔ میں نے پاپا سے کہا۔ "وہ تمام زیورات اور جائیداد کے ڈاکومنٹس لے گئی ہیں۔"

"بیٹے! تم خواہ مخواہ اس عورت سے ہمدردی کر رہی ہو۔ اسے معاف نہیں کرنا چاہئے۔ سخت سے سخت سزا دینا چاہئے۔"

"آپ نہیں جانتے۔ ابھی وہ گھر کی چار دیواری میں باپ بیٹی کے رشتے کو گالی دیتی ہیں۔ ان کے خلاف کوئی قدم اٹھائیں گے تو باہر جا کر ہر جگہ پر کیچڑ اچھالیں گی۔"

"وہ پاگل ہے۔ بد دماغ ہے۔ وہ غلط باتیں کرے گی تو کیا اس کے خوف سے ہم جینا چھوڑ دیں گے؟ تم بزنس فیلڈ میں آ رہی ہو۔ تمہیں مخالف پارٹیوں سے نمٹنے کا بھرپور حوصلہ رکھنا چاہئے۔ تم فکر نہ کرو۔ دیکھتی جاؤ' وہ ہمارے سامنے گھٹنے ٹیک دے گی۔"

وہ ٹوٹنے والوں میں سے تھیں۔ جھکنے والوں میں سے نہیں تھیں۔ ہمارے خلاف لڑنے کے لئے کہیں جا کر مضبوط محاذ بنا رہی تھیں۔ ڈاکٹروں نے پاپا کو آرام کرنے کا کہا تھا۔ وہ گھر میں تھے۔ مجھے دفتر بھیج دیا۔ وہاں منیجر مجھے بزنس کے ابتدائی معاملات سمجھاتا رہا۔ وہ گھر میں رہ کر وصیت لکھوا رہے تھے۔ مجھے اس سلسلے میں کوئی تجسس نہیں تھا کہ وہ کیا لکھوا رہے ہیں۔ میں ان کے کاروبار کو سمجھ کر اپنی محنت سے روزی حاصل کرنا چاہتی تھی۔

ڈی آئی جی نے دوپہر کو پاپا سے فون پر رابطہ کیا اور ان سے پوچھا۔ "مسٹر بدر عالم! آپ مسٹر عبداللہ شیرازی کو جانتے ہوں گے۔ آپ کی طرح معروف بزنس مین ہیں۔ یہ آپ کی بڑی تعریفیں کر رہے ہیں۔"

"لیکن میں تعریفیں نہیں کروں گا۔ وہ شاطر بزنس مین ہے۔ آستین میں رہ کر ڈس لیتا ہے۔ آپ اس کے بارے میں کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

"مسٹر عبداللہ شیرازی آپ کی وائف کے ساتھ ابھی میرے آفس میں موجود ہیں۔ انہوں نے ایک ایگریمنٹ پیپر کی کاپی دکھائی ہے۔ اس معاہدے کی رو سے مسٹر شیرازی نے تین برس پہلے چھ مختلف اشتہاری فلمیں تیار کرنے کے لئے آپ کی وائف مسز شیریں بدر کو ماڈل کی حیثیت سے منتخب کیا تھا اور فی اشتہاری فلم پچیس لاکھ روپے کے حساب سے اپنی ماڈل مسز شیریں بدر کو ایک کروڑ پچاس لاکھ روپے ادا کئے تھے۔"

انہوں نے کہا۔ "شیریں نے اپنے بچاؤ کے لئے بڑا پکا کام کیا ہے۔ کیا آپ میری وائف سے بات کرا سکتے ہیں؟"

چند سیکنڈ بعد ممی کی آواز سنائی دی۔ "ہیلو بدر! کیا تمہاری تسلی ہو گئی کہ میں نے جائیداد خریدنے کے لئے کس طرح جائز طریقے سے رقم حاصل کی تھی؟"

"تم نے اپنے بچاؤ کے لئے بڑا مہنگا اور شرمناک راستہ اختیار کیا ہے۔ اب وہ شیرازی ہر رات تمہاری بوٹیاں نوچتا رہے گا۔ تمہیں ایک ماں بننا راس نہیں آیا۔ اپنے ہی وجود کے لئے گالی بن گئی ہو۔"

وہ تڑخ کر بولیں۔ "مجھے گالی نہ دو۔ اپنے گریبان میں جھانکو۔ مجھ پر جھوٹے الزامات تراش کر گھر سے اور اپنی زندگی سے نکالنا چاہتے ہو اور میری جوان کم سن بیٹی کو داشتہ بنا کر رکھنا چاہتے ہو۔ میں خاموش نہیں بیٹھوں گی۔ تمہارے خلاف پریس کانفرنس بلاؤں گی۔ تمام اخبارات والے پوچھیں گے کہ بیوی کو گھر سے نکال کر سوتیلی بیٹی کو گھر میں کیوں رکھا ہے؟ اس بیٹی سے تمہارا کیا رشتہ ہے؟ جب تک بیوی کو اس کے تمام جائز حقوق نہیں دو گے اس وقت تک کوئی اسے تمہاری بیٹی تسلیم نہیں کرے گا۔ میں اپنی معصوم بیٹی کو تمہاری دولت اور ہوس کے شکنجے سے نکال کر رہوں گی۔"

اس نے فون بند کر دیا۔ پاپا ریسیور پکڑے گم صم بیٹھے رہے۔ انہیں اس بات کا قطعی ملال نہ تھا کہ وہ ایک کروڑ ستر لاکھ روپے کی ڈکیتی کے الزام سے بچ گئی ہیں اور اب وہ اپنی جائیداد ان کے حوالے نہیں کریں گی۔ وہ ایک بھاری رقم کا نقصان برداشت کر سکتے تھے۔

انہیں ممی کی بے وفائی اور بدچلنی کی بھی پروا نہیں تھی۔ سب سے بڑی فکر اور پریشانی یہ تھی کہ وہ پریس اور اخبارات کے ذریعے باپ بیٹی کے مقدس رشتے پر کیچڑ اچھالنے والی تھیں۔ ان کے پاس کوئی معقول جواب نہ ہوتا کہ جب بیوی گھر میں نہیں رہتی ہے تو سوتیلی بیٹی کس رشتے سے رہتی ہے؟ جب بیوی رشتہ توڑ رہی ہے تو وہ اس کی بیٹی سے رشتہ کیوں جوڑ رہے ہیں؟

میں شام کو آفس سے آئی تو پاپا نے یہ مسئلہ بتایا۔ میں نے پریشان ہو کر کہا۔ "میں پہلے کہہ رہی تھی کہ یہ باہر جا کر ہم پر کیچڑ اچھالیں گی۔ یہ ہمارے لئے موت سے بدتر ہیں۔ موت تو ایک ہی بار مارتی ہے۔ یہ ہمیں بار بار مارتی رہیں گی۔ مجھے آپ کی فکر ہے۔ میں تو ایک گمنام لڑکی ہوں۔ آپ ایک مشہور معروف بزنس مین ہیں۔ اونچی سوسائٹی میں

آپ کی بہت عزت ہے۔ وہ آپ کی عزت خاک میں ملانے کے لئے کوئی کسر نہیں چھوڑیں گی۔"

انہوں نے کہا۔ "فی الحال بدنامی سے بچنے کا ایک ہی راستہ ہے۔ میں نے اپنے دفاتر کے اعلیٰ عہدے داروں کے لئے بنگلوز بنائے ہیں۔ تم میری آفس انچارج ہو۔ کل تمہیں پچھلی کسی تاریخ کا ایک تقرر نامہ مل جائے گا۔ تم وہاں رہا کرو گی۔"

"آپ بیمار ہیں۔ آپ کو میری ضرورت ہے۔ میں بھی آپ کی خدمت کرنا چاہتی ہوں۔ میں آپ سے دور نہیں رہوں گی۔"

وہ پریشان ہو کر بولے۔ "میں بھی تم سے دور نہیں رہنا چاہتا۔ مجھے ان آخری دنوں میں تمہاری بے لوث محبتیں مل رہی ہیں۔ میں ان محبتوں سے محروم نہیں ہونا چاہتا۔ سمجھ میں نہیں آتا' کیا کیا جائے۔ ہم ایک ساتھ رہ کر بدنام ہو جائیں گے۔"

وہ علاج کے سلسلے میں لندن جا سکتے تھے۔ میں وہاں ان کے ساتھ رہ سکتی تھی۔ وہاں کوئی ہمیں بدنام نہیں کر سکتا تھا لیکن کاروباری مجبوریاں تھیں۔ نئی وصیت کے مطابق انہوں نے قابلِ اعتماد عہدے داروں کا ایک پینل بنایا تھا۔ اس پینل میں مجھے شامل کیا گیا تھا۔ ہم سب مل کر ان کا کاروبار سنبھالنے والے تھے۔ مجھے ان عہدیداروں سے بہت کچھ سیکھنا تھا اور پاپا بھی اسی ملک میں رہ کر ہماری نگرانی کرنا چاہتے تھے کہ ہم کس طرح کاروباری معاملات سے نمٹ رہے ہیں۔

ہم نے فیصلہ کیا۔ حالات جیسے بھی پیش آئیں' ہم ساتھ رہیں گے۔ پاپا نے کہا۔ "خدا کے فضل و کرم سے میری اتنی عزت اور شہرت ہے کہ اخبار والے میرے خلاف کوئی خبر شائع نہیں کریں گے۔ ٹھوس ثبوت کے بغیر ہم پر غلط الزامات عائد نہیں کئے جا سکیں گے۔"

تیسرے ہی دن ممی نے پاپا کے نام ایک وکیل کے ذریعے نوٹس بھیجا۔ ان سے وضاحت طلب کی گئی تھی کہ انہوں نے بیوی کو گھر سے کیوں نکالا ہے؟ ان کی بیٹی کو داشتہ بنا کر کیوں رکھا ہے؟ اپنی وفادار بیوی پر جو الزامات لگائے تھے' وہ ڈی آئی جی آف پولیس کی موجودگی میں جھوٹے ثابت ہو چکے ہیں۔ کیا انہوں نے جھوٹے الزامات اس لئے لگائے تھے کہ بیوی کو نکال کر اس کی بیٹی کو داشتہ بنا کر رکھیں؟ اگر ان تمام سوالات کے جواب میں معقول وضاحت پیش نہ کی گئی تو مسز شیریں بدر عدالت سے رجوع کریں گی۔

پاپا معقول وضاحت پیش کرنا چاہتے تھے لیکن دوسری صبح کے اخبارات میں ممی نے

یہ نوٹس شائع کرا دیا کہ بدر عالم کے نام قانونی طور پر سوالنامہ جاری کیا تھا لیکن انہوں نے اسے وصول کرنے سے انکار کیا ہے۔ لہٰذا اس نوٹس کے سوالات شائع کئے جا رہے ہیں۔ اگر انہوں نے معقول جوابات نہ دیئے تو ان کے خلاف عدالت میں مقدمہ دائر کیا جائے گا۔

پاپا نے کہا۔ "اخبارات میں میرے خلاف کوئی خبر شائع نہیں کی جا سکتی تھی۔ اس لئے اس نے نوٹس شائع کرانے کے بہانے ہم پر کیچڑ اچھالی ہے۔ میرا مخالف بزنس مین عبداللہ شیرازی اس کی پشت پر ہے۔ وہی میرے خلاف پلاننگ کر رہا ہے اور وہ دشمن عورت اس پلاننگ پر عمل کر رہی ہے۔"

ایسے وقت انہوں نے سینے میں تکلیف محسوس کی۔ مجھ سے کہا۔ "طبیعت زیادہ بگڑنے سے پہلے مجھے اسپتال جانا چاہئے۔"

میں نے ڈرائیور کو بلا کر گاڑی نکالنے کو کہا۔ یہ بات سمجھ میں آ رہی تھی کہ ممی جو حملے کر رہی ہیں' وہ ان کے دل و دماغ پر اثر انداز ہو رہے ہیں۔ اسپتال پہنچتے پہنچتے ان کی طبیعت اور زیادہ بگڑ گئی۔ ایک ڈاکٹر انہیں اٹینڈ کرنے لگا۔ میں ویٹنگ روم میں بیٹھ کر انتظار کرنے لگی۔ ان کے بارے میں سوچنے لگی۔ جب سے میں انہیں بیٹی کی بھرپور محبت دینے لگی تھی۔ وہ اپنی زندگی کی خاص خاص باتیں مجھے بتانے لگے تھے۔

ان میں سے ایک خاص بات یہ تھی کہ انہوں نے تیس برس کی عمر میں پہلی شادی کی تھی۔ شادی کے پانچ برس بعد بھی اولاد نہ ہوئی تو انہوں نے اپنا اور اپنی وائف کا میڈیکل چیک اپ کرایا تھا۔ میڈیکل رپورٹ نے بتایا کہ ان کی وائف ماں بن سکتی ہیں' لیکن وہ نیگیٹو ہیں' باپ نہیں بن سکتے۔ وہ دولت مند خاتون تھیں' ان سے طلاق لے کر چلی گئیں۔

وہ اولاد سے تو محروم رہنے ہی والے تھے' ایک شریکِ حیات سے بھی محروم ہو گئے پھر انہوں نے تقریباً بیس برس تک شادی نہیں کی۔ انہیں اولاد کی کمی بری طرح محسوس ہوتی تھی۔ سوچتے تھے' اتنی دولت کس کے لئے کما رہے ہیں؟ وہ بانجھ ہیں' انہیں کبھی کوئی وفا کرنے والی بیوی نہیں ملے گی۔ رشتے دار خود غرض تھے۔ وہ کسی کی اولاد کو گود نہیں لینا چاہتے تھے۔ پچپن برس کی عمر میں انہیں پتا چلا کہ ان کے دل میں سوراخ ہو گیا ہے۔ ان ہی دنوں ممی ان سے گھل مل رہی تھیں۔ انہیں اپنی قربت سے متاثر کر رہی تھیں۔ یہ کہا کرتی تھیں کہ وہ اپنی بیٹی کا شاندار مستقبل بنانا چاہتی ہیں لیکن شوہر نااہل

ہے۔ وہ بیٹی کے ساتھ مفلسی اور محتاجی کی زندگی گزار رہی ہیں۔ ایسی زندگی گزارنے سے تو بہتر ہے کہ ناکارہ شوہر سے طلاق لے لی جائے۔

پاپا ان سے سحرزدہ ہو چکے تھے۔ انہوں نے سوچا' بیوی کے ساتھ ایک بیٹی بھی ملے گی' اولاد کی کمی پوری ہو جائے گی۔ ممی نے انہیں اپنی طرف مائل دیکھا تو میرے ابو سے طلاق کے کاغذات لے کر انہیں دکھا دیئے۔ وہ بے چارے سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ممی کے لئے شادی اور طلاق محض ایک کھیل ہے اور ایک کاروبار ہے۔

بہرحال اس شادی سے انہیں نقصان بھی ہوا اور فائدہ بھی۔ نقصان یہ ہوا کہ ممی بے وفا اور فراڈ نکلیں.......... اور فائدے میں انہیں ایک محبت کرنے والی بیٹی مل گئی تھی۔

ممی کو فراڈ کرنے کے بعد بھی سکون نہیں مل رہا تھا۔ وہ بہت ہی شرمناک حملے کر رہی تھیں۔ پاپا سے یہ حملے برداشت نہیں ہو رہے تھے۔ وہ ایک بیٹی کے ساتھ بدنام ہو کر دنیا کو منہ نہیں دکھا سکتے تھے اور یہ صدمہ تو بالکل ہی ناقابل برداشت تھا کہ جسے وہ صدقِ دل سے بیٹی بنا چکے ہیں۔ وہ ان کی موت کے بعد بھی ان کے نام سے بدنام ہوتی رہے۔ دنیا کا کوئی بدترین دشمن بھی ایسی دشمنی نہ کرتا' جیسی کہ ایک ماں کر رہی تھی۔

میں خیالات سے چونک گئی۔ نرس نے آکر کہا۔ "تم ابھی تک یہاں بیٹھی ہو؟ تمہیں گھر جا کر آرام کرنا چاہئے۔"

"میرے پاپا کیسے ہیں..........؟"

"بالکل ٹھیک ہے۔ انہوں نے ایک کاغذ اور قلم مانگا تھا۔ میں نے انہیں دیا ہے' ابھی وہ کچھ لکھ رہے ہیں۔"

میں نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کہا۔ "وہ ایسی حالت میں بھی لکھنے پڑھنے سے باز نہیں آتے۔ میں انہیں آرام سے سونے کو کہوں گی۔ انہیں اپنے ہاتھ سے دوا پلاؤں گی۔"

نرس نے کہا۔ "بی بی! یہ ملاقات کا وقت نہیں ہے۔ تم ملنا ہی چاہتی ہو تو ڈاکٹر سے اجازت لو۔"

میں وہاں سے ڈاکٹر کے چیمبر میں آئی پھر بولی۔ "میرے پاپا جاگ رہے ہیں۔ میں ان سے کچھ باتیں کرنا چاہتی ہوں۔"

ڈاکٹر نے کہا۔ "بی بی! انہیں آرام کرنے دو۔ وزیٹنگ آورز میں آکر ملاقات کرو۔"

"یہی تو میں پاپا سے کہنا چاہتی ہوں کہ وہ آرام کریں۔ ابھی نرس نے بتایا ہے کہ وہ لکھنے پڑھنے میں مصروف ہیں۔"

اسی وقت ایک دوسری نرس نے آکر کہا۔ "سر! مسٹر بدر عالم کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی ہے۔ آپ فوراً چلیں۔ وہ سانس نہیں لے پا رہے ہیں۔"

ڈاکٹر فوراً ہی اٹھ کر تیزی سے ادھر جانے لگا۔ میں بھی اس کے پیچھے اس کمرے میں پہنچ گئی۔ ایک نرس اور دو وارڈ بوائے انہیں جبراً لٹا کر ان کی ناک پر آکسیجن لگا رہے تھے۔ وہ کچھ نارمل ہوئے اور گہری گہری سانسیں لینے لگے۔ ایک نرس نے ڈاکٹر سے کہا۔

"سر! یہاں خواب آور گولیاں رکھی ہوئی ہیں۔ پتا نہیں یہ کتنی گولیاں کھا چکے ہیں؟"

ڈاکٹر نے ان گولیوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "او گاڈ! یہ تو ان کے لئے زہر ہیں۔ میں نے تاکید کی تھی کہ موجودہ حالات میں یہ گولیاں بالکل استعمال نہ کریں۔ یہ ان کے پاس کہاں سے آگئیں؟"

میں نے اس شیشی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ ان کے بیڈ روم میں تھیں۔ یہ اسے جیب میں رکھ کر لے آئے ہیں۔"

وہ سانسیں لیتے لیتے جھٹکے کھانے لگے۔ ڈاکٹر انہیں قے کرانا چاہتا تھا' تاکہ گولیاں باہر آجائیں۔ قے کرانے کے انتظامات کرانے کے لئے بھی کچھ وقت لگا۔ وہ دیدے پھیلا کر حسرت سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ میں رونے لگی۔ ان کے پاس جا کر سر سہلانا چاہتی تھی لیکن مجھے ان کے قریب جانے نہیں دیا گیا۔ میں قدموں کے پاس آگئی۔ دونوں پیروں کو اپنے ہاتھوں سے تھام لیا۔ انہیں پیار سے سہلانے لگی۔ اسی وقت انہوں نے ایک آخری ہچکی لی پھر ایک دم سے ساکت ہو گئے۔

ڈاکٹر نے ان کا معائنہ کیا' پھر مایوسی سے سر جھکا لیا۔ میں دوڑتی ہوئی آکر پاپا سے لپٹ گئی' ان کے سینے پر سر رکھ کر رونے لگی۔

اب تو یہ صدمہ عمر بھر کا تھا۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ انہوں نے نیند کی ڈھیر ساری گولیاں کیوں کھائیں؟ انہوں نے جان بوجھ کر جان دی تھی۔ میں نے آفس کے تمام عہدے داروں کو ان کے انتقال پُرملال کی اطلاع دی۔ ان کی میت کو اسپتال سے گھر لے جاتے وقت میری نظر ان کی جیب پر گر گئی۔ وہاں سے ایک تہہ کیا ہوا کاغذ جھلک رہا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ وہ آخری وقت کچھ لکھ رہے تھے۔ میں نے فوراً ہی اس کاغذ کو نکالا' پھر اسے کھول کر پڑھا۔ یہ ان کی آخری تحریر تھی۔

انہوں نے لکھا تھا۔

"یاخدا! میں نے کوئی گناہ کیا ہو تو مجھے موت کے بعد بھی عذاب دے۔ اگر میں

پاک و صاف نیت رکھتا ہوں اور میں فہمیدہ بانو عرف فہمی کو صدقِ دل سے بیٹی مانتا ہوں' تو میری اس بیٹی کو بے جا بدنامی اور رسوائیوں سے محفوظ رکھ۔ آمین! میں پچھلے برسوں سے موت کا انتظار کررہا ہوں۔ موت نہیں آرہی ہے۔ اگر اور کچھ عرصے زندہ رہوں گا اور بیٹی میرے سائے میں رہے گی تو دن رات بدنام ہوتی رہے گی' میں نہیں رہوں گا اور یہ میری دولت و جائیداد کی وارث بن کر رہے گی تو اس کی ماں اسے بدنام نہیں کرسکے گی۔ میں اسے ایک سگے باپ سے بھی زیادہ محبت دوں گا تب بھی سوتیلا اور نامحرم کہلاؤں گا۔

یہ ضروری نہیں ہے کہ باپ موجود رہ کر اپنی محبتیں دیتا رہے۔ میں ایک ایسا باپ ہوں جو مرنے کے بعد محبت' دولت' عزت اور نیک نامی دے سکتا ہے۔

اور میں یہ سب کچھ دینے کے لئے اپنی زندگی تمام کررہا ہوں۔

اے لوگو! ایک مرنے والا اپنی آخری سانسوں میں کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔

میری بیٹی فہمیدہ بانو عرف فہمی جائے نماز کی طرح پاک ہے۔ تم اس کے آنچل پر نماز پڑھ سکتے ہو۔

فقط' میں اپنی موت کا خود ذمے دار ہوں۔

راقم الحروف' ایک بدنصیب باپ' بدر عالم

یہ آخری تحریر پڑھتے پڑھتے میری آنکھوں میں آنسو بھر گئے تھے۔ حروف دھندلا گئے تھے۔ وہ آخری تحریر میرے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے چھوٹنے والی تھی۔ میں نے فوراً ہی اسے بھینچ کر اپنے دھڑکتے ہوئے سینے سے لگالیا۔

☆======☆======☆

اے طائرِ لاہوتی

میری ایک جیب خالی تھی۔ دوسری جیب میں دس روپے تھے۔ فی الوقت یہ آخری پونجی تھی۔ صبح ناشتا نہیں کیا تھا۔ لنچ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ شام تک کہیں سے آمدنی نہ ہوتی تو رات کو فٹ پاتھ سے روٹی اور چھولے کھا کر سوجاتا۔ بزرگوں سے سنتے آئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ بھوکا نہیں سلاتا۔ میں دس روپے بچا کر اللہ میاں کو یہ کریڈٹ دینا چاہتا تھا کہ اس نے رات کو بھوکا نہیں سلایا۔

میں ایک جدید شاپنگ سینٹر میں کھڑا ہوا تھا۔ میرے آس پاس عورتوں' مردوں' بوڑھوں اور بچوں کا ہجوم تھا۔ وہاں بڑے لوگ شاپنگ کے لئے آتے تھے۔ مجھ جیسے لوگ وہاں کی کسی دکان سے ایک تنکا بھی خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتے تھے پھر بھی وہاں آتا جاتا رہتا تھا۔ ایسے مہنگے شاپنگ سینٹر ہوں' ائرپورٹ ہو یا ایسے تھیٹر ہوں' جہاں امیر کبیر عورتیں اور آزاد خیال رئیس زادیاں آتی ہیں۔ وہاں میں گھات لگانے کے لئے جایا کرتا تھا۔ میں ایک خوبرو جوان ہوں۔ اپنے منہ میاں مٹھو نہیں بننا چاہتا۔ آئینہ دھوکا دیتا ہے' خوش فہمی میں مبتلا کرتا ہے کہ ہم بہت ہینڈسم اور اسمارٹ ہیں لیکن متاثر ہونے والی عورتوں کی نظریں دھوکا نہیں دیتیں۔ وہ جسے پسند کرتی ہیں' اسے نظر بھر کر دیکھتی ضرور ہیں۔

ان کی نظریں کہتی تھیں کہ میں ہینڈسم اور اسمارٹ ہوں' کسی کی خاموش نظریں مجھے آئیڈیل کہتی تھیں' کسی کی نظریں مجھ میں کچھ تلاش کرتی رہتی تھیں۔ اگر کوئی مجھے توجہ سے نہ دیکھے تب بھی پاس سے گزرتے وقت مجھ پر ایک نظر ضرور ڈالتی تھی۔ میں شوبزنس میں کوئی مقام حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہتا تھا۔ فلموں میں چانس ملا مگر کچھ حاصل نہ ہوا۔ جس فلم کو سائن کیا' وہ یا تو شروع نہیں ہوئی اور اگر ہوئی تو وہ مکمل نہ ہوسکی۔ ٹی وی کے ڈراموں میں اپنی صلاحیتوں کو منوانا چاہا لیکن ایک ایک دو دو سین کے چھوٹے چھوٹے کردار ملتے رہے۔ مجھے چانس دینے والے کہتے تھے کہ مجھ میں اداکاری کی

صلاحیتیں نہیں ہیں۔ صرف میرا مردانہ حسن کام نہیں آئے گا۔

کیسے کام نہیں آئے گا؟ میں نے کسی بیوٹی پارلر سے خود کو حسین نہیں بنوایا۔ میرا مردانہ حسن تو خداداد ہے۔ اس دنیا کے مہنگے بازار میں خود کو کیش کرنے کے کئی راستے ہیں۔ ایک بار ایک رئیس خاتون نے مجھے لفٹ دی۔ میرے حالات معلوم کئے۔ میرے لئے مہنگا لباس خریدا۔ مجھے دوسری ضرورت کی چیزیں بھی دلائیں۔ اپنے ساتھ کوٹھی میں لے گئیں۔ دوسری صبح مجھے دو ہزار روپے دے کر کہا۔ "اب جاؤ۔ اگلے فرائی ڈے کو اسی کلب کے سامنے ملو گے تو میں تمہیں اور شاپنگ کراؤں گی مگر خود سے کبھی یہاں نہ آنا۔"

میں تنہا رہتا تھا۔ ماں باپ اور بھائی بہنوں کو بہت پیچھے چھوڑ آیا ہوں۔ وہ مجھے ہڈ حرام کہتے تھے۔ میں دس جماعتوں سے آگے نہ پڑھ سکا مگر ایم اے کا جعلی سرٹیفکیٹ رکھتا ہوں۔ روزی روٹی حاصل کرنے کا کوئی ہنر نہیں جانتا تھا۔ اور اچھا ہوا کہ نہیں جانتا۔ جو لوگ جانتے ہیں وہ کون سا تیر مار لیتے ہیں۔ جتنے ہنر مند ہوتے ہیں' اتنی قدر نہیں ہوتی۔ صبح سے شام تک محنت کرنے کے بعد بال بچوں کے لئے روٹی کپڑے کا آسرا ہوتا ہے۔ بڑی مشکلوں سے بچوں کو تعلیم دلائی جاتی ہے۔ ایک چھوٹا سا کرائے کا مکان ہوتا ہے۔ نہ گاڑی ہوتی ہے' نہ بنگلا ہوتا ہے۔ وہ موسم کے فیشن کے مطابق لباس نہیں پہن سکتے۔ ساری زندگی بسوں میں سفر کرتے ہیں۔ کچھ زیادہ رقم ہو تو ٹیکسی میں بیٹھ جاتے ہیں۔ عمر بھر خود کو اور بیوی کو ناپتے تولتے رہتے ہیں اور ایک بنئے کی طرح زندگی گزار کر مرجاتے ہیں۔

ان کے لئے صرف اتنا کہا جاسکتا ہے کہ وہ رزقِ حلال حاصل کرتے ہیں لیکن یہ رزق حلال بہت مہنگا پڑتا ہے۔ ساری زندگی دکھ بیماریوں سے لڑتے لڑتے' ناقابلِ حل مسائل میں الجھتے الجھتے' اپنی محنت' اپنی تعلیم اور اپنی ہنرمندی کا تمام لہو نچوڑ کر بھی صلے میں کچھ نہیں پاتے۔ بیوی بچوں کو زندگی سے لڑنے کے لئے ہمیشہ کے لئے چھوڑ جاتے ہیں۔ ایسے زندگی نہیں گزرتی۔ انسان بن کر پیدا ہوئے ہیں تو ہمیں انسان کی طرح جینا چاہئے۔ دوسروں کے ہاں کلر ٹی وی ہے' فریج ہے اور کمرے ائرکنڈیشنڈ ہیں تو ہمارے پاس بھی ہونا چاہئے۔ اگر یہ سب کچھ نہیں ہے تو ہم حاصل کرسکتے ہیں۔ تعلیم اور ہنر نہ ہونے کے باوجود بہت کچھ حاصل کرسکتے ہیں۔ بڑی بڑی کوٹھیوں میں رہنے والے اور مہنگی کاروں میں گھومنے والے ہنر مند نہیں ہوتے۔ وہ دوسروں کا ہنر خرید کر دولت کماتے

ہیں۔ میں دوسروں کو خرید نہیں سکتا تھا مگر خود کو اچھے داموں فروخت تو کر سکتا تھا۔

ایک بار ایک رئیس زادی سے ملاقات ہوئی۔ نشاط سینما میں انگریزی فلمیں چلتی ہیں۔ وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ وہاں آیا کرتی تھی۔ میں نے اسے ڈیفنس کی مارکیٹ میں بھی دیکھا تھا۔ ایسی رئیس زادیاں خوب کھانے پینے اور گھومنے پھرنے کی شوقین ہوتی ہیں۔ ان کے بوائے فرینڈز بھی ہوتے ہیں۔ ان کی سہیلیاں نہیں بدلتیں۔ بوائے فرینڈ بدل جاتے ہیں۔ مجھ سے جب بھی سامنا ہوتا تو وہ مجھے دیکھتی، مسکراتی پھر سہیلیوں اور بوائے فرینڈز کے ساتھ ہنستی بولتی چلی جاتی تھی۔

ایک دن ایک شاپنگ سینٹر میں تنہا مل گئی۔ مجھے دیکھ کر بولی۔ "ہائے! میرا نام سمیرا ہے۔"

اس نے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ مجھے صرف مصافحہ کرنا چاہئے تھا مگر میں نے اس کے ہاتھ کو یوں تھاما جیسے خوش نصیبی کو جکڑ رہا ہوں۔ میں نے اندر سے مچلتے ہوئے کہا۔ "آئی ہو تو نہ جانا۔" پھر زبان سے کہا "میرا نام عادل محبوب ہے۔"

"بڑا رومانٹک نام ہے۔ کہاں رہتے ہو؟"

میں یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ ایک بہت ہی پسماندہ علاقے کے سستے سے مکان میں رہتا ہوں اور جھوٹ بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ کوٹھی اور کار والا ہوں۔ میں نے کہا۔ "فی الحال کوئی مستقل ٹھکانا نہیں ہے۔ ایک فلم اور ایک ٹی وی سیریل سائن کرنے والا ہوں۔ رقم ملتے ہی کسی اچھے سے علاقے میں کوٹھی خرید لوں گا۔"

وہ بولی۔ "میں نے ایک شیونگ بلیڈ کے اشتہار میں تمہیں دیکھا تھا۔ کیا فلم اور ٹی وی ڈراموں سے اتنی رقم مل جاتی ہے کہ کوٹھی خرید سکو۔ اگر ایسا ہوتا تو ٹی وی کے تمام فنکار مہنگے علاقوں کی بڑی بڑی کوٹھیوں میں نظر آتے۔"

وہ سمجھ گئی تھی کہ میں ڈینگیں مار رہا ہوں۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ہم فنکار ہیں۔ کوٹھی نہیں خرید سکتے، خواب تو خرید سکتے ہیں۔ ایسے خواب دیکھنے کے لئے پیٹ بھر کر کھانا اور سونا ضروری ہے۔"

وہ ہنستے ہوئے بولی۔ "چلو میرے ساتھ لنچ کرو۔ کیا تمہارے پاس اس سے بہتر لباس نہیں ہے؟"

میں نے اپنی اوقات کے مطابق اچھا خاصا لباس پہنا تھا لیکن اچھے سے اور اچھا، بہتر

سے بہترین کا معیار بلند ہوتا رہتا ہے۔ بلندی پر رہنے والے معیار اور کوالٹی کو سمجھتے ہیں۔ ہمیں کچھ اچھا مل جائے تو اپنی سطح کے لوگوں میں ناز کرتے ہیں کہ بہت اچھا پہن رہے ہیں، بہت اچھا کھا رہے ہیں۔ بہت اچھی زندگی گزار رہے ہیں۔ سمیرا جیسی رئیس زادی کے سامنے اپنی کمتری کا پتا چلتا ہے۔

وہ مجھے ایک ریوالونگ ہوٹل میں لے آئی۔ وہ ہوٹل ٹاپ فلور پر تھا۔ دائرے کی صورت میں اتنی آہستگی سے گھومتا رہتا تھا کہ کسی بھی میز پر بیٹھ کر وہاں سے پورے شہر کا نظارہ کیا جا سکتا تھا۔ ہم اتنے بڑے شہر میں رہتے ہیں مگر یہ نہیں جانتے کہ یہاں ایسے خوبصورت اور مہنگے ہوٹل بھی ہیں جہاں بیٹھ کر کھاتے کھاتے پورے شہر کا نظارہ کیا جا سکتا ہے۔ میں احساسِ کمتری میں مبتلا ہو گیا تھا۔

اس نے پوچھا۔ "کیا صرف ماڈلنگ کرتے ہو؟ لیکن میں نے ایک اشتہار کے بعد تمہیں کبھی نہیں دیکھا۔"

"یہاں ٹیلنٹ (TALENT) کی قدر کرنے والے نہیں ہیں۔ سوچتا ہوں، انڈیا چلا جاؤں۔ وہاں ماڈلنگ کرنے والے لکھ پتی اور کروڑ پتی بن جاتے ہیں۔"

وہ بولی۔ "جو اپنی زمین سے اناج نہ اگا سکے۔ وہ دوسروں کی زمین پر ہل نہیں چلا سکتا۔ وہاں ہانگ کر کھا سکتا ہے۔ یہاں کوئی ملازمت کرو، محنت مزدوری کرو۔"

"میں ایک معیاری زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔ عام لوگوں کی طرح مزدوری نہیں کر سکتا۔ میں ایم اے پاس ہوں۔ مجھے میری تعلیم کے مطابق ملازمت نہیں ملتی ہے۔"

"پھر تم کرتے کیا ہو؟ جیسی معیاری زندگی چاہتے ہو، اس کے لئے کچھ کرتے تو ہو گے؟"

"کچھ کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہوں۔ اب مجبور ہو کر سوچ رہا ہوں، کوئی بھی ملازمت ملے تو کر لوں گا۔"

"ایک کام ہے، کرو گے؟"

"تم کہتی ہو تو ضرور کروں گا، کام کیا ہے؟"

"کام مشکل نہیں ہے۔ میرے ساتھ گھومنا پھرنا ہے۔ میری سہیلیاں اپنے اپنے بوائے فرینڈز پر بڑا ناز کرتی ہیں۔ میرا ایک بوائے فرینڈ تھا۔ وہ بس یونہی سا تھا۔ تم ہینڈسم ہو، اسمارٹ ہو۔ بہترین لباس پہنو گے تو میری سہیلیاں تمہیں دیکھتی رہ جائیں گی۔ میں ان

سب کو احساسِ کمتری میں مبتلا کرنا چاہتی ہوں۔"

بعض رئیس زادیوں کے درمیان ایسے ہی مقابلے ہوتے ہیں۔ کس کے پاس کتنی مہنگی کار ہے؟ کون کتنے مہنگے بیوٹی پارلر میں جاتی ہے؟ کس کا ہیئر اسٹائل اس کے چہرے اور اس کی شخصیت سے میچ کرتا ہے؟ جس کے پاس جو بھی چیز ہے' وہ دوسروں سے سپیریئر SUPERIOR ہے یا نہیں ہے؟ اگر نہ ہو تو فارن کنٹریز سے منگوالی جاتی ہے۔

سمیرا نے مجھے شاپنگ کرائی۔ خود کو سہیلیوں میں سپر رکھنے کے لئے مجھے سپر بنانا ضروری تھا۔ اس نے میری ضرورت کی تمام چیزیں خریدیں۔ مجھے پانچ ہزار روپے دیئے اور کہا کہ میں روز شام کو ڈیفنس کلب آیا کروں۔ وہاں اس سے ملاقات ہوا کرے گی۔ اس کی سہیلیوں اور بوائے فرینڈز کے ساتھ اسنوکر اور رمی وغیرہ کھیلا کریں گے۔

میں نے کہا۔ "میں رمی اور فلیش کا مانا ہوا کھلاڑی ہوں۔ اکثر جیتتا رہتا ہوں۔"

وہ بولی۔ "پھر تو مزہ آجائے گا۔ تم ان سے بڑی بڑی رقمیں جیت سکو گے۔"

"لیکن میں اسنوکر نہیں جانتا۔ سیکھنے کا موقع ملا تو سیکھ لوں گا۔"

"تم کل آؤ۔ میں ان سب سے تمہارا تعارف کراؤں گی۔ تمہیں دیکھتے ہی ان پر بجلی گرے گی۔"

یہ ایک رئیس زادی نے کہا کہ مجھے ایک کے پاس دیکھ کر دوسری لڑکیوں پر بجلی گرتی ہے۔ میں خود نہیں کہتا کہ کتنا خوبرو ہوں۔ اپنے میاں مٹھو نہیں بنتا۔ زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھو۔ ان کی نظریں' ان کی ادائیں نقارے کی طرح کہتی ہیں کہ میں کیا ہوں؟

میں دوسری شام نئے لباس اور نئے جوتے پہن کر اس کلب میں پہنچا تو سمیرا کی سہیلیاں مجھے یوں دیکھنے لگیں جیسے نظروں سے ہائے کہہ رہی ہوں۔ ان کے بوائے فرینڈز نے مجھے ناگواری سے دیکھا۔ مگر خوش اخلاقی سے مصافحہ کیا۔ سمیرا میرے بازو میں بازو ڈالے مجھ سے چپکی رہی۔ اپنی اداؤں اور اپنے رویوں سے انہیں کہتی رہی۔ "یہ میرا بوائے فرینڈ ہے۔ کوئی ایسا ہو تو سامنے آئے۔"

ایک سہیلی کے بوائے فرینڈ نے رمی کھیلنے کے لئے کہا۔ میں سمیرا کے ساتھ بیٹھ گیا۔ میں نے ایک بازی ہاری' تین بازیاں جیت لیں۔ دوسرے بوائے فرینڈ نے فلیش کھیلنے کے لئے کہا۔ اس کھیل میں تو میں نے انہیں نچوڑ کر رکھ دیا۔ ان کی گرل فرینڈز کے پرس خالی کر دیئے۔ سمیرا بہت خوش تھی۔ رات کو رخصت ہوتے وقت کہا۔ "بڑی سہیلیاں بنتی

پھرتی ہیں۔ دوست بن کر انسلٹ کرتی ہیں۔ آج تو میں نے بھی خوب انسلٹ کی ہے۔ سب اندر ہی اندر کڑھ رہی ہوں گی۔"

میرے تو وارے نیارے ہوگئے۔ رئیس زادیاں اپنے پاس زیادہ رقم نہیں رکھتی ہیں۔ زیادہ رقم کی ضرورت ہو تو کریڈٹ کارڈ استعمال کرتی ہیں۔ پہلی ملاقات میں ان کے پاس جتنی رقم تھی' انہوں نے اتنی ہی بازی کھیلی' میں نے تقریباً پچیس ہزار جیتے تھے۔ یہ رقم سمیرا کے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھی۔ اس نے ساری رقم مجھے دے دی۔ میں نے زندگی میں پہلی بار صرف چند گھنٹوں میں پچیس ہزار روپے کمائے تھے۔

میں چھوٹے علاقے میں چھوٹے لوگوں کے ساتھ پتے کھیلا کرتا تھا۔ کبھی دو چار سو روپے جیت لیا کرتا تھا۔ کبھی ہار جایا کرتا تھا۔ یہ کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ایسے کلبوں میں رسائی حاصل کر کے ایک دن میں اتنی دولت کمائی جا سکتی ہے۔

ہم ہمیشہ کلب نہیں جایا کرتے تھے۔ کبھی تمام دوستوں کے ساتھ آؤٹنگ کے لئے نکل جایا کرتے تھے۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ اس کی سہیلیاں مجھ سے متاثر ہوتی رہتی ہیں۔ اس کی ایک سہیلی ایک بہت ہی امیر کبیر باپ کی بیٹی تھی۔ وہ کسی سے کم تر رہنا گوارا نہیں کرتی تھی۔ سمیرا سے خاص طور پر مقابلہ ہوتا رہتا تھا۔ اس بار سمیرا اس سے سپر ہوگئی تھی۔ روما یہ برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے کہہ دیا کہ وہ کچھ دنوں کے لئے یورپ کے ٹور پر جا رہی ہے۔

اس کے جانے کے بعد سمیرا نے ہنستے ہوئے کہا۔ "وہ یورپ سے بوائے فرینڈ لانے گئی ہے۔"

اس کی بات پر سب ہنسنے لگے۔ میں سنوکر اور دوسرے انڈور گیمز سیکھتا رہا اور پتے کھیلتا رہا۔ تاش کے پتے ہمیشہ کسی کا ساتھ نہیں دیتے۔ میں کبھی جیت جاتا تھا مگر بری طرح ہارنے بھی لگا تھا۔ میں انگریزی جانتا اور اٹک اٹک کر بول بھی سکتا ہوں۔ سمیرا اس بات پر ناراض ہوتی تھی۔ مجھے سکھاتی تھی کہ کس طرح برگر فیملی کے انداز میں انگریزی بولنی چاہئے۔ مگر سیکھنے میں وقت لگتا ہے۔ اس نے غصے سے کہا۔ "نہ تم کوئی کام کر سکتے ہو' نہ ڈھنگ سے انگریزی بول سکتے ہو۔ میری سہیلیاں منہ دبا کر ہنستی رہتی ہیں۔"

میں مجبور تھا۔ اونچی سوسائٹی میں خود کو پوری طرح ڈھال نہیں سکتا تھا۔ کوا ہنس کی چال چلے تو کہیں نہ کہیں سے اس کی اصلیت جھلکتی رہتی ہے۔ ایک دن مجھے روما مل گئی۔

اس نے کار کا دروازہ کھول کر کہا۔ "آؤ بیٹھو۔"

میں بیٹھ گیا۔ اس نے پوچھا۔ "سمیرا تمہیں کیا دیتی ہے؟"

میں نے انجان بن کر کہا۔ "میں تمہاری بات نہیں سمجھا۔ وہ مجھے کیا دے گی' میں اس کا محتاج نہیں ہوں۔"

"مجھ سے صاف اور سیدھی بات کرو۔ تم رئیس زادے بنتے ہو مگر ہو نہیں۔ میں تمہارے بارے میں بہت کچھ معلوم کر چکی ہوں۔ سچ نہیں بولو گے تو میں تمام سہیلیوں اور دوستوں کو اس بستی میں لے آؤں گی جہاں تم کیڑے مکوڑوں کی طرح زندگی گزارنے والوں کے ساتھ رہتے ہو۔"

مجھے سچ بولنا پڑا۔ میں نے کہا۔ "سمیرا مجھے شاپنگ کراتی ہے' رمی اور فلیش میں جیتی ہوئی رقم مجھے دے دیتی ہے۔"

اس نے پوچھا۔ "وہ تمہیں اپنی طرف سے کیش نہیں دیتی؟"

"نہ وہ دیتی ہے نہ میں مانگتا ہوں۔ کبھی میرا ایک پیسے کا بھی اکاؤنٹ نہیں تھا۔ اب میرے اکاؤنٹ میں ستر ہزار روپے ہیں۔"

وہ بولی۔ "بہت خوش ہو۔ یہ ستر ہزار کیا ہوتے ہیں؟ میں تو ایک پھونک میں اڑا دیتی ہوں۔ تم کنوئیں کے مینڈک تھے' سمیرا تمہیں تالاب میں لے آئی۔ تم اس تالاب کو بہت بڑی دنیا سمجھ رہے ہو۔ اس سے بھی بڑا دریا ہے اور دریا سے بڑا سمندر ہے۔ سمندر میں اترنا چاہتے ہو تو میرے پاس آجاؤ۔"

"میں سمجھا نہیں' تم کیا کہنا چاہتی ہو؟"

"میں تمہیں روز ایک ہزار روپے دوں گی۔ جیتی ہوئی رقم بھی تمہاری ہوا کرے گی۔ میں تمہیں شاپنگ بھی کرایا کروں گی۔ اس سے زیادہ اور کیا چاہتے ہو' میں تمہاری ہر ضرورت پوری کروں گی۔"

یہ سب سے بڑی آفر تھی کہ وہ ہر روز مجھے ایک ہزار روپے دینا چاہتی تھی۔ ماہانہ تیس ہزار روپے کبھی میرے باپ دادا نے بھی نہیں کمائے تھے۔ یہ کہاوت ہے کہ جوا کسی کا نہ ہوا۔ جوا کھیلنے والا کبھی کبھی جیت لیتا ہے ورنہ ہارتا چلا جاتا ہے۔ تاش کے پتے کسی کو دولت مند نہیں بناتے۔ دولت مند کو کنگال بنا دیتے ہیں۔ یہ تیس ہزار روپے کی مقررہ آمدنی میری اوقات سے بہت زیادہ تھی۔ میرا بینک بیلنس بڑھتا چلا جاتا۔ کوئی جواری اسے

نہ لے جاتا۔

پھر یہ کہ سمیرا مجھے بوائے فرینڈ نہیں سمجھتی تھی۔ تاش کا جوکر سمجھتی تھی۔ اس نے مجھے باتیں بھی سنائی تھیں۔ مجھے زر خرید غلام سمجھتی تھی۔ میں روما کی آفر قبول کر کے اسے یہ دکھا سکتا تھا کہ میری کتنی مارکیٹ ویلیو ہے۔ اس کی سوسائٹی میں میرا ریٹ بڑھتا جا رہا ہے۔ میں نے کہا۔ "مجھے منظور ہے۔"

روما نے میرے لئے نیا لباس خریدا۔ جوتے اور ضرورت کی دوسری چیزیں بھی خرید کر دیں۔ پھر اس نے ایک سہیلی کے گھر آ کر سمیرا کو فون پر مخاطب کیا۔ "ہیلو سمیرا! کیسی ہو؟ میں یورپ سے واپس آگئی ہوں۔"

اس نے سمیرا کی کچھ باتیں سننے کے بعد کہا۔ "ہاں' جلدی واپس آئی ہوں۔ ایک ہینڈسم اور اسمارٹ بوائے فرینڈ ساتھ لائی ہوں۔ کل شام کلب میں آرہی ہو؟"

اس نے سمیرا کی بات سنی پھر کہا۔ "او کے ضرور آنا۔ اپنے بوائے فرینڈ عادل محبوب کو ضرور ساتھ لانا۔"

اس نے ریسیور رکھ کر اپنی سہیلی سے کہا۔ "تم دوسری سہیلیوں کو فون کرو۔ انہیں کل شام کلب میں بلاؤ۔ بڑا مزہ آئے گا اور عادل' تم جاؤ۔ کل شام پانچ بجے یہاں آجانا۔ میں تمہیں اپنے ساتھ کلب لے جاؤں گی۔"

روما نے مجھے جتنا سامان دلایا تھا' میں وہ سب اٹھا کر لے گیا۔ اس دنیا کے بازار میں کوئی علمی صلاحیت بیچتا ہے' کوئی ہنر بیچتا ہے۔ شوبزنس میں حسن و جمال اور اسمارٹنس کی خرید و فروخت ہوتی ہے۔ حسین عورتوں کو مرد ناظرین پسند کرتے ہیں اور خوبرو مردوں کو عورتیں اسکرین پر دیکھ کر پسند کرتی ہیں۔ میں مارکیٹ میں پسندیدہ بننا چاہتا تھا۔ اس کے لئے ٹی وی اور فلموں میں راستہ نہیں ملا۔ بات تو صرف پسند کرانے کی تھی۔ خواتین میری قدر و قیمت بڑھا سکتی تھیں اور میں اس راستے سے پسندیدگی حاصل کر چکا تھا۔ میری قیمت بڑھ رہی تھی۔

دوسری شام میں روما کے ساتھ اس کلب میں گیا۔ تمام سہیلیاں وہاں آرہی تھیں لیکن سمیرا نہیں آئی۔ وہ میرے ساتھ یہاں آنے کے لئے میرا انتظار کر رہی ہوگی۔ یہی بات تھی۔ وہ تھوڑی دیر بعد آئی۔ مجھے دیکھتے ہی بولی۔ "تم یہاں ہو؟ اور میں وہاں تمہارا انتظار کر رہی تھی۔ مجھے فون تو کرنا چاہئے تھا؟"

میں نے کہا۔ "وہ.......... وہ بات یہ ہے کہ روما سے ملاقات ہوگئی تھی۔ میں اس کے ساتھ یہاں آگیا۔"

سمیرا نے سوالیہ نظر سے روما کو دیکھا۔ وہ میرے ایک ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر بولی۔ "کیوں سمیرا! کیسا ہے میرا بوائے فرینڈ! تم کہتی تھیں یہ لاکھوں میں ایک ہے اور یہ صرف تمہارا ہے؟"

سمیرا کے چہرے سے رنگ اڑ گیا تھا۔ وہ اپنی انسلٹ محسوس کررہی تھی۔ ایک سہیلی نے کہا۔ "تمہارا بوائے فرینڈ بہت مہنگا تھا۔ اسے روما ہی افورڈ کرسکتی ہے۔"

دوسری سہیلی نے کہا۔ "ہمارے درمیان ہار جیت کا کھیل ہوتا رہتا ہے۔ تم جیت رہی تھیں، اب روما جیت گئی ہے۔ ٹیک اِٹ ایزی سمیرا! یہ نہ سہی اور سہی۔ تم تو بوائے ہنٹر ہو۔"

سمیرا نے حقارت سے کہا۔ "اونہہ! ایسے بوائے فرینڈز آتے جاتے رہتے ہیں۔ ہمیں روما کی عقل پر ماتم کرنا چاہئے، یہ مجھے لٹ ڈاؤن (LET DOWN) کرنے کے لئے میرا جھوٹا کھا رہی ہے۔"

سمیرا نے بڑی زبردست بات کہہ دی تھی۔ روما نے ہنستے ہوئے کہا۔ "تم کھانے کی بات کرتی ہو۔ میں نے تو اسے چکھا بھی نہیں ہے۔ اسے صرف تم سے چھینا ہے۔ یہ بتایا ہے کہ تمہاری خریداری بہت کمزور ہوتی ہے۔ آج تک تم میری کوئی چیز نہ خرید سکیں نہ چھین سکیں۔ میں نے یہ کرد کھایا ہے۔ میں اسے واپس کررہی ہوں، خیرات سمجھ کرلے لو۔"

"میرے کتے بھی تم سے خیرات نہیں لیں گے۔ میرا جھوٹا اٹھا کر لائی ہو تو خود ہی اسے کسی گٹر میں لے جاکر پھینک دو۔ گٹر کے کیڑے گٹر میں ہی رہا کرتے ہیں۔"

میں ان کے درمیان کھڑا اپنے بارے میں ایسی ذلت آمیز باتیں سن رہا تھا۔ مجھے جھوٹا کھانا اور گٹر کا کیڑا کہا جا رہا تھا جیسے میری کوئی عزت ہی نہ ہو۔ میرے علاقے میں یہ مشہور ہوچکا تھا کہ میں نے ایک بڑی فلم سائن کی ہے اور بھی فلمیں سائن کررہا ہوں۔ مجھے لاکھوں روپے مل رہے ہیں۔ میرے جوتے، میرے کپڑے اور شیمپو سے دھلا ہوا سر دیکھ کر سب مجھے سر کہنے لگے تھے۔ محلے کی عورتیں اور مرد سبھی کہتے تھے کہ میں دوسرے ہیروز کی طرح ایک بڑی شاندار کوٹھی میں رہنے چلا جاؤں گا۔ ان کی طرف پلٹ

کر نہیں آؤں گا اور میں کہتا تھا۔ "تم لوگوں کو نہیں بھولوں گا۔ اپنی کار میں بیٹھ کر تم لوگوں سے ملنے آیا کروں گا۔ اپنی ہیروئنوں کو بھی ساتھ لاکر دکھاؤں گا کہ تم سب مجھ سے کتنی محبت کرتے ہو۔ میری کتنی عزت کرتے ہو۔"

میرے ایک طرف سمیرا ہیروئن تھی۔ دوسری طرف روما ہیروئن تھی۔ اور وہ کسی لحاظ اور مروت کے بغیر میری عزت اتار رہی تھیں۔ یہ نہیں جانتی تھیں کہ میرے لوگوں میں میری کتنی عزت ہے۔ وہاں بے قدری ہونے لگی تو سمجھ میں آیا کہ عزت اپنوں میں ہوتی ہے۔ اپنی حیثیت کے مطابق اپنی سوسائٹی، اپنے طبقے میں ہوتی ہے۔ مینڈک کنوئیں اور تالاب میں رہتے ہیں۔ شارک مچھلیاں سمندر میں رہا کرتی ہیں۔ میں روما کے ساتھ سمندر میں اترنے آیا تھا۔ اس نے تو مجھے ڈبو ہی دیا۔ میں نہ اُدھر کا رہا، نہ اِدھر کا۔ سمیرا مجھے دیکھ کر "شِٹ" کہہ کر چلی گئی۔

روما نے مجھ سے کہا۔ "میرا مقصد پورا ہوچکا ہے، تم جاسکتے ہو۔"

میں نے کہا۔ "یہ کیا کہہ رہی ہو؟ تم نے کہا تھا کہ.........."

"زیادہ نہ بولو۔ میں نے کوئی ایگری منٹ نہیں کیا تھا۔ آئندہ مجھے مخاطب بھی نہ کرنا۔"

میں ایک مظلوم کی صورت بناکر اس کی سہیلیوں کو دیکھنے لگا۔ میرا خیال تھا، میری مارکیٹ ویلیو بن چکی ہے۔ ان میں سے کوئی نہ کوئی میری قدر کرے گی لیکن وہ سب روما کے ساتھ چائے پینے چلی گئیں۔ میں وہاں تنہا رہ گیا۔ اس کلب کا ممبر نہیں تھا، اس لئے کسی کے بغیر وہاں داخل نہیں ہوسکتا تھا۔ مجھے وہاں سے واپس آنا پڑا۔

یہ بے قدری میری حماقت سے ہوئی تھی۔ زیادہ کمانے کا لالچ نہ کرتا تو سمیرا کے ساتھ لمبے عرصے تک رہ کر لمبی کمائی کرسکتا تھا۔ ویسے کمائی کا ایک راستہ مل گیا تھا۔ میں کبھی شاپنگ سینٹر، کبھی ائرپورٹ، کبھی کسی تھیٹر وغیرہ میں جانے لگا۔ اس شہر میں رئیس زادیوں کی کمی نہیں تھی۔ فلرٹ کرنے والی دولت مند خواتین مل جاتی تھیں۔ وہ سب تاش کے پتوں کی طرح تھیں۔ پتا نہیں کون سا بڑا پتا میرے ہاتھ آکر میری جیت کو بدلنے والا تھا۔

اور جب تک جیت نہ ہوتی، اس وقت تک بدنصیبی سے چھوٹے پتے ہاتھ آتے رہتے۔ ایک دن اسماء سے ملاقات ہوئی۔ اسے میں بیوٹی کوئن نہیں کہوں گا مگر وہ

خوبصورت تھی۔ اسے دیکھا تو وہ دل میں اتر گئی۔ میں عاشق مزاج نہیں ہوں۔ کسی سے فلرٹ کرسکتا ہوں' محبت نہیں کرسکتا۔ مگر مجھے ایسا لگا جیسے وہ زبردستی میرے دل میں گھسی آرہی ہو۔

ملاقات یوں ہوئی کہ وہ ایک فٹ پاتھ سے دوسرے فٹ پاتھ تک جانے کے لئے سڑک پار کررہی تھی۔ اس نے بے خیالی میں سگنل کی طرف دھیان نہیں دیا۔ ایک کار سے ٹکرانے والی تھی۔ میں نے لپک کر اسے پکڑا اور اپنی طرف کھینچ لیا۔ وہ چیخ مار کر مجھ سے لپٹ گئی۔ پہلی بار پتا چلا کہ آگ لپٹ جائے تو جلاتی نہیں ہے بلکہ آتش پرست بنا دیتی ہے پھر ساری زندگی اس آگ کی پرستش کرنے کو جی چاہتا ہے۔

دنیا میں لاکھوں حسینائیں ہیں لیکن دل جس پر مائل ہو جائے' وہی دنیا کی حسین ترین عورت ہوتی ہے۔ اس کے بدن کا پہلا تعارف ایسا تھا کہ میں آگ سے لپٹ کر رہ گیا۔ ہم درمیانی فٹ پاتھ پر تھے۔ ہمارے دائیں بائیں گاڑیاں گزر رہی تھیں۔ وہ اس حادثے سے سہمی ہوئی تھی' جو ہوتے ہوتے رہ گیا تھا۔ جب یقین ہوا کہ بچ گئی ہے تو فوراً ہی مجھ سے الگ ہوگئی۔ دوپٹے سے اپنے آپ کو چھپانے لگی۔ فٹ پاتھ پر اکڑوں بیٹھ کر بکھری ہوئی کتابیں اٹھانے لگی۔ میں بھی کتابیں اٹھا کر اسے دینے لگا تو وہ جھجکتے ہوئے میرے ہاتھوں سے لینے لگی۔ میں نے کہا۔ "تم نے سگنل کا خیال نہیں کیا۔ اگر میں تمہارے پیچھے نہ ہوتا تو؟"

وہ شکریہ کہتی ہوئی اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ سرخ سگنل کے باعث گاڑیاں رک گئیں۔ وہ سڑک پار کرکے دوسری طرف جانے لگی۔ میں نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔ "تمہارا نام اسماء ہے؟"

اس نے چونک کر مجھے دیکھا پھر پوچھا۔ "آپ مجھے جانتے ہیں' کیسے جانتے ہیں؟"

"میں بہت کچھ جانتا ہوں۔ بہت کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ ریسٹورنٹ میں چلو' آرام سے باتیں ہوں گی۔"

"سوری۔ میں ایسی بے تکلفی پسند نہیں کرتی۔"

"میں نے تمہیں بے تکلف ہونے کو نہیں کہا ہے۔ اس ریسٹورنٹ میں عورتیں مردوں کے ساتھ جاتی ہیں۔ ہم دو گھڑی باتیں کریں گے پھر تم اپنے راستے پر چلی جانا' میں اپنے راستے پر چلا جاؤں گا۔"

"پلیز' آپ یہیں بتا دیں کہ مجھے کیسے جانتے ہیں؟"

"میں بتاؤں گا تو تم سوالات کرتی جاؤگی۔ میں جواب دیتا جاؤں گا۔ کیا یہ سوال جواب کا سلسلہ فٹ پاتھ پر اچھا لگے گا؟"

وہ تجسس میں مبتلا ہوگئی تھی کہ میں کون ہوں اور نہ جانے اس کے بارے میں کیا کچھ جانتا ہوں؟ اس نے بے بسی سے ریسٹورنٹ کی طرف دیکھا۔ پھر سر جھکا کر میرے ساتھ ایک کیبن میں آکر بیٹھ گئی۔ میں نے کہا۔ "لنچ کا وقت ہے' مجھے بھوک لگی ہے۔ تم کیا کھاؤ گی؟"

"میں کچھ نہیں کھاؤں گی' صرف ایک گلاس پانی پیوں گی۔ آپ مجھے تجسس میں مبتلا نہ کریں۔"

"تمہارا تمام تجسس ختم ہو جائے گا۔ مجھے علم نجوم سے دلچسپی ہے۔ میں ابھی تمہارا زائچہ بنا کر تمہارا ماضی' حال اور مستقبل بتاؤں گا۔"

وہ گھور کر بولی۔ "اور زائچہ بنانے کے لئے میری پیدائش کا وقت اور تاریخ پوچھو گے؟ میری عمر معلوم کرو گے؟"

"میں نہیں پوچھوں گا۔ مجھے سب معلوم ہے۔ تم ۲۰ دسمبر ۱۹۷۷ء کو پیدا ہوئی تھیں۔ اس وقت تم تیئس برس کی ہو۔"

وہ شدید حیرانی سے مجھے دیکھنے لگی۔ حیرت سے اس کا منہ بھی کھل گیا تھا' میں نے کہا۔ "اب آگے میں اسی وقت کچھ کہوں گا جب میرے ساتھ لنچ کرو گی۔"

میں نے بیرے کو بلا کر کھانے کا آرڈر دیا۔ وہ چلا گیا' وہ بولی۔ "یہ تو علم نجوم نہیں' جادو ہے۔ میں نے بتایا نہیں اور آپ کو میری تاریخ پیدائش معلوم ہوگئی۔ میرے ابو اٹھارہ گریڈ کے افسر تھے۔ انہیں بھی علم نجوم کا شوق ہے۔ امی ان کے شوق سے بیزار رہتی ہیں۔"

میں نے کہا۔ "مجھے سب معلوم ہے۔ تمہارے ابو ریٹائرڈ ہو چکے ہیں۔ اب ان کا یہی شغل رہ گیا ہے۔ کبھی صحیح اور کبھی غلط پیش گوئیاں کرتے رہتے ہیں۔"

"اللہ! آپ تو کمال کے نجومی ہیں۔ میرے ابو کے بارے میں بھی جانتے ہیں۔"

وہ حیرانی کے باعث اور خوبصورت لگ رہی تھی۔ میں اسے باتوں میں الجھانے لگا۔ دراصل جب فٹ پاتھ پر اس کی کتابیں بکھر گئی تھیں تو ایک کتاب سے نکلا ہوا ایک کاغذ

میرے ہاتھ آگیا تھا۔ اس کاغذ پر اس کا بائیوڈیٹا درج تھا۔ یقیناً وہ کہیں ملازمت حاصل کرنے جا رہی تھی۔ پھر ملازمت نہ حاصل ہونے کے باعث مایوس ہو کر واپس آ رہی تھی۔ اسی مایوسی اور بے خیالی کے باعث حادثہ ہوتے ہوتے رہ گیا تھا۔

اس بائیوڈیٹا میں اس کی تاریخ پیدائش لکھی ہوئی تھی۔ پھر اس نے کہا کہ اس کے ابو اٹھارہ گریڈ کے افسر تھے۔ یعنی اب نہیں تھے۔ انہیں علم نجوم کا شوق ہے۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ زندہ ہیں۔ اس کی امی علم نجوم سے بیزار رہتی ہیں۔ اس سے اندازہ لگایا کہ وہ الٹی سیدھی پیش گوئیاں کرتے رہتے ہیں۔ میری یہ تمام قیاس آرائیاں درست ہو رہی تھیں۔ اگر ایک آدھ غلط ہوتی تو میں باتیں بنالیتا۔

بیرا میز پر کھانا لگا کر چلا گیا۔ میں نے کہا۔ "کھانا شروع کرو۔ میں باتیں کرتا رہوں گا اور اپنے کمالِ فن سے تمہیں حیران کرتا رہوں گا۔ تمہارا حیرت زدہ چہرہ بہت اچھا لگتا ہے۔ جی چاہتا ہے' دیکھتا ہی رہوں۔"

وہ سر جھکا کر سر پر آنچل رکھنے لگی۔ میں نے کہا۔ "کچھ خیال نہ کرنا۔ تم اچھی لگتی ہو۔ اس لئے تعریف کر رہا ہوں۔ میں نجومی ہوں' ہمیشہ سچ بولتا ہوں۔ اگر تم اچھی نہ لگتیں تو میں تمہاری تعریف نہ کرتا۔"

میں نے لقمہ چباتے ہوئے کہا۔ "تم نے ابھی تک کھانا شروع نہیں کیا ہے۔ میں ابھی ایک اہم بات سمجھانے والا ہوں۔ اگر تم ہاتھ روکو گی تو میں کچھ نہیں بولوں گا۔"

وہ میری باتیں سننا چاہتی تھی۔ مجھ سے نظر چرا کر کھانے لگی۔ بڑا اچھا لگ رہا تھا۔ خرید و فروخت کی دنیا سے نکل کر ایک سیدھے سادے اور لین دین سے پاک ماحول میں بہت اچھا لگ رہا تھا۔ یہ اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ رئیس زادی نہیں ہے۔ میرے ہی طبقے سے تعلق رکھتی ہے۔ وہ مجھے کچھ دے نہیں سکے گی لیکن محبت تو دے سکے گی۔ کاروبار الگ ہوتا ہے' محبت الگ ہوتی ہے۔ میں خود غرضی کو بالائے طاق رکھ کر اسماء سے پارٹ ٹائم محبت کر سکتا تھا۔

وہ دھیمی آواز میں بولی۔ "آپ چپ ہیں۔ مجھے کوئی اہم بات سمجھانے والے تھے۔"

میں نے لقمہ چباتے ہوئے ایک گھونٹ پانی پیا پھر کہا۔ "تمہیں مایوس نہیں ہونا چاہئے۔ ملازمت آج نہیں ملی' کل مل سکتی ہے۔"

اس نے پھر چونک کر مجھے دیکھا' پھر پوچھا۔ "آپ کیسے جانتے ہیں کہ آج مجھے ملازمت نہیں ملی؟"

"یہ نہ پوچھو' کیسے جانتا ہوں' کیا جانتا ہوں۔ یہ پوچھو میں کیا نہیں جانتا۔ کچھ ایسی باتیں بھی جانتا ہوں جو سچ ہیں مگر تم سچائی سے انکار کرو گی۔"

"میں نے اب تک آپ کی تمام باتوں کو سچ مانا ہے۔ پھر ایسی کیا سچائی ہے کہ میں انکار کروں گی؟"

"وعدہ کرتی ہو کہ انکار نہیں کرو گی؟"

"وعدہ کرتی ہوں۔ آپ اچھی اور سچی باتیں کہہ رہے ہیں۔"

"ایک سچ یہ ہے کہ تم مجھ سے متاثر ہو رہی ہو۔"

وہ ایک دم سے پہلو بدل کر منہ پھیر کر بولی۔ "جی نہیں۔"

"یہ ایسی بات ہے جسے تم تسلیم نہیں کرو گی کیونکہ ابھی تم خود اپنے اندر کی اس سچائی کو نہیں سمجھ رہی ہو۔ یہاں سے جاؤ گی تو رفتہ رفتہ میرے اس سچ کو تسلیم کرو گی۔ میں نے اب تک تمہارے بارے میں کوئی جھوٹ نہیں کہا ہے۔"

وہ پانی پی کر ٹشو پیپر سے ہاتھ پونچھتے ہوئے بولی۔ "میں جاؤں گی۔"

"ایک سچ یہ بھی ہے کہ میں روکنا چاہوں گا تو تم نہیں رکو گی۔ جاؤ' مگر وعدہ کرو' میں جاگتے وقت خیالوں میں آؤں گا۔ سوتے وقت خوابوں میں دکھائی دوں گا تو کل یہاں اسی وقت آؤ گی۔ میں انتظار کروں گا۔ مجھ سے سچائیاں سننا چاہتی ہو تو چلی آنا۔"

وہ چلی گئی۔ جانے کے بعد بھی میری نگاہوں میں رہی۔ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ میں کبھی کسی عورت میں دلچسپی نہیں لیتا تھا کیونکہ دلچسپی لینے والیاں خود ہی کھنچی چلی آتی تھیں۔ میں نے صنفِ مخالف سے بے نیاز رہنا سیکھا تھا۔ مگر یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ اسماء میں کیا بات ہے؟ وہ چلی گئی تھی مگر میرے خیالات اس کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔

یہ بہت پہلے کی بات ہے۔ جب وہ پہلی بار ملی تھی۔ آج بھی وہ میرے اندر جم کر بیٹھی ہے۔ میری زندگی میں آنے والیاں آتی ہیں' جاتی ہیں مگر وہ کسی کو میرے دل میں نہیں آنے دیتی۔ میری دنیا میں ایسی کوئی پیدا ہوئی ہے نہ ہو گی۔

میں نے اس کے جانے کے بعد سوچا۔ یہ مجھے کیا ہو رہا ہے؟ وہ سامنے تھی' میں دلچسپی لے رہا تھا۔ بس یہ کافی تھا مگر اس کے جانے کے بعد بھی اس کو کیوں دیکھ رہا ہوں؟

اتنی سی ملاقات میں اس کا ناک نقشہ' اس کی شرم و حیا اور اس کی ایک ایک ادا مجھے کیوں زبانی یاد ہوگئی ہے' یہ محبت ہو رہی ہے؟ تو ہونی چاہئے مگر عشق نہیں ہونا چاہئے' عشق دو کوڑی کا بنا دیتا ہے۔

اب میں دو کوڑی کا آدمی نہیں تھا۔ سمیرا کے ساتھ رہ کر خوب مال بنا چکا تھا۔ بینک میں ستر ہزار پڑے تھے۔ جیب میں تین ہزار تھے۔ یہ تین ہزار میں اندر کی جیب میں رکھتا تھا۔ محلے کی دکانوں سے کچھ خریدتے وقت لباس کے اندر سے پورے تین ہزار نکال کر ہزار ہزار کے نوٹ گنتا تھا۔ چھوٹے دکاندار اور گاہک ہزار ہزار کے نوٹوں کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتے تھے۔ دکاندار عاجزی سے کہتا تھا۔ "عادل بھائی! میرے پاس ہزار کا کھلا نہیں۔ کوئی بات نہیں' آپ جتنا سامان چاہیں لے جائیں' رقم بعد میں بھیج دیں۔"

میں وہ تین ہزار اندرونی جیب میں رکھ کر دوسری جیب سے سو سو کے نوٹ نکال کر کہتا تھا۔ "ادھار محبت کی قینچی ہے۔ یہ لو اپنی رقم' باقی واپس کرو۔"

پورے محلے میں میری امارت کا چرچا تھا۔ یہ اندازہ لگایا جاتا تھا کہ میری جیب میں اتنے ہیں تو گھر میں کتنے ہوں گے۔ ان کا خیال تھا' میں لاکھوں روپے کما رہا ہوں اور مجھے لاکھوں سے زیادہ کمانے کی فکر تھی لیکن آمدنی ایک جگہ پہنچ کر رک گئی تھی۔ اب رقم نہیں آ رہی تھی۔ بلکہ خرچ ہو رہی تھی۔ پچھلی رات پتے کھیل کر دو ہزار ہار گیا تھا۔ دو دن پہلے ڈھائی ہزار ہار چکا تھا۔ گھر میں جو رقم تھی' وہ خرچ ہو چکی تھی۔ چھوٹی عمر سے جوا کھیلنے کی عادت تھی۔ دوسرے جواریوں کی طرح میرے اندر بھی یہ تحریک پیدا ہوتی رہتی تھی کہ آج تقدیر ضرور ساتھ دے گی؟ آج ضرور کھیلنا چاہئے۔ یوں کھیلتے کھیلتے گھر میں رکھی ہوئی تمام رقم ہاتھ سے نکل گئی تھی۔ اگر آمدنی کا سلسلہ شروع نہ ہوا تو بینک سے رقم نکالنی ہوگی۔

میں بڑے بڑے شاپنگ سینٹرز میں جانے لگا تھا۔ ایسے کئی کلب اور کمیونٹی سینٹرز تھے۔ جہاں دولت مند خواتین آتی رہتی تھیں۔ سمیرا اور روما نے بڑی شاپنگ کرائی تھی۔ میرے پاس پہننے اور اسمارٹ بن کر رہنے کے لئے بہت کچھ تھا۔ میں نے دیکھا تھا کہ لڑکیاں ہوں یا خواتین' وہ مجھے دیکھتی تھیں' آپس میں کچھ بولتی تھیں۔ ایک امید بندھنے لگتی تھی کہ بات بننے والی ہے مگر نہیں بن رہی تھی۔ تقدیر ساتھ نہیں دے رہی تھی۔

دوسرے دن اسماء اسی وقت ریسٹورنٹ کے سامنے آئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک

چھوٹا سا بیگ تھا۔ میں نے مسکرا کر کہا۔ "میری پیش گوئی غلط نہیں ہوتی' میں جانتا تھا تم آؤ گی۔ آج بھی لنچ کا وقت ہے۔ آؤ اندر چلیں' کل تم نے کچھ نہیں کھایا تھا' شرما کر چلی گئی تھیں۔"

وہ بولی۔ "کل آپ نے کھلایا تھا' آج میں کھلاؤں گی۔"

"مرد کما کر کھلاتا ہے۔ عورت پکا کر کھلاتی ہے۔ جب پکا کر کھلانے کا وقت آئے گا تو تم ضرور کھلانا۔ میں ضرور کھاؤں گا' ابھی تو اندر چلو۔"

"جی نہیں۔ میں گھر سے پکا کر لائی ہوں۔ اس بیگ کے اندر کھانا ہے۔"

"کیا؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔ "تم میرے لئے گھر سے پکا کر لائی ہو؟"

"میں نے اپنے ہاتھوں سے پکایا ہے۔ کسی گارڈن میں چلیں' وہاں بیٹھ کر کھائیں گے۔"

میں نے عجیب سی خوشی محسوس کی۔ پہلی بار ایک لڑکی نے میرے لئے اپنے ہاتھوں سے پکایا تھا۔ میں نے کہا۔ "تم مجھے اتنی خوشیاں دے رہی ہو جس کی میں توقع نہیں کر سکتا تھا۔ آؤ ٹیکسی میں چلتے ہیں۔"

"یہ فضول خرچی ہوگی' ہمیں بس میں چلنا چاہئے۔"

میں نے کہا۔ "ٹیکسی میں بیٹھنا سیکھو۔ میرے ساتھ رہو گی تو ہوائی جہاز میں بھی سفر کرو گی۔"

ہم ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر گارڈن آ گئے۔ میں نے ایک گھنے درخت کے سائے میں بیٹھے ہوئے کہا۔ "ٹیکسی ڈرائیور کی موجودگی میں دل کی باتیں کہنے کا موقع نہیں ملتا۔ میں جلد ہی ایک کار خریدنے والا ہوں۔"

"آپ کیا کرتے ہیں؟"

"میں شوبزنس میں ہوں۔ تم نے شیونگ بلیڈ کے اشتہار میں مجھے دیکھا ہوگا۔ ایک فلم میں ہیرو کا رول کر رہا ہوں۔ ایک ٹی وی سیریل میں بھی آنے والا ہوں۔"

"آپ شوبزنس میں کتنے عرصے سے ہیں؟"

"پچھلے پانچ برسوں سے دھوم مچا رہا ہوں۔ تم سوچ بھی نہیں سکتیں' میرے کتنے چاہنے والے ہیں۔"

"آپ کی وہ فلم پانچ برسوں سے بن رہی ہے؟"

مجھے یوں لگا جیسے اس نے میرا جھوٹ پکڑ لیا ہے۔ میں نے بات بنائی۔ "بعض فلمیں برسوں میں تیار ہوتی ہیں۔ تمہیں پتا ہے' مغل اعظم کتنے برسوں میں تیار ہوئی تھی۔ مجھے بھی پتا نہیں ہے مگر تیاری میں کئی برس لگ گئے تھے۔ اس کے ہیرو دلیپ کمار کی طرح میں بھی سپرہٹ ہیرو بننے والا ہوں۔"

"مجھے لگتا ہے کہ آپ خوابوں اور خیالوں کی دنیا میں رہتے ہیں۔ آپ کو علم نجوم میں مہارت حاصل ہے۔ آپ اس علم کو آمدنی کا ذریعہ کیوں نہیں بناتے؟"

میں نے ٹالنے کے انداز میں کہا۔ "تم پہلی ملاقات میں شرما رہی تھیں۔ دوسری ملاقات میں میرے کام کی اور میری آمدنی کی باتیں کر رہی ہو۔ کیا ایک دوسرے سے متاثر ہونے کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے؟"

وہ بولی۔ "حالات بدل رہے ہیں۔ مہنگائی کمر توڑ رہی ہے۔ ہم لڑکیوں کے سوچنے کا انداز بدل گیا ہے۔ میں ٹیوشن پڑھاتی ہوں۔ ایک چھوٹے سے اسکول میں ٹیچر ہوں۔ ماہانہ سات سو روپے ملتے ہیں۔ سوچتی ہوں' میں جسے چاہوں گی' جس کا گھر بساؤں گی' اس کا آدھا بوجھ بھی اٹھاؤں گی۔ اصل محبت یہی ہے' ایسے گارڈن اور تو اسپاٹ پر صرف فلمی محبت ہوا کرتی ہے۔"

دوسری ملاقات میں ہی اس کے سوچنے اور زندگی گزارنے کا انداز سمجھ میں آ گیا۔ میں نے کہا۔ "میں بھی یہی کر رہا ہوں۔ میں نے بھی یہی سوچا ہے' جسے چاہوں گا' اس کے لئے تاج محل تو نہیں بنا سکوں گا' ایک گھر ضرور بناؤں گا۔ اتنا کماؤں گا کہ وہ میرے بچوں کے ساتھ آسودگی کی زندگی گزارتی رہے گی۔"

"آپ کوئی دوسرا کام کیوں نہیں کرتے؟ میں فلمیں دیکھتی ہوں۔ پرانے اور نئے اداکاروں کی لائف ہسٹری پڑھتی ہوں۔ اداکاروں کو اسی وقت تک شہرت اور معاوضہ ملتا رہتا ہے جب تک ان کے ہیرو بننے کی عمر رہتی ہے یا پھر ان کی فلمیں ناکام ہوتی ہیں تو انہیں کوئی نہیں پوچھتا۔ ہمارے ملک میں جتنے اداکار ہیں وہ اپنی آخری عمر بڑی کسمپرسی میں گزارتے ہیں۔ ساری عمر اتنا نہیں کما پاتے کہ بڑھاپا آرام سے گزار سکیں۔"

وہ میرے مزاج کے برعکس تھی۔ وہ زمین پر رہ کر سوچتی تھی۔ میں آسمان پر اڑتا رہتا تھا۔ میں نمائش کے لئے ٹیکسی میں بیٹھتا تھا۔ ریسٹورنٹ میں کھانا کھلاتا تھا۔ وہ بس میں سفر کرتی تھی اور گھر کا پکا ہوا کھاتی اور کھلاتی تھی۔ اس کے بیگ کے اندر ایک ٹفن کیریئر

اور پانی کی بوتل تھی۔ اس نے میرے سامنے کھانا رکھتے ہوئے کہا۔ "اسے کھا کر دیکھیں۔ میں نے جیسا بھی پکایا ہے' مگر ہوٹل کے مہنگے کھانوں سے اچھا ہوگا۔"

میں نے کھا کر دیکھا تو مزہ آ گیا۔ وہ دیکھنے میں جتنی لذیذ تھی' کھانا چکھنے میں اتنا ہی لذیذ تھا۔ میں نے کہا۔ "تمہارے ہاتھ میں جادو ہے۔ میں مدتوں بعد گھر کا کھانا کھا رہا ہوں۔ واقعی' اب مجھے گھر کا کھانا کھانا چاہئے۔ کفایت شعاری کا مشورہ دے رہی ہو تو یہ بتاؤ' کب سے میرے گھر کا چولہا جلاؤ گی؟"

وہ چند لمحوں تک شرماتی رہی' سوچتی رہی پھر بولی۔ "آپ کا گھر کہاں ہے؟ گھر میں کون کون ہے؟ آپ اپنے بارے میں کچھ بتائیں؟"

"میں نے چھ برس پہلے اپنا گھر چھوڑ دیا تھا۔ وہ بھی تمہاری طرح یہی کہتے تھے کہ شوبز میں شہرت ملتی ہے۔ مگر فنکار ننگا بھوکا رہتا ہے لیکن میں خود کو منوانے کے لئے اس شہر میں آ گیا۔ جب تک شہرت اور دولت حاصل نہیں کروں گا' گھر واپس نہیں جاؤں گا۔"

"یہ آپ اچھا نہیں کر رہے ہیں۔ آپ علم نجوم کے ذریعے دوسروں کا ماضی' حال اور مستقبل بتاتے ہیں۔ اپنے بارے میں کیوں نہیں معلوم کرتے' کیا آپ نے اپنے علم سے یہ معلوم نہیں کیا تھا کہ آپ کی یہ فلم پانچ برسوں میں بھی تیار نہیں ہوگی؟"

میں نے اسے محبت اور بڑی لگن سے دیکھا پھر پوچھا۔ "کیا تم میرے علم نجوم کی وجہ سے مجھ سے متاثر ہو؟ اگر یہ علم کمزور پڑے گا' میری پیش گوئیاں غلط ہوا کریں گی تو کیا تم مجھ سے نہیں ملا کرو گی؟"

"آپ ایسی باتیں نہ کریں۔ میں کل سے آپ کے بارے میں سوچتی رہی ہوں۔ یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ آپ مجھے کیوں اچھے لگ رہے ہیں؟ رات دیر تک جاگتی رہی۔ شاید محبت ایسی ہی ہوتی ہے۔ کوئی بے وجہ دل و دماغ پر چھا جاتا ہے۔ ایسے وقت یہ کبھی نہیں سوچا جاتا کہ وہ بڑا آدمی ہے یا کوئی معمولی انسان ہے۔ وہ ہمارے لئے چاند تارے توڑ کر لائے گا یا زمین پر ہل چلائے گا۔ ایسا کچھ بھی نہیں سوچا تھا۔ بس محبت ہو جاتی ہے' دل بے ایمان ہو جاتا ہے' اپنا نہیں رہتا۔"

"پھر میری آمدنی کا حساب کیوں کر رہی تھیں؟"

"پہلے میں نے اپنی بات کی ہے کہ میں اپنے جیون ساتھی کا آدھا بوجھ اٹھانے کے

لئے کیا کرسکتی ہوں اور کیا کررہی ہوں؟ اب وہ افسانوی محبت کا دور نہیں رہا۔ لڑکیوں کو اپنی محبت کو قائم و دائم رکھنے کے لئے پہلے سے معاشی مسائل کا حل ڈھونڈنا پڑتا ہے۔ تم چاہو تو اپنے علم نجوم سے میرے جذبات' احساسات اور عزائم کے بارے میں بہت کچھ معلوم کرسکتے ہو۔"

"تمہاری محبت بے لوث ہے۔ اس یقین کے ساتھ کہہ رہا ہوں میں کوئی نجومی نہیں ہوں۔"

میں نے تہہ کیا ہوا کاغذ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "یہ تمہارا بائیو ڈیٹا ہے۔ میں نے اس میں تمہاری تاریخ پیدائش پڑھی۔ تمہاری باتوں سے تمہارے ابو کے بارے میں کچھ اندازے لگائے جو درست ثابت ہوئے اور تمہیں یقین ہوگیا کہ میں ماہر نجومی ہوں۔"

وہ مجھے حیرانی و بے یقینی سے دیکھ رہی تھی۔ پھر بولی۔ "کیا آپ سچ کہہ رہے ہیں؟ اگر یہ سچ ہے تو پھر جھوٹ کیوں کہا تھا؟"

"صرف تمہارے قریب آنے کے لئے۔ تمہاری محبت حاصل کرنے کے لئے۔ میں بدنیت ہوتا تو اب بھی جھوٹ بول کر تمہیں دھوکا دیتا رہتا۔"

"مجھے جھوٹ اور فریب سے نفرت ہے۔ میں تم سے نہیں بولوں گی۔"

"مگر بولوگی' ضرور بولوگی۔ میری یہ پیش گوئی بھی سچی ہے۔"

وہ ہنستے ہوئے بولی۔ "پھر نجومی بن رہے ہو۔ مجھے اور بے وقوف نہ بناؤ۔"

اس دن ہم شام تک گھومتے پھرتے رہے۔ پھر وہ اندھیرا ہونے سے پہلے چلی گئی۔ اس میں اور دوسری لڑکیوں میں بڑا فرق تھا۔ دوسری لڑکیاں اندھیرا ہونے کے بعد بھی ساتھ نہیں چھوڑتی تھیں۔ شاید اسی لئے اسماء میرے دل میں گھر کررہی تھی۔ دوسرے دن میرے گھر آئی۔ میرے گھر کی حالت دیکھ کر بولی۔ "کیا ایک کمرے کا گھر ہوتا ہے؟ یہ ایک کمرا بھی کرائے پر لیا ہوا ہے۔ تم نے اپنے گھر والوں کو چھوڑ کر یہاں آکر ان چھ برسوں میں کیا حاصل کیا؟ اس کمرے میں کیا ہے؟ ایک چارپائی' دو کرسیاں' ایک پرانی الماری........"

میں نے الماری کھولتے ہوئے کہا۔ "اس پرانی الماری میں دیکھو' کیا کچھ نہیں ہے۔ مہنگے ملبوسات ہیں۔ لیدر شوز ہیں۔ شیمپو' کریم' کاسمیٹکس کا تمام امپورٹڈ سامان ہے۔"

اس نے پوچھا۔ "کیا اس سے معاشی مسائل حل ہوں گے؟"

"اوہ خدایا! مجھے نہیں معلوم تھا' تم یہاں آکر معاشی مسائل پر بحث کروگی۔ ہم یہاں پیار سے کچھ وقت گزارنے آئے ہیں۔ یہاں آرام سے کرسی پر بیٹھو۔"

"میں یہاں صرف چند منٹ کے لئے آئی ہوں۔ زیادہ دیر رہوں گی تو محلے پڑوس والے باتیں بنائیں گے۔ ہمیں باہر چلنا چاہئے۔"

"محلے والوں کی فکر نہ کرو۔ سب لوگ میری عزت کرتے ہیں۔ یہاں کوئی تمہارے بارے میں غلط بات نہیں کہے گا۔ دیکھو' تم آپ ہی آپ بے تکلف ہوگئی ہو۔ پہلے مجھے آپ کہتی تھیں' اب تم کہنے لگی ہو۔ مجھے خوشی ہورہی ہے کہ تم مجھے بالکل اپنا سمجھ رہی ہو۔"

میں نے اس کے دونوں بازوؤں کو پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا۔ وہ کھنچی چلی آئی۔ میری دھڑکنوں سے لگ گئی۔ مجھے تو ایسا لگا جیسے آگ سے کھیل رہا ہوں اور برف کی طرح پگھل رہا ہوں۔ وہ بولی۔ "پتا نہیں مجھے کیا ہوگیا ہے۔ میں بہت محتاط رہنے کی عادی ہوں۔ تمہارے بارے میں بہت کچھ معلوم کرنا چاہتی ہوں۔ اس لئے یہاں چلی آئی۔ یہاں آکر میرا دل ڈوب رہا ہے۔ تم خود کو جس طرح پیش کررہے ہو' ویسے نہیں ہو۔"

"کیا تم سمجھتی ہو' میں باہر سے کچھ اور اندر سے کچھ ہوں؟ کیا میں تمہیں دھوکا دے رہا ہوں؟"

"سچ بولو گے تو دھوکا نہیں ہوگا۔ تم جیسے بھی ہو' میں تمہیں قبول کروں گی لیکن اپنا آدھا چہرہ دکھاؤ گے' آدھا چھپاؤ گے تو میں تم سے دور چلی جاؤں گی۔ تمہارے بغیر نہیں رہ سکوں گی' ہو سکتا ہے مرجاؤں۔ دھوکا کھانے سے مرجانا بہتر ہے۔"

"مرنے کی باتیں نہ کرو۔ ہم دونوں ساتھ جئیں گے' ساتھ مریں گے۔ مجھ پر بھروسہ کرو۔"

"سچ بولنے والے پر بھروسا کیا جاتا ہے۔ مجھ سے کچھ نہ چھپاؤ' تم جیسے بھی ہو میں تمہاری ہوں۔ تمہاری رہوں گی۔"

میں نے کہا۔ "مجھے کوئی ملازمت نہیں ملتی۔ میں محنت مزدوری نہیں کرسکتا۔ یہ میرے مزاج کے خلاف ہے۔ یہ میرا عزم ہے کہ میں دولت کماؤں گا اور ضرور کماؤں گا۔"

وہ مجھ سے الگ ہو کر بولی۔ "تم خوابوں کی دنیا میں رہتے ہو۔ جن کے پاس دولت ہوتی ہے وہ دولت کماتے ہیں۔ پیسا پیسے کو کھینچتا ہے۔ تم خالی ہاتھ' خالی ذہن سے سوچتے رہ جاؤ گے۔"

"میں بالکل خالی نہیں ہوں۔ میرے بینک اکاؤنٹ میں ستر ہزار روپے ہیں۔"

"یہ تو اچھی بات ہے۔ تم اس رقم سے کوئی کاروبار شروع کر سکتے ہو۔ فٹ پاتھ سے کام شروع کرنے والے شاپنگ پلازہ تک پہنچ جاتے ہیں۔ تمہاری لگن سچی ہو گی' محنت کرو گے تو تمہارے تمام خواب پورے ہو جائیں گے۔"

"میں فٹ پاتھ پر ریڑھی نہیں لگا سکتا۔ پرچون کی دکان کھول کر ایک بنئے کی طرح صبح سے رات تک ایک جگہ بیٹھا نہیں رہ سکتا۔ میں اس لئے پیدا نہیں ہوا ہوں۔ میں کوئی بڑا ہاتھ مارنا چاہتا ہوں۔"

"تو پھر جوا کھیلو۔"

"وہ تو میں کھیلتا ہوں۔"

"کیا؟" اس نے طنزیہ انداز میں جوا کھیلنے والی بات کہی تھی اور میں نے سچ اگل دیا تھا۔ وہ بڑے دکھ سے بولی۔ "تم جوا کھیلتے ہو۔ جو رقم ہاتھ میں ہوتی ہے' اسے دوسروں کے ہاتھوں میں دے دیتے ہو۔"

پچھلے دنوں میرے ساتھ یہی ہوا تھا۔ میرے ہاتھ کی رقم دوسرے کے ہاتھ میں چلی گئی تھی۔ میں نے بات بنائی۔ "میں ہمیشہ نہیں کھیلتا۔ کبھی دوست مجبور کرتے ہیں تو ایک آدھ بازی کھیل لیتا ہوں۔"

وہ بڑی مایوسی سے بولی۔ "اوہ عادل! تمہیں کیا ہونا چاہئے تھا۔ تم کیا بن رہے ہو؟"

"میں نے بڑی ٹھوکریں کھائی ہیں۔ بدترین حالات کا سامنا کرتا رہا۔ فاقے کرتا رہا۔ جب ہیرا پھیری شروع کی تو دو وقت کی روٹیاں ملنے لگیں۔ یہ دنیا والے مانگنے سے نہیں دیتے۔ چھیننے سے دے دیتے ہیں۔ میں ڈاکوؤں کی طرح چھینتا نہیں ہوں' کسی نہ کسی طریقے سے کچھ نہ کچھ حاصل کر کے میں نے ستر ہزار روپے جمع کئے ہیں۔ آگے کوئی آمدنی کی صورت نظر نہیں آ رہی ہے۔ پھر بھی میں مایوس نہیں ہوں۔ مجھے پھر کوئی زبردست چانس ملے گا۔"

اس نے دروازے کے پاس جا کر اسے کھولا۔ میں نے ہاتھ پکڑ کر پوچھا۔ "مجھے چھوڑ

کر جاؤ گی؟"

"تم نے تو مجھے جکڑ لیا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا' کیا کروں؟ مجھے جانے دو۔ اچھی طرح سوچنے دو۔ سمجھنے دو' تمہارے قریب رہوں گی تو جذباتی سوچ غالب آتی رہے گی۔"

میں اس کے ساتھ باہر آ گیا۔ دروازے پر تالا لگا کر اس کے ساتھ چلتے ہوئے بولا۔ "اسماء! ہم ایک دوسرے کے لئے پیدا ہوئے ہیں۔ مجھ سے منہ پھیر کر نہیں رہ سکو گی۔ میں بھی تمہارے بغیر نہیں رہ سکوں گا۔ تم مجھ سے نہیں ملو گی تو میں تمہارے گھر کے سامنے کھڑا رہوں گا۔ تم دکھائی نہیں دو گی' تمہارے گھر کو دیکھتا رہوں گا۔ پلیز' مجھ سے دور نہ ہونا۔ میرے لئے سوچتی رہنا۔ مجھ سے ملتی رہنا۔"

ہم بس اسٹاپ پر آ گئے۔ اس نے پوچھا۔ "مجھ سے مل کر کیا کرو گے؟ میں تمہارے جیسی نہیں بن سکتی اور تم میرے جیسے نہیں بنو گے۔"

"محبت میں انداز بدل جاتے ہیں۔ جذبات اور خیالات بدل جاتے ہیں۔ پیار کرنے والے ایک دوسرے کے رنگ میں رنگ جاتے ہیں۔ ہو سکتا ہے' ہم ایک دوسرے کے مزاج میں ڈھل جائیں۔"

وہ قائل ہو کر بولی۔ "ایسا ہو سکتا ہے۔ خدا کرے تمہارا سوچنے سمجھنے کا اور زندگی گزارنے کا انداز بدل جائے۔ مجھ سے زیادہ خوشی کسی کو نہیں ہو گی۔"

"تو پھر کل ملو گی؟"

روز ملوں گی' روز پوچھوں گی کہ ایک نئی زندگی شروع کرنے کے لئے کیا کر رہے ہو؟ تمہاری محنت اور لگن سے میری بھی نئی زندگی شروع ہو گی۔"

وہ بس میں بیٹھ کر چلی گئی۔ میں پھر واپس آ کر سوچنے لگا۔ اسماء کی محبت میری زندگی کو مشکل بنا رہی ہے۔ ابھی میں کتنی بے فکری سے زندگی گزار رہا ہوں۔ کبھی خوب کماتا ہوں۔ کبھی کچھ نہیں کماتا۔ پچھلی کمائی سے گزارا کرتا ہوں۔ میرا ایک پیٹ ہے۔ آج نہ بھرے تو کوئی بات نہیں' دوسرے دن کسی طرح بھر جاتا ہے۔

اسماء اپنے ساتھ بڑے مسائل لے کر آئے گی۔ میں محلے پڑوس میں بیویوں اور بچوں والوں کو دیکھتا ہوں۔ صبح اٹھ کر پانی بھرتے ہیں۔ گھر میں راشن لانے کی فکر کرتے ہیں۔ کم پیسوں میں پورا راشن نہیں آتا۔ بیویوں سے لڑتے ہیں اور بچوں پر غصہ اتارتے

ہیں۔ محنت مزدوری سے پورا نہیں پڑتا۔ ہیرا پھیری کرتے ہیں' محلے کے کتنے ہی لوگوں نے مجھ سے قرض لیا مگر ادا نہیں کیا۔ کبھی منہ چھپاتے ہیں کبھی ڈھیٹ بن کر کہتے ہیں۔ "گھر والی بیمار ہے۔ بچوں کے اسکول کی فیس دینی ہے۔ گیس اور بجلی کا بل چڑھتا جا رہا ہے۔ تمہارا قرض کہاں سے ادا کریں؟ ذرا صبر کرو۔"

میں نے دوسرے دن اسماء سے کہا۔ "شوبز کی دنیا میں کوئی چانس نہیں ہے۔ میں تمام رات سوچتا رہا۔ تمہارے مشورے کے مطابق بزنس کروں گا۔ مگر کیسے کروں گا؟ کچھ سمجھ میں نہیں آتا' کیا کاروبار کرنا چاہئے؟"

وہ بولی۔ "پہلے پانچ دس ہزار روپے سے کام شروع کرو۔ میرے بھائی جان تھوک مارکیٹ سے سامان خرید کر لاتے ہیں اور ہمارے علاقے کے کئی گھروں میں ضرورت کا سامان پہنچاتے ہیں۔ ایک تو عام دکانداروں کے مقابلے میں دو چار روپے کم لیتے ہیں پھر ایک ہفتے کا ادھار رکھتے ہیں پھر یہ کہ انہیں گھر بیٹھے ضرورت کا سامان مل جاتا ہے۔ اس طرح بھائی جان اچھا خاصا کما لیتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "جونا مارکیٹ سے سامان لانے کے لئے گاڑی کی ضرورت ہوگی۔ پھر پورے علاقے میں گھر گھر سامان پہنچانے کے لئے بھی گاڑی کی ضرورت پڑے گی۔"

"بھائی جان نے جب کاروبار شروع کیا تو ان کے پاس ایک سائیکل تھی۔ وہ سائیکل پر آگے پیچھے سامان لاد کر لاتے تھے۔ تقدیر بنانے کے لئے اور کچھ بننے کے لئے پہلے پہل بہت محنت کرنا پڑتی ہے۔"

"یہاں سے جونا مارکیٹ پندرہ کلو میٹر دور ہے۔ میں روز سائیکل چلا کر جاؤں گا اور سامان لاد کر لاؤں گا۔ روز تیس کلو میٹر تک دوڑتا رہوں گا۔ تم کہتی ہو' ایک ہفتے کا ادھار رکھ کر سامان سپلائی کرنے سے کتنے ہی گھروں سے آرڈر ملنے لگتے ہیں۔ تمہیں پتا ہے' میرے دو پڑوسی اور محلے کے چھ گھر والوں نے مجھ سے دو سو' چار سو' چھ سو اور ہزار روپے تک ادھار لئے ہیں۔ تین ماہ گزر چکے ہیں' کسی نے ایک روپیا بھی واپس نہیں کیا۔ سب اپنی مجبوریوں کا دکھڑا روتے رہتے ہیں۔ ایسے علاقے میں ضرورت کا سامان سپلائی کروں گا تو وہ رقم کی ادائیگی کے لئے مہینوں' برسوں دوڑاتے رہیں گے۔ کاروبار چھوڑ کر اپنی رقم کے لئے دن رات ان کے دروازے پر بیٹھنا ہوگا۔ ان سے جھگڑا کرنا ہوگا۔ ایسا کاروبار محلے والوں سے دعا سلام نہیں رہنے دے گا۔ سب کو میرا دشمن بنا دے گا۔"

وہ بولی۔ "تم منفی انداز میں سوچو گے تو کبھی کچھ نہیں کر سکو گے۔ کیا تم ایسی جگہ رہنا پسند کرو گے جہاں تعفن ہو اور سانس لینا دشوار ہو؟"

"میں ایسی جگہ کیوں رہوں گا؟ کسی اچھی جگہ چلا جاؤں گا۔"

"تو پھر وہ علاقہ چھوڑ دو۔ کسی ایسے علاقے میں جہاں تعلیم یافتہ لوگ رہتے ہیں' دو کمروں کا مکان کرائے پر لو۔ وہاں اچھے لوگوں سے صاحب سلامت رہے گی۔ ایسی جگہ یہ کاروبار کر سکو گے۔"

میں اس کی باتوں پر غور کرنے لگا۔ اس نے ایسے کاروبار کا مشورہ دیا تھا جس میں بڑی محنت تھی اور میں محنت کے کاموں سے کتراتا تھا۔ کبھی پیاس لگتی تو اٹھ کر پانی نہیں پیتا تھا۔ پیاس برداشت کرتے وقت سوچتا تھا۔ کسی اور ضرورت سے اٹھوں گا تو پانی پی لوں گا۔ میں نے اسے ٹالنے کے لئے کہا۔ "ایک تو کاروبار کے لئے دس بارہ ہزار پھنسانے ہوں گے۔ کسی اچھے علاقے میں مالک مکان دس ہزار سے کم ایڈوانس نہیں لے گا۔ میں سائیکل نہیں چلاؤں گا۔ ایک سیکنڈ ہینڈ موٹر سائیکل لوں گا۔ بیس پچیس ہزار تک مل جائے گی۔ اب سوچو کہ کاروبار کرنے سے پہلے ہی کتنی رقم خرچ کرنا ہوگی۔ میرے حساب سے چالیس پچاس ہزار روپے خرچ ہوں گے۔"

"موٹر سائیکل نہیں لو گے تو آدھی رقم خرچ ہوگی۔ مگر تم آرام طلب ہو۔ کاروبار کرنے والے ہر طرح سے ایک ایک پیسا بچاتے ہیں۔ کوئی ضروری نہیں ہے کہ تم کسی اچھے علاقے میں رہنے کے لئے دس بارہ ہزار خرچ کرو۔ اپنے ہی علاقے میں رہو مگر دوسرے علاقوں میں جا کر کاروبار کرو۔ یہ تو چلتا پھرتا کاروبار ہوگا۔ کہیں بھی کر سکو گے۔ محنت کرنا چاہو گے تو موٹر سائیکل نہیں خریدو گے' رقم بچاؤ گے۔ آگے تمہاری مرضی ہے' میں تم سے بحث نہیں کروں گی۔"

پھر اس نے اس سلسلے میں بحث نہیں کی۔ دوسری باتیں کرتی رہی لیکن اس کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ مجھ سے مایوس ہو رہی ہے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ مایوس ہو کر مجھ سے ملنا چھوڑ دے۔ اس رات میں بڑی دیر تک اس کے بارے میں سوچتا رہا جب کہ کاروبار کے بارے میں سوچنا چاہئے تھا۔ پتا نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا۔ زندگی میں پہلی بار ایک ہستی اتنی اچھی لگ رہی تھی کہ میں کچھ سوچے سمجھے بغیر اسے اپنا لینا چاہتا تھا۔

عجیب بات تھی۔ دو دنوں سے کہیں شکار کے لئے نہیں نکلا تھا۔ دولت مند خواتین

کو نظر انداز کر رہا تھا۔ میں اپنی خوبروئی سے انہیں سحر زدہ کیا کرتا تھا۔ اب خود سحر زدہ ہو رہا تھا۔ صرف محبت سے تو پیٹ نہیں بھرتا' کچھ دھندے کی بھی فکر کرنی تھی۔ اسماء سے شام کو ملاقات ہوا کرتی تھی۔ میں صبح ایک شاپنگ سینٹر میں گیا۔ سوچا رات کو بھی ادھر آؤں گا۔ اس وقت اچھی خاصی تعداد میں خواتین آتی ہیں۔

دن کے گیارہ بجے کے بعد دکانیں کھلا کرتی ہیں۔ میں دوپہر تین بجے تک کئی شاپنگ سینٹرز میں جاتا رہا۔ وہاں ایک پرانے شناسا سے ملاقات ہوئی۔ وہ ایک کھٹارا سوزوکی پک اپ میں آیا تھا۔ گاڑی کے پیچھے کپڑوں کے تھان رکھے ہوئے تھے۔ ایک دکان والے وہ تھان اٹھا کر لے جا رہے تھے۔ وہ انجن پر جھکا کسی خرابی کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اس کی پشت پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "کیا ہو رہا ہے رفیق؟"

وہ جھکا ہوا تھا۔ سیدھا ہو کر مجھے دیکھتے ہی بولا۔ "ارے عادل' تم ہو۔ یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"یہ بتاؤ' تم کیا کر رہے ہو؟"

"یار' یہ گاڑی چلتے چلتے جھٹکے کھا رہی تھی۔ اس میں کوئی نہ کوئی خرابی پیدا ہوتی رہتی ہے۔ ہم جیسے سیکنڈ ہینڈ گاڑی چلانے والوں کو پہلے موٹر مکینک بننا چاہئے۔"

میں نے اسے ہٹا کر انجن پر جھکتے ہوئے کہا۔ "مہارت حاصل کرنا ضروری نہیں ہے۔ گاڑی کے اہم پارٹس اور ان کے فنکشنز کو سمجھنا اور ان کی خرابیوں کو درست کرنا سیکھ لینا چاہئے۔"

میں جو کہہ رہا تھا' اس حد تک گاڑیوں کا کام جانتا ہوں۔ کسی گیراج میں رہ کر اور مہارت حاصل کر سکتا تھا۔ ایک کامیاب موٹر مکینک بن کر ہزاروں روپے کما سکتا تھا مگر اس کام میں ہاتھ پاؤں کالے ہوتے ہیں۔ محاورتاً نہ سہی' منہ بھی کالا ہوتا ہے۔ میں نے کہا۔ "لو' یہ ٹھیک ہوگئی۔ اب جھٹکے نہیں کھائے گی۔"

رفیق نے کہا۔ "میں ایک جگہ سے دوسری جگہ مال پہنچاتا ہوں۔ کام اچھا چل رہا ہے۔ مگر یہ گاڑی پریشان کرتی رہتی ہے۔ میں نے اسے بتیس ہزار میں خریدا تھا۔ کوئی گاہک ملے گا تو پچیس میں دے دوں گا۔ پھر اور رقم ملا کر نئی گاڑی خریدوں گا۔"

میں بیس ہزار تک ایک موٹر سائیکل خریدنے کی بات سوچ رہا تھا۔ اگر بیس میں سوزوکی مل جاتی تو کیا بات تھی۔ چار پہیوں والی گاڑی کی شان ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ وہ

رفیق کے لئے پرابلم بنی ہوئی تھی۔ ایک بگڑی ہوئی بیوی تھی۔ اسے ٹھونک پیٹ کر چلایا جا سکتا تھا۔ ہزار پانچ سو خرچ کر کے اسے کلر کراتا تو وہ بالکل نئی لگنے لگتی۔ میں نے تھوڑی سی دیر میں بہت کچھ سوچ لیا۔ اسماء کے مشورے کے مطابق کاروبار کر کے اسے خوش کر سکتا تھا۔ زیادہ محنت نہ کرنی پڑتی۔ آرام سے گاڑی چلا کر جاتا اور پیچھے مال بھر کر لے آتا۔ جس علاقے میں مال سپلائی کرنے جاتا' وہاں لوگ مجھے اور میری گاڑی کو دیکھتے' میرے اسٹیٹس کو سمجھتے' مجھے سائیکل اور اسکوٹر والا نہ سمجھتے۔

آدمی کوئی کام کرے تو اچھے ڈھنگ سے' پہلے اپنی پرسنالٹی کا خیال رکھے' پھر کوئی کام کرے پھر دوسرے بھی اس کی پرسنالٹی کے مطابق صحیح لین دین کرتے ہیں۔ میں نے رفیق سے کہا۔ "میرے پاس صرف پندرہ ہزار ہیں۔ ورنہ میں ابھی اسے خرید لیتا۔"

اس کے چہرے پر ایک چمک آئی۔ جیسے راضی ہونے والا ہو۔ پھر اس نے کہا۔ "یار' میں نے بتیس ہزار میں لی تھی۔ کہاں بتیس اور کہاں پندرہ۔ کچھ حوصلہ کرو۔ یوں مجبور ہو کر بیچنے والا اور کوئی نہیں ملے گا۔"

"میں کیا حوصلہ کروں؟ جتنی چادر ہے' اتنے ہی پاؤں پھیلا سکتا ہوں۔ زیادہ پھیلاؤں گا تو نیچے سے چادر نکل جائے گی۔"

"تم دوست ہو' میں تم سے سودے بازی نہیں کروں گا۔ اور پانچ ہزار کا بندوبست کرلو۔ اسے بیس ہزار میں لے جاؤ۔"

"کہیں سے رقم ملنے کی امید ہوتی تو ابھی تم سے ڈن کر لیتا۔ کہیں سے قرض بھی لینا چاہوں گا تو ہزار دو ہزار سے زیادہ نہیں ملیں گے۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ اس گاڑی میں کتنی خرابیاں ہیں۔ یوں سمجھو ڈھانچا ہے۔ اندر سے کچھ نہیں ہے۔ سترہ لے کر اسے میرے حوالے کر دو۔ ورنہ آگے تمہاری مرضی۔"

وہ مجھے اپنے ساتھ ریسٹورنٹ میں لے گیا۔ مجھے لنچ کرایا۔ چائے پلائی اور مجھے بیس ہزار دینے کے لئے راضی کرتا رہا مگر میں سمجھ گیا تھا کہ وہ اس گاڑی سے بیزار ہو گیا ہے۔ اسے بیچ کر دوسری لینا چاہتا ہے۔ میں نے کہا۔ "میرے پاس پچیس ہزار ہوتے تو میں پچیس دے کر تمہاری گاڑی خرید لیتا۔ مگر تم سمجھ رہے ہو' میں تمہاری گاڑی اونے پونے خریدنا چاہتا ہوں۔ میں خریدار بعد میں ہوں' پہلے تمہارا دوست ہوں۔"

وہ راضی ہو گیا۔ اس نے ایک کاغذ لکھ کر دیا کہ وہ سوزوکی مجھے فروخت کر رہا ہے۔

اس گاڑی کو میرے نام ٹرانسفر کیا جائے۔ ٹرانسفر کئے جانے کی رسید ملتے ہی میں پوری رقم کی ادائیگی کر کے اس سے وہ گاڑی لے لوں گا۔ یہ معاملات طے کرنے کے بعد میں اس سے رخصت ہو گیا۔

گارڈن میں اسماء میرا انتظار کر رہی تھی۔ میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ "ہیلو' کیسی ہو؟ ویسے پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اب تک تمہارا منہ پھولا ہوا ہے۔ تم بہت جلد مایوس ہو جاتی ہو۔"

"میری تمام خوشیاں تمہارے پاس رہتی ہیں۔ تم ایک بھی خوشی نہیں دو گے تو مایوسی تو ہو گی۔"

"اچھا تو خوش ہو جاؤ۔ جیسا کہتی ہو' ویسا ہی کرنے والا ہوں۔ پرسوں تمہیں ایک بہت بڑا سرپرائز دوں گا۔ تمہیں ایک گاڑی میں بٹھا کر پورے کراچی کی سیر کراؤں گا۔"

"اس میں سرپرائز کی کیا بات ہے؟"

"بات ہے۔ ابھی تمہیں نہیں بتاؤں گا۔ ابھی تو صرف کاروبار کی باتیں کرو۔ جب تمہیں یقین آجائے کہ میں تمہیں خوش دیکھنے کے لئے بہت کچھ کر سکتا ہوں تو پھر مجھے بھی خوش کرو۔ میرے گھر چلو' ایک بار مجھے گلے لگانے دو' سچ کہتا ہوں۔ جب بھی تمہارے بارے میں سوچتا ہوں تو میرا بدن جلنے لگتا ہے۔"

"ایسی باتیں نہ کرو۔ میں جب بھی تمہارے گھر آؤں گی۔ ہمیشہ کے لئے تمہاری بن کر آؤں گی۔ تم کاروبار کی بات کر رہے تھے۔"

"ہاں' مجھے اس سلسلے میں بہت سی معلومات حاصل کرنی ہوں گی۔ کیا میں کچھ سیکھنے اور رہنمائی حاصل کرنے کے لئے تمہارے بھائی جان سے مل سکتا ہوں؟"

وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔ "وہ پوچھیں گے' تم کون ہو؟ مجھے کس حوالے سے جانتے ہو؟ بھابی کو کوئی سی بھی بات بڑھا چڑھا کر بولنے کی عادت ہے' وہ تو بدنام کرنے لگیں گی۔"

میں نے کہا۔ "پھر تو مجھے تنہا ہی کچھ کرنا ہو گا۔"

"تم تنہا نہیں ہو۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ میں جتنا جانتی ہوں' اتنی باتیں تمہیں سمجھا سکتی ہوں۔ بھائی جان نے پہلے ایک چھوٹا سا پمفلٹ شائع کرایا تھا۔ اسے علاقے کے تمام گھروں میں پہنچایا تھا۔ اس میں لکھا تھا۔ "گھر بیٹھے آپ کی ضرورت کا تمام سامان آپ

کے دروازے پر پہنچ جایا کرے گا۔ عام دکانوں کے مقابلے میں چیزوں کی قیمتیں کم ہوا کریں گی۔ ایک ہفتے کے اندر ادائیگی کرنے والوں کو ان کی ضرورت کا سامان سپلائی کیا جائے گا۔" بھائی جان نے پمفلٹ تقسیم کرنے کے بعد گھر گھر جا کر ان کے آرڈرز نوٹ کئے تھے۔ پھر انہیں مال پہنچانا شروع کیا تھا۔ تمہیں بھی یہی کرنا چاہئے۔ تین چار سو میں ایک ہزار پمفلٹ شائع ہو جائیں گے۔"

"یہ اچھا طریقہ ہے۔ یہی کروں گا۔ اس طرح مال سپلائی کرنے سے پہلے میرے گاہک بن جایا کریں گے۔"

"تمہیں گاہکوں کی ضرورت کی ہر چیز کی قیمت معلوم ہونی چاہئے کہ وہ تھوک بازار میں کس قیمت پر ملتی ہے اور عام دکانوں میں اس چیز سے کتنا منافع حاصل کیا جاتا ہے۔ تم منافع کی شرح کم رکھو گے تو تمہارا لایا ہوا سامان ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو گا۔"

ان باتوں میں خاصا وقت گزر گیا۔ وہ اندھیرا ہونے سے پہلے گھر چلی جاتی تھی۔ عجیب محبت کرنے والی ملی تھی۔ قریب آتی تھی۔ آنچ دیتی تھی پھر دور ہو جاتی تھی۔ خود کو میرے حوالے کرنے سے پہلے دال روٹی پکی کر رہی تھی۔ اس نے پمفلٹ کا مضمون لکھ کر دیا تھا۔ وہ چھپ رہا تھا۔ میں علاقوں کا انتخاب کر رہا تھا کہ مجھے کہاں مال سپلائی کرنا چاہئے۔ میں اگر دس گھروں میں بھی ایک ہفتے کا ادھار مال سپلائی کرتا تو میرے ہزاروں روپے پھنس جاتے۔ علاقہ اچھا ہو' لوگ اچھے ہوں تو رقم ڈوبنے کا اندیشہ نہیں رہتا۔

اسماء دکانوں میں فروخت ہونے والی کتنی ہی چیزوں کی قیمتیں جانتی تھی۔ وہ اور کئی چیزوں کی قیمتیں معلوم کرتی رہی اور مجھے لکھ کر دیتی رہی۔ دو دن بعد میں اس سے ملنے کے لئے سوزوکی میں آیا تو اس نے حیران ہو کر پوچھا۔ "اسے تم چلا رہے ہو؟ یہ کس کی ہے؟"

میں نے کہا۔ "میری ہے۔ تمہاری ہے۔ ہم دونوں کی ہے۔ میں نے اسے سترہ ہزار میں خریدا ہے۔ اسے کلر کراؤں گا تو بالکل نئی ہو جائے گی۔"

اس نے خوشی کا اظہار نہیں کیا' گہری سنجیدگی سے بولی۔ "تم نے کاروبار شروع نہیں کیا اور سترہ ہزار پھنسا دیئے۔ خدانخواستہ تم یہ کاروبار نہ کر سکے تو یہ گاڑی کس کام آئے گی؟"

"مجھے نادان بچہ نہ سمجھو۔ ایک تو تمہیں سرپرائز دینے کے لئے گاڑی لے کر آیا

ہوں اور تم ہو کہ تنقید کر رہی ہو۔ ایک کاروبار نہ چلا تو دوسرے کاروبار میں یہ گاڑی کام آئے گی۔ میں بڑے بڑے دکانداروں کا سامان ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچایا کروں گا۔ اسکول کے بچوں کو بھی لے جا سکتا ہوں۔"

"میں مانتی ہوں' یہ بہت کام آئے گی لیکن جو رقم کاروبار میں لگانی تھی' وہ تم نے گاڑی میں لگائی ہے۔ کاروبار کرنے والے کو بجٹ بڑھانا نہیں چاہئے' کم سے کم رکھنا چاہئے۔"

وہ ناراض ہو رہی تھی اور مجھے غصہ آ رہا تھا۔ میں نے اسے خوش کرنے کے لئے گاڑی خریدی تھی۔ عورت اپنی گاڑی میں بیٹھ کر بہت خوش ہوتی ہے۔ یہ سوچ کر آیا تھا کہ وہ خوش ہو کر گلے کا ہار بن جائے گی لیکن وہ تو کچھ اور ہی قسم کی لڑکی تھی۔ میں نے کہا۔ "تم میرے جذبات کو نہیں سمجھو گی۔ تمہیں اس بات کا ذرا بھی احساس نہیں ہے کہ میں نے تمہارے لئے سترہ ہزار روپے خرچ کئے ہیں۔"

"عادل' ایسی باتوں سے لڑکیاں بہت خوش ہوتی ہیں۔ میں ان میں سے نہیں ہوں۔ تم آرام طلب ہو۔ تم نے آرام سے آنے جانے' آرام سے بیٹھے بیٹھے مال سپلائی کرنے کے لئے یہ گاڑی خریدی ہے۔ اگر میرے لئے خریدی ہے تو ابھی اسے بیچ دو اور جو رقم واپس ملے۔ اس سے کاروبار شروع کرو۔"

اس نے میری دکھتی رگ پکڑی تھی۔ میں واقعی سائیکل اور اسکوٹر کے ذریعے مال لانا' لے جانا اور دور دور تک جا کر مال سپلائی کرنا' اتنی کڑی محنت کرنا نہیں چاہتا تھا۔ جھنجلا کر بولا۔ "ہاں' میں آرام طلب ہوں۔ خود غرض ہوں۔ میں اپنے لئے کرتا ہوں اور تم پر احسان جتاتا ہوں۔ آئندہ بھی تمہارے لئے کوئی چیز خریدوں گا تو یہی کہو گی کہ اس کے پیچھے میری خود غرضی چھپی ہوئی ہے۔"

"میں تمہیں اچھی بات سمجھا رہی ہوں اور تم ناراض ہو رہے ہو۔ تمہیں اپنا سمجھ کر نقصان سے بچانے کے لئے کاروباری مشورے دے رہی ہوں۔ آئندہ میں تمہارے کسی معاملے میں کچھ نہیں بولوں گی۔"

"میں مرد ہوں۔ کاروبار کرنا جانتا ہوں۔ آرام طلب ہوں تو کیا ہوا۔ تمہیں یہ کاروبار کر کے دکھاؤں گا۔ یہ گاڑی تمہیں پسند نہیں ہے مگر اس میں بیٹھ سکتی ہو تو بیٹھ جاؤ۔ تمہیں گھر چھوڑتا ہوا چلا جاؤں گا۔"

وہ چپ چاپ میرے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ میں نے گاڑی اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔ ہم تمام راستے خاموش رہے۔ وہ ناراض رہی۔ میں غصے میں رہا۔ پھر بھی دل چاہتا رہا کہ وہ کچھ بولے۔ اس کی آواز کانوں کو بھلی لگتی تھی۔ محبوبہ روٹھ کر بھی بولے اور ادائیں دکھائے تو اچھی لگتی ہے۔ دل میں اترتی رہتی ہے۔

میں نے اس کے گھر سے کچھ فاصلے پر گاڑی روک دی۔ وہ دروازہ کھول کر اتر گئی' پھر بولی۔ "کل اتوار ہے۔ پرسوں وہاں آؤں گی۔"

وہ ایک زوردار آواز سے دروازہ بند کرتی ہوئی چلی گئی۔ میں اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا مگر اس نے ایک بار بھی پلٹ کر نہیں دیکھا۔ جیسے میں اس کا کوئی نہیں ہوں۔ اگر کوئی نہیں ہوں تو میرے ساتھ بیٹھ کر کیوں آئی تھی۔ اگر پلٹ کر مجھے دیکھنا بھی نہیں چاہتی ہے تو پرسوں اسی گارڈن میں کیوں ملے گی؟ یہی تو ادائیں ہوتی ہیں جو اداؤں والی کی طرف کھینچتی رہتی ہیں۔

وہ ایک اسکول میں ٹیچر تھی۔ اتوار کو چھٹی ہوا کرتی تھی۔ اس لئے گھر سے نہیں نکل سکتی تھی۔ اس روز مجھ سے ملاقات نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے بعد دوسرے دن مجھ سے ملنے والی تھی۔ ایسے انتظار کے دوران میں چاہت اور بڑھتی رہتی ہے۔ ایک سحر سا طاری رہتا ہے کہ کوئی ہم سے ناراض ہونے کے باوجود ہماری ہے۔ ہمارے لئے سوچتی ہے۔ ہمارے لئے کروٹیں بدلتی ہے۔ سوتی نہیں ہے' سو جائے تو نیند میں بھی ہمیں دیکھتی ہے۔

☆======☆======☆

سب سے بڑی مسرت ایسے ہی وقت حاصل ہوتی ہے جب ہم کسی کو جیت لیتے ہیں۔ میں نے ایک فاتح کی مسرتوں سے سرشار ہو کر کاروبار شروع کیا۔ ایسے دو علاقوں میں پمفلٹ تقسیم کئے' جہاں ملازمت کرنے والے' مقررہ تنخواہ پانے والے رہائش پذیر تھے۔ ان کے اپنے مکانات تھے۔ ماہانہ کرایہ ادا کرنے کا مسئلہ نہیں تھا۔ ماہانہ تنخواہ میں کسی نہ کسی طرح گزارا کرتے تھے۔ مہنگائی سے لڑنے کے لئے پارٹ ٹائم ملازمتیں کرتے تھے۔

فی زمانہ لوگ کس طرح کما رہے ہیں؟ کمائی سے پورا نہ پڑتا ہو تو کیسے اچھا کھا رہے ہیں؟ اچھا پہن رہے ہیں؟ ایسے سوالات حیران کرتے ہیں کہ بے روزگاری بھی کچھ نہیں بگاڑتی۔ مہنگائی بھی اثر انداز نہیں ہوتی اور لوگ مزے سے جی رہے ہیں۔ سینما گھروں

میں پچاس روپے کا ٹکٹ ہے' بلیک میں سو روپے کا ٹکٹ خرید کر جاتے ہیں۔ ماہِ رمضان میں عید کی شاپنگ کے مناظر دیکھ کر پتا چلتا ہے کہ پاکستانی قوم کتنی دولت مند ہے۔

میں نے ان دو علاقوں میں کئی گاہک بنا لئے تھے۔ اس شرط پر انہیں مال سپلائی کرنا چاہتا تھا کہ وہ ایک ہفتے کے اندر رقم کی ادائیگی کریں گے لیکن وہ پندرہ دنوں میں ادائیگی کرنا چاہتے تھے۔ ابتداء میں انہیں گاہک بنانے کے لئے میں نے ان کی بات مان لی۔

پہلے پندرہ دنوں میں اچھی خاصی وصولی ہوئی۔ صرف تین گھروں سے آدھی آدھی رقم ملی۔ وہ اپنے حالات سے کچھ مجبور ہوگئے تھے۔ میں نے غلطی یہ کی کہ پوری وصولی کے بغیر ان کی ضرورت کا اور سامان انہیں ادھار دیا۔ ان پر رقم اور چڑھ گئی۔ ادھر میری رقم پھنس گئی' ادھر اس علاقے کے دکاندار میرے خلاف ہوگئے۔ انہوں نے کہا۔ "یہ رعایتی سیل والا دھندا کسی دوسرے علاقے میں کرو۔ ہم سیدھی طرح سمجھا رہے ہیں۔ تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ ادھر دکھائی نہ دو۔"

اسماء سے روز ملاقات ہوا کرتی تھی۔ اس نے کہا۔ "دنیا کا کوئی کام کرو۔ مشکلات پیش آتی ہیں۔ وہ دھمکیاں دے رہے ہیں۔ مگر تمہارا کچھ بگاڑ نہیں سکیں گے۔ تم ایک جائز کاروبار کر رہے ہو۔"

وہ درست کہہ رہی تھی۔ دکانداری کرنے والے غنڈے بدمعاش نہیں ہوتے۔ وہ مجھ سے مار پیٹ نہیں کرسکتے تھے اور نہ تخریب کاروں کی طرح میری گاڑی جلا سکتے تھے۔ لیکن ایک دن ٹریفک پولیس والے نے ایک کراسنگ پر مجھے روک لیا۔ میری گاڑی کے کاغذات دیکھے پھر گاڑی کے پچھلے حصے کی طرف دیکھ کر کہا۔ "تم اکثر یہ مال ادھر لاتے ہو۔ سنا ہے گھر گھر سامان بیچتے ہو۔ یہاں کے دکاندار حکومت کو ٹیکس دیتے ہیں۔ کیا تم ٹیکس ادا کرتے ہو؟ اگر اس چلتی پھرتی دکان کا ٹیکس ادا نہیں کرو گے تو ہم اس گاڑی کو لے جاکر تھانے میں جمع کردیں گے۔ جاؤ' یہ گاڑی واپس لے جاؤ۔"

میں پریشان ہوگیا۔ ان ٹریفک پولیس والوں کے ٹیکس کا مطلب خوب سمجھتا تھا۔ میں نے کہا۔ "میں کہاں حکومت کو ٹیکس دیتا پھروں گا۔ ایک غریب آدمی ہوں۔ یہ نیا کام شروع کیا ہے۔ میری رقم پھنسی ہوئی ہے۔ میں کچھ زیادہ نہیں دے سکوں گا۔"

"یہاں روز آؤ گے تو روز کے سو روپے دینے ہوں گے۔ نہیں آؤ گے تو ہم تم سے مانگنے نہیں آئیں گے۔"

"سو روپے بہت ہوتے ہیں۔ میں یہاں نہیں آسکوں گا۔ آپ کو روز پچیس روپے سے زیادہ نہیں دے سکوں گا۔ آپ نہیں مانیں گے' مجھے یہاں آنے کی اجازت نہیں دیں گے تو میں کوئی دوسرا علاقہ دیکھ لوں گا۔"

وہ ہر روز ملنے والے پچیس روپے چھوڑ نہیں سکتا تھا۔ اس لئے راضی ہوگیا۔ روز پچیس روپے کا یہ جرمانہ مقرر ہوگیا۔ یہ دکانداروں کی سازش تھی۔ انہوں نے دوسرے علاقے میں بھی پولیس کے ذریعے مجھے روکنا چاہا۔ میں نے وہاں بھی پولیس سے یہی معاملہ طے کرلیا۔ اسماء نے کہا۔ "بھائی جان بھی پولیس والوں کو دیتے ہیں مگر اتنا نہیں دیتے۔ وہ ایک موٹر سائیکل پر سامان لاد کر لاتے لے جاتے ہیں۔ انہیں غریب اور مجبور سمجھا جاتا ہے۔ تمہاری تو گاڑی دیکھ کر ہی پتا چلتا ہے کہ بڑی رقم لگا رہے ہو' بڑا منافع کما رہے ہو۔"

میں نے کہا۔ "تم میری گاڑی کے پیچھے کیوں پڑ گئی ہو؟ یہ تو ایک معمولی سی سیکنڈ ہینڈ سوزوکی پک اپ ہے۔ تم کبھی نہیں سمجھو گی کہ میں کتنی سہولت سے سامان خرید کر لاتا ہوں اور جگہ جگہ سپلائی کرتا ہوں۔"

"دوسرے تمہاری سہولتوں کو نہیں دیکھیں گے۔ تم نے اسے کلر کرایا ہے۔ ایک نئی گاڑی کی طرح چمکا دیا ہے۔ رشوت لینے والے ہر چمکتی ہوئی چیز کو سونا سمجھ کر سونے کے بھاؤ کے مطابق رشوت لیتے ہیں۔"

میں بہت پریشان ہوگیا تھا۔ دو علاقوں میں روز پچیس روپے رشوت کے طور پر دیا کرتا تھا۔ ماہانہ پندرہ سو روپے یوں ہی پانی میں بہہ جاتے تھے۔ اس کاروبار میں معقول منافع تھا لیکن منافع کی کچھ رقم پولیس والے کھا رہے تھے اور کچھ ادھار لینے والے ڈبو رہے تھے۔ اسماء نے بڑی محبت سے میرا ہاتھ تھام کر کہا۔ "مایوس ہو رہے ہو؟ میں تمہارے ساتھ ہوں؟ تمہیں حوصلہ نہیں ہارنا چاہئے؟"

میں نے کہا۔ "ایسے حالات پیدا ہو جاتے ہیں کہ ہم نہ چاہنے کے باوجود حوصلہ ہار جاتے ہیں۔ کتنے ہی گھر ایسے ہیں جہاں رقم پھنسی ہوئی ہے۔ ایک گھر سے مجھے پانچ ہزار روپے وصول کرنے تھے لیکن وہاں ڈاکا پڑ گیا۔ ڈاکو گھر میں جھاڑو پھیر کر چلے گئے۔ اب وہاں سے شاید ہی یہ رقم وصول ہوسکے۔ جن سے میں نے آدھی رقم لی اور پورا مال سپلائی کیا۔ وہ میری رقم کے بوجھ تلے دب گئے ہیں۔"

وہ بولی۔ "ایسی مشکلات میں حوصلہ رکھا جائے تو آگے چل کر کامیابی حاصل ہوتی ہے۔ تم اپنے اخراجات کا بھی حساب کرو۔ گھر میں خود پکا کر کھاؤ گے' خود کپڑے دھو کر استری کرو گے تو تمہارے اخراجات کم ہوں گے۔ خاصی رقم بچا سکو گے۔"

میں نے جھنجلا کر کہا۔ "بکواس مت کرو۔ میں تمام دن بھاگ دوڑ میں لگا رہتا ہوں۔ کھانا کب پکاؤں گا؟ کپڑے دھونے اور استری کرنے کا وقت کب ملے گا؟"

"غصہ کیوں کرتے ہو۔ میں چند گھنٹوں کے لئے آیا کروں گی اور تمہارا سارا کام کر کے چلی جایا کروں گی۔"

میں نے خوش ہو کر کہا۔ "تم میرے گھر آؤ گی؟ میرا کام کرو گی؟"

"میں اسی طرح تمہارا ساتھ دے کر تمہاری پریشانی کم کر سکتی ہوں۔ تمہارے اخراجات کم کر سکتی ہوں۔ میں کل سے اسکول کے بعد ٹیوشن نہیں پڑھاؤں گی۔ تمہارے گھر آ کر کام کیا کروں گی۔ مگر پہلے سے سمجھا دیتی ہوں۔ نکاح سے پہلے مجھے ہاتھ نہ لگانا۔"

"تم ایک دم سے اپنی ہو جاتی ہو' پھر ایک دم غیروں کی طرح بولنے لگتی ہو۔ دل توڑنے والی باتیں نہ کیا کرو۔ میں تمہارا ہاتھ تو پکڑ سکتا ہوں؟"

"ہاتھ پکڑ سکتے ہو' اس کے آگے کچھ نہیں۔"

یہی بہت تھا کہ وہ روز میرے گھر آنے والی تھی۔ وہ میرے قریب رہتی' میں اسے دیکھتا رہتا۔ اس کی رس بھری آواز سنتا رہتا۔ اس کا ہاتھ پکڑنے کے بہانے اسے چھو سکتا۔ شاید دور تک چھو لیتا۔ ایک بھرپور رومانی ماحول میں سانس لیتا رہتا۔ میں خواب دیکھنے کا عادی ہوں۔ یہ بھول جاتا ہوں کہ تعبیر الٹی ہوتی ہے۔

وہ روز دو تین گھنٹوں کے لئے آنے لگی۔ اس نے کہا۔ "تالے کی دوسری چابی بناؤ تاکہ میں یہاں آ کر دروازہ کھول کر گھر کا کام کر سکوں۔ تم میری خاطر آدھا دن کام کرو گے آدھا دن یہاں رہو گے تو کاروبار نہیں کر سکو گے۔ میں یہاں تمہارے اخراجات میں کمی کرنے کے لئے آتی ہوں۔"

میں نے کہا۔ "میں دن کے دو بجے تک مال سپلائی کرتا ہوں۔ گاہک کم رہ گئے ہیں۔ کتنے ہی گاہک کہتے ہیں کہ دکانداروں نے انہیں ادھار دینا بند کر دیا ہے۔ وہاں سے انہیں دال' چاول' آٹا' گھی وغیرہ ملتا ہے۔ میں یہ چیزیں سپلائی نہیں کرتا ہوں اور کیسے کروں گا' جتنا مال پہنچاتا ہوں' اسی کی رقم پھنسی ہوئی ہے۔ راشن سپلائی کروں گا تو اس کے لئے مجھے

زیادہ رقم لگانی ہو گی اور اب میرے پاس صرف بیس ہزار رہ گئے ہیں۔"

اسماء نے حیرانی سے پوچھا۔ "تمہارے پاس ستر ہزار روپے تھے۔ کیا پچاس ہزار خرچ کر ڈالے؟"

"تم تو ایسے پوچھ رہی ہو جیسے میں نے اپنی رقم کہیں لٹائی ہے۔ سارا کاروبار میں لگایا ہے۔ میں بینک سے رقم نکالتا گیا' مال خریدتا گیا اور گاہکوں کو ادھار دیتا چلا گیا۔"

وہ بولی۔ "میں نے سمجھایا تھا کہ ایک ہفتے سے زیادہ کا ادھار نہ دینا۔ مگر تم نے پندرہ دن کا ادھار دیا پھر یہ غلطی کرتے رہے کہ جہاں سے وصولی نہ ہوئی' وہاں اور مال دیتے رہے۔ کیا اس طرح کاروبار ہوتا ہے؟"

میں نے بیزاری سے کہا۔ "مجھ سے بحث نہ کرو۔ جتنی رقم پھنسی ہوئی ہے۔ میں دھیرے دھیرے وصول کر لوں گا۔ یہ میرا مسئلہ ہے' میرا دماغ خراب نہ کرو۔"

میں نے سوچا تھا بلکہ خواب دیکھا تھا کہ وہ روزانہ چند گھنٹوں کے لئے میرے گھر آیا کرے گی تو میں بھرپور رومانی ماحول میں رہا کروں گا۔ مگر خواب کی تعبیر الٹی ہوئی۔ ایک روز ارشد میرے دروازے پر آ گیا۔ وہ میرے ایسے دوستوں میں سے تھا جن کے ساتھ میں پتے کھیلتا تھا اور چرس کی سگریٹ پیا کرتا تھا۔

پچھلے ہفتے پتے کھیلنے کے دوران میں میرے پاس رقم کم پڑ گئی تھی۔ میں نے آخری بازی شو کرانے کے لئے راشد سے سات سو روپے لئے تھے۔ وعدہ کیا تھا کہ دوسرے دن دے دوں گا لیکن اسے ٹالتا رہا تھا۔ مجھ سے قرض لینے والے گاہک میری رقم مجھے نہیں دے رہے تھے پھر مجھے رشوتیں دینی پڑ رہی تھیں۔ دوسرے مجھے ٹال رہے تھے' میں بھی ارشد کو ٹال رہا تھا۔ وہ دروازے پر آ کر غصہ دکھانے لگا۔ شور مچانے لگا۔ یہ دھمکی دے کر چلا گیا کہ میں نے کل تک اس کی رقم ادا نہ کی تو وہ میری گاڑی کی چابی چھین لے گا۔

اس کے جانے کے بعد اسماء پر جیسے سکتہ طاری ہو گیا تھا۔ وہ گم صم کھڑی رہی۔ میں نے کہا۔ "فکر نہ کرو۔ اس کا باپ بھی میری گاڑی کی چابی نہیں لے سکے گا۔"

وہ بولی۔ "تم نے کاروبار میں پورے پچاس ہزار نہیں لگائے ہیں۔ آدھی رقم تو گاڑی خریدنے اور جوا کھیلنے میں نکل گئی ہے۔ پھر تمہاری شاہ خرچی ہے۔ ہوٹلوں میں کھاتے رہے ہو۔ لانڈری کے کپڑے پہنتے رہے ہو اور گاڑی میں پیٹرول پھونکتے رہے ہو۔ تم نے بمشکل کاروبار میں بیس ہزار لگائے ہوں گے اور کاروبار بھی ایسے کر رہے ہو

جیسے وہ سب گاہک نہ ہوں' رشتے دار ہوں۔ ان کے گھروں میں سامان پہنچا رہے ہو۔ انہیں کھلا پلا رہے ہو۔ اپنی نادانی سے رقم پھنساتے آرہے ہو۔ تم زندگی میں کچھ نہیں کرسکو گے۔"

"تم تو بولتی ہی جارہی ہو۔ میری بھی تو سنو۔ میں ہمیشہ جوا نہیں کھیلتا ہوں۔"

"جھوٹ مت بولو۔ تم نے پچھلی بار بھی یہی کہا تھا۔ تمہیں جوئے کی لت پڑ گئی ہے۔ اور پتا نہیں کیسی کیسی بری عادتیں ہیں۔ میں تم سے کیا توقع کروں؟ شادی کے بعد اپنا اور کیا روپ دکھاؤ گے؟ پتے کھیلتے ہو تو نشہ بھی کرتے ہوگے۔ کمائی سے زیادہ تمہاری شاہ خرچی ہے اور کمائی بھی کیا ہے' جو رقم کاروبار میں لگائی ہے' اس کی واپسی نہیں ہو رہی ہے۔ جو بینک میں باقی بچا ہے' اس میں سے اور کتنی رقم کاروبار میں لگاؤ گے؟ کتنی رقم سے جوا کھیلو گے اور کتنی رقم کا پیٹرول پھونکو گے؟"

"میں اور دس ہزار لگاؤں گا۔ دس ہزار بچا کر رکھوں گا۔ آئندہ کسی اور کو ادھار نہیں دوں گا۔ ایک ایک کرکے گھر جا کر پٹھانوں کی طرح اپنی رقم وصول کروں گا۔ تمہیں کاروبار کرکے دکھاؤں گا۔"

"تم دکھاتے رہو۔ میں جارہی ہوں۔ اب تم سے ملنے نہیں آؤں گی۔ جب کامیابی سے کاروبار کرنے لگو تو پھر مجھے یاد کرنا۔ میں خود ہی ایک ماہ بعد تم سے کسی دن ملوں گی۔ اگر تم ناکام رہو گے تو افسوس کرکے چلی جاؤں گی۔ کامیاب رہو گے تو تمہارا گھر آباد کروں گی۔"

وہ غصے میں تنتناتی ہوئی جانے لگی۔ میں نے کہا۔ "رک جاؤ۔ میں تمہیں گاڑی میں پہنچاؤں گا۔"

وہ بس اسٹاپ کی طرف چلی گئی۔ پھر وہ مجھ سے ملنے نہیں آئی۔ میں دوسرے تیسرے دن گارڈن کی طرف گیا۔ پھر کبھی کبھی ادھر جانے لگا۔ امید تھی کہ شاید وہ کسی دن آئے گی لیکن وہ بری طرح مایوس ہوگئی تھی۔

میں بھی مایوس ہو رہا تھا۔ اپنی رقم مانگنے کے لئے دروازے دروازے جاتا تو وہ لوگ تنخواہ ملنے پر سو دو سو روپے دے دیتے تھے۔ اسی طرح قسطوں میں قرض ادا کرنے والے تھے۔ مزید مال خریدنے کے لئے میرے پاس رقم نہیں رہی تھی۔ حوصلہ بھی نہیں رہا تھا۔ میں گھر آکر بیٹھ گیا۔

تمام گھروں سے ہر ماہ جو رقم واپس مل رہی تھی' اس سے گزارا نہیں ہوسکتا تھا۔ میں نے حساب لگایا' دو برس تک دوڑتا رہوں گا تو ان گھروں سے میری پوری رقم وصول ہوسکے گی۔ ہر ماہ ہزار پانچ سو ملتے رہیں گے۔ میں بیٹھ کر کھاتا رہوں گا۔

اب وہ گاڑی بوجھ بن گئی تھی۔ اگرچہ میری کمائی کا ذریعہ بن سکتی تھی۔ میں ایک جگہ سے دوسری جگہ دکانداروں کا مال پہنچا سکتا تھا لیکن وہ سیکنڈ ہینڈ کھٹارا گاڑی زیادہ وزن برداشت نہیں کرسکتی تھی۔ وہ اندر سے بہت بیمار تھی۔ میں اس کی ایک خرابی دور کرتا تو دوسری خرابی پیدا ہوجاتی تھی۔

میں سیدھی سی بات کہوں گا کہ مجھ سے دن رات محنت نہیں ہوتی تھی۔ میں نے محبت کے جوش میں پانچ ماہ تک بڑی محنت کی تھی۔ اپنی ساری جمع پونجی ڈبو دی تھی۔ یہ بات سمجھ میں آرہی تھی کہ یہاں محنت مزدوری سے کبھی کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ لمبا ہاتھ مارنے کی تدبیر کرتے رہنا چاہئے۔ جیسا کہ پچھلی بار میں نے ستر ہزار روپے کمائے تھے۔ مقدر ساتھ دے گا تو کسی دن ستر لاکھ بھی کماؤں گا۔

ایک روز پڑوسن نے کہا۔ "بیٹا! اسماء آئی تھی۔ بڑی دیر تک مجھ سے باتیں کرتی رہی۔ تمہارے بارے میں بہت سے سوالات کرتی رہی۔ پھر وہ دوسرے گھروں میں بھی گئی تھی۔ اس کے بعد واپس نہیں آئی۔ وہ تو پولیس والوں کی طرح تمہارے بارے میں چھان بین کررہی تھی۔"

میں دوسرے دن گاڑی لے کر اس کے گھر کے سامنے گیا۔ اس کا انتظار کرنے لگا۔ وہ اسکول جانے کے لئے گھر سے نکلی تو میں نے اس کے سامنے گاڑی لاکر روک دی۔ وہ مجھے دیکھ کر ٹھٹک گئی پھر بولی۔ "یہاں کیوں آئے ہو؟ کیا مجھے بدنام کرو گے؟"

"یہاں مجبور ہو کر آیا ہوں۔ آؤ بیٹھو' گارڈن چلو۔"

اس نے اِدھر اُدھر دور تک دیکھا۔ پھر میرے پاس آکر بیٹھ گئی۔ خوشبو کا ایک جھونکا میرے پاس آیا اور میری سانسوں میں سما گیا۔ وہ پرفیوم نہیں لگاتی تھی۔ محبت سے لبریز احساسات کی خوشبو تھی۔ جب تک وہ پاس رہتی تھی' میرے اندر چھپا چنبیلی کی طرح مہکتی رہتی تھی۔

اس نے اپنے محلے سے باہر آکر کہا۔ "یہاں کنارے گاڑی روک دو۔ جو بولنا ہے' بولو۔"

"یہاں نہیں گارڈن چلو۔"

"میں وہاں نہیں جاؤں گی۔ ضد کرو گے تو گاڑی سے اتر جاؤں گی۔"

میں نے گاڑی روک کر پوچھا۔ "کل تم میرے گھر آئی تھیں؟"

"پڑوسن کے گھر آئی تھی۔ دوسرے گھروں میں بھی گئی تھی۔ پتا چلا' اس علاقے میں جوئے کے دو اڈے چلتے ہیں۔ تم وہاں جاتے رہتے ہو۔ دن چڑھے تک سوتے رہتے ہو۔ پھر ہیرو کی طرح بن سنور کر گاڑی میں بیٹھ کر چلے جاتے ہو۔"

"تم پولیس والوں کی طرح انکوائری کرتی رہی ہو' اور کیا معلوم کیا ہے؟"

"اتنی ہی معلومات کافی ہیں۔ تمہارے پورے حالات سمجھ میں آگئے ہیں۔ تمہارا وہ کاروبار ختم ہو چکا ہے۔ اسی لئے دن چڑھے تک سوتے رہتے ہو۔ اگر کمائی کا کوئی دوسرا ذریعہ اختیار کرتے تو روز ہیرو کی طرح بن سنور کر نہ جاتے۔ کیا محنت مزدوری کرنے والے تمہارے جیسے ہوتے ہیں؟"

"میں نے تمہاری خاطر محنت کرنے کے لئے اپنی تمام جمع پونجی خاک میں ملا دی۔ اور تم مجھے طعنے دے رہی ہو؟"

"تم نے میرے کہنے سے کدال پکڑی۔ میں نے سمجھا میرے لئے پہاڑ کاٹ کر دودھ کی نہر نکال رہے ہو۔ مگر وہ کدال تم اپنے پیروں پر مارتے رہے۔ کاروباری بن کر نکلے اور حاتم طائی بن کر ادھار دیتے رہے۔ جو رقم پاس تھی' اسے پتے کھیلنے والوں میں لٹاتے رہے۔"

"اسی لئے تم مجھ سے نفرت کرنے لگی ہو۔ محبت اس لئے کر رہی تھیں کہ میرے پاس ستر ہزار روپے تھے۔ وہ نہیں رہے۔ محبت بھی نہیں رہی' یہ ہے آج کل کی لڑکیوں کی محبت۔"

"آج کی لڑکیاں حالات کی ماری ہوئی ہیں۔ وہ اپنے گھروں میں ماں باپ' بھائیوں اور بھابیوں کی ناکام ازدواجی زندگیوں کو آنکھوں سے دیکھتی ہیں۔ سوچتی ہیں' سمجھتی ہیں کہ ہمارے ساتھ ایسا نہیں ہونا چاہئے۔ ہماری زندگی میں جو شخص آئے وہ پہلے ہی معاشی طور پر مستحکم ہو۔ وہ ہمارے بہترین مستقبل کا معمار ہو۔ میں دل سے مجبور ہو کر تم سے محبت کرتی ہوں مگر اپنی بہتری کے لئے بھی سوچتی ہوں تو کوئی گناہ نہیں کرتی ہوں اور تم ہو کہ اسے میری غلطی سمجھتے ہو۔ میں خود غرض نہیں ہوں۔ تم سے نفرت نہیں کرتی ہوں۔ تم

پر افسوس کرتی ہوں۔ تم سے محبت کرتی ہوں اور آخری سانس تک تمہارے ہی انتظار میں کنواری بیٹھی رہوں گی۔ تم مستقبل کے معمار بن کر آؤ گے تو تمہاری دلہن بنوں گی۔ ورنہ تنہا زندگی گزارتی رہوں گی۔ کوئی دوسرا میری زندگی میں نہیں آئے گا۔"

وہ دروازہ کھول کر باہر چلی گئی۔ پھر اسے بند کرتے ہوئے بولی۔ "اگر تم مجھ سے محبت کرتے ہو تو مجھے بدنام نہیں کرو گے۔ نہ میرے گھر کی طرف آؤ گے نہ کہیں آکر میرا راستہ روکو گے۔ شادی کے بعد مفلسی اور محتاجی کی زندگی گزارنے سے بہتر ہے کہ ہم شادی ہی نہ کریں۔ ایسی محبت اور ایسی شادی کو بربادی کہتے ہیں۔ میں اپنی اور تمہاری بربادی نہیں چاہتی۔ جب ایک شاندار مستقبل بنانے کے قابل ہو جاؤ تو سیدھے میرے گھر چلے آنا۔ میں تمہارے گھر چلی آؤں گی۔"

وہ میرا جواب سنے بغیر منہ پھیر کر چلی گئی۔ میں اسے دیکھتا رہ گیا۔ سوچتا رہ گیا۔ اس نے یہ بات اچھی طرح میرے ذہن میں بٹھا دی کہ جب تک پہاڑ کاٹ کر اس کے لئے دودھ کی نہر نہیں نکالوں گا' وہ میری آغوش میں نہیں آئے گی اور وہ محبت کی ماری کسی دوسرے کے سائے میں بھی نہیں جائے گی۔ آخری سانسوں تک میرا انتظار کرنے گی۔

میں وہاں سے گاڑی ڈرائیو کرتا ہوا ڈیفنس کے علاقے میں آگیا۔ وہاں مختلف شاپنگ سینٹرز میں گھومنے لگا۔ شاندار مستقبل بنانے کا فی الحال ایک یہی راستہ تھا۔

اسماء اچھی اور دل میں اتر جانے والی باتیں کرتی تھی۔ جیسے تہذیب اور اخلاق کا درس دینے والے کرتے ہیں۔ یہ نصیحت کرنا آسان ہے کہ جھوٹوں اور بے ایمانوں اور مکاروں کی اس دنیا میں رہ کر ہم رزقِ حلال حاصل کر سکتے ہیں۔ مگر کیسے حاصل کر سکتے ہیں؟

کیا بے روزگار رہ کر؟ اگر روزگار ہے تو محدود آمدنی سے پورے کنبے کا پیٹ بھر جاتا ہے؟ کیا صبر و رضا سے تمام ضروریات پوری ہو جاتی ہیں؟ ضروریات پوری کرنے کے لئے دوسرے چھوٹے موٹے دھندے بھی کرنے پڑتے ہیں اور کوئی دھندا ایمانداری سے نہیں ہوتا۔ پورے شہر' پورے ملک میں خالص مال کم اور دو نمبر مال زیادہ ہے۔ پھر دو نمبر مال سے رزقِ حلال کیسے حاصل ہو گا؟

کہنے کو میں بھی یہی کہتا رہتا ہوں۔ اللہ حرام سے بچائے۔ میں تو بھوکا رہ جاتا ہوں۔ مگر حرام کی کمائی نہیں کھاتا۔ ایسا کہنے والے بے شمار کردار دن رات مجھے دکھائی دیتے

رہتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ہمارے پچاس فیصد سے زیادہ لوگ محنت کرتے ہیں۔ مایوس ہوتے ہیں اور سہانے سپنے دیکھتے ہیں کہ کہیں سے ان کی لاٹری نکل آئے گی۔ لاکھوں کروڑوں مل جائیں گے۔ کوئی ان کے پاس نوٹوں سے بھرا ہوا بریف کیس چھوڑ کر چلا جائے گا۔ کوئی دولت مند بیوہ عاشق ہو کر اپنا شوہر بنا لے گی۔ لڑکیوں کے خوابوں اور خیالوں میں صرف رئیس زادے آتے ہیں۔

یہ مشاہدہ میرے پاس ہے۔ میں جانتا ہوں کہ ہم سارے لوگ کن حالات میں جی رہے ہیں۔ مجھے بھی اس دور میں جینا ہے۔ میں جس دن لمبا ہاتھ ماروں گا' اس دن اسماء کی سمجھ میں بات آئے گی کہ میں گھسی پٹی لو اسٹوری کا فرہاد نہیں ہوں۔ میں دودھ کی نہر نہیں نکالتا۔ تیل کی پائپ لائن نکالتا ہوں۔ وہ دودھ کی دنیا گزر گئی۔ یہ تیل کی دنیا ہے۔ میں سب کا تیل نکال کر رکھ دوں گا۔ بس ایک لمبا ہاتھ مارنے کی دیر ہے۔

☆======☆======☆

میرا نام عادل محبوب ہے۔ میں ڈیفنس میں ایک بہت مہنگی عالی شان کوٹھی کا مالک ہوں۔ میں کسی پسماندہ علاقے میں رہنے والا عادل محبوب نہیں ہوں۔ ایک بار میرے اس ہم نام سے ملاقات ہوئی تھی۔ ہم دونوں ہم شکل تو نہیں ہیں مگر ہم نام اور ہم مزاج ہیں۔ وہ بھی جائز و ناجائز طریقوں سے دولت کمانا چاہتا ہے۔ میں بھی یہی چاہتا تھا مگر وہ ابھی تک کنگال ہے اور میں بہت کچھ حاصل کر چکا ہوں۔

ہم دونوں میں ایک اور بات مشترک ہے۔ اس کی محبوبہ کا نام اسماء ہے اور میں جس سے شادی کرنا چاہتا ہوں' اس کا نام بھی اسماء ہے۔ میری اسماء بہت تیز طرار' بہت ماڈرن اور اسمارٹ ہے۔ ایک امیر باپ کی بیٹی ہے اور اپنے باپ سے زیادہ امیر بننے کی پلاننگ کرتی رہتی ہے۔

میں نے پہلی بار اسے ایک گیٹ ٹوگیدر پارٹی میں دیکھا تھا۔ اسے بیوٹی کوئن تو نہیں کہا جا سکتا تھا مگر اس کے حسن میں بڑی نفاست تھی۔ کوئی داغ نہیں تھا۔ قدرت نے اسے بڑی نزاکت سے تراشا تھا۔ وہ ایسی تھی کہ اسے للچائی ہوئی نظروں سے دیکھنا ضروری ہو جاتا تھا۔ ایک مٹھائی کو سبھی مکھیاں دیکھتی ہیں۔ اس پارٹی میں سبھی اسے دیکھ رہے تھے اور دلچسپی لے رہے تھے لیکن وہ نظر شناس تھی۔ باتیں خوب بناتی تھی۔ سب سے ملتی تھی۔ پھر گیلے صابن کی طرح ہاتھ سے پھسل جاتی تھی۔

آئینہ مجھے خوبرو اور اسمارٹ کہتا ہے۔ میں اپنے منہ میاں مٹھو نہیں بننا چاہتا۔ عورتیں حسن نظر رکھتی ہیں۔ بوڑھی ہوں یا جوان' سب کی نظریں مجھ پر ٹھہر جاتی ہیں۔ اگر میں کار ڈیلر نہ ہوتا تو فلموں کا ہیرو ضرور بن جاتا۔ اس پارٹی میں اسماء سے دوچار بار نظریں ٹکرائیں۔ اس نے دور سے مسکراتے ہوئے ہاتھ اٹھا کر وش کیا۔ میں نے بھی جواباً یہی کیا لیکن دور دور سے بات نہیں بنتی۔ ایک موقع پر اسے تنہا پا کر قریب ہو گیا' پھر بولا۔

"ہائے بیوٹی! میرا نام عادل محبوب ہے۔ میں امپورٹر ہوں۔ کاریں امپورٹ کرتا ہوں۔"

"میرا نام اسماء ہے۔ جھوٹ مت بولو۔ کاریں امپورٹ نہیں کر رہے ہو۔ آج کل امپورٹ لائسنس نہیں دیا جا رہا ہے۔ ہمارے ملک میں کاریں بن رہی ہیں۔ مارکیٹ میں ان کی فروخت بڑھانے کے لئے باہر سے کاریں منگوانے کی اجازت نہیں دی جا رہی ہے۔"

"بڑی معلومات رکھتی ہو لیکن موجودہ پابندی سے پہلے یہاں کے بڑے امپورٹرز میں میرا شمار ہوتا رہا ہے۔ یہ انسانی فطرت ہے کہ اس کے آگے بڑھنے کا راستہ روکو تو وہ دوسرے چور راستے نکال لیتے ہیں۔ میرے پاس اب بھی اِکا دُکا نئے ماڈل کی کاریں سرحدی علاقے سے چلی آتی ہیں۔"

وہ خوش ہو کر بولی۔ "کیا واقعی! کیا مجھے کوئی ایسی نئے ماڈل کی کار دکھا سکتے ہو؟ پسند آئے گی تو خرید لوں گی۔ مجھے نئی گاڑیاں خریدنے کا کریز ہے۔ ایک سے دل بھر جاتا ہے تو دوسری خرید لیتی ہوں۔"

میں نے اپنا کارڈ اسے دیتے ہوئے کہا۔ "کل ہی میرے شوروم میں آجاؤ۔ اس بہانے تم سے دوسری ملاقات ہو جائے گی۔"

وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ "بڑے محبوبانہ انداز میں بول رہے ہو؟"

"کیا دوستی کرو گی؟"

"دوستی فائدہ پہنچانے کے لئے ہوتی ہے۔ تمہاری دوستی سے مجھے کیا فائدہ پہنچے گا؟"

"ایک ہی ملاقات میں نفع و نقصان کا حساب نہیں کیا جا سکتا۔ فی الحال یہی کہا جا سکتا ہے کہ دونوں ہاتھوں سے تالی بجے گی تو ہم میں سے کسی کو نقصان نہیں پہنچے گا۔"

وہ مسکراتی ہوئی چلی گئی۔ ماں باپ کی اکلوتی بیٹی تھی۔ بہت زیادہ دولت مند نہیں تھی۔ مگر اتنی دولت ضرور تھی کہ تمام زندگی عیش و آرام سے رہ سکتی تھی لیکن وہ صابر و شاکر نہیں تھی۔ بہت بلندی تک پرواز کرنا چاہتی تھی۔ پتا نہیں کتنے رئیس اس سے شادی کرنا چاہتے ہوں گے لیکن وہ شادی کا معاملہ ٹالتی رہتی تھی۔ سوچتی پھرتی تھی کہ اس کے مزاج میں ڈھلنے والا کون ہے۔ شاید وہ ایک کٹھ پتلی شوہر چاہتی تھی۔ اس وقت میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ میں نے پوچھا۔ "شادی ہو چکی ہے؟"

"یہ کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"اس لئے پوچھ رہا ہوں کہ شادی ہو چکی ہے تو تمہارے ہزبینڈ ہماری دوستی پر اعتراض کریں گے۔"

"نہ میری شادی ہوئی نہ میں کسی کی پابندی میں رہتی ہوں اور نہ ہی کسی کے اعتراضات کی پروا کرتی ہوں۔ اوکے 'گڈ نائٹ۔ کل ملاقات ہوگی۔"

وہ دوسرے دن میرے شوروم میں آئی۔ میں سراپا انتظار تھا۔ ملازموں سے کہہ رہا تھا جب وہ آئے تو پھر کوئی میرے آفس کیبن میں نہ آئے۔ میں نے شوروم کے اندر ایک کیبن بنایا تھا جہاں گاہکوں سے لین دین کی باتیں ہوا کرتی تھیں۔ وہ کیبن میں آکر بولی۔

"یہ رازداری کے لئے اچھی جگہ ہے۔"

میں نے کہا۔ "آج یہاں تمہیں دیکھ کر خیال آرہا ہے کہ اس کیبن میں میٹھی میٹھی رازداری ہو سکتی ہے۔"

"میں بزنس سیکریٹس کی بات کر رہی ہوں۔ یہاں راز داری سے سودے ہوتے ہوں گے۔"

"ہاں' بزنس میں کئی طرح کی رازداری ہوتی ہے لیکن ابھی تمہارے ساتھ کوئی بزنس شروع نہیں ہوا ہے۔ ہو سکتا ہے' راز و نیاز کی باتیں کرتے کرتے کوئی بات بن جائے۔"

"میں نے شوروم میں بلیک ہنڈا اکارڈ دیکھی ہے۔ بہت خوبصورت ہے' کیا قیمت ہوگی؟"

"تم اس میں بیٹھو گی تو بیش قیمت ہو جائے گی۔ کوئی اس کی قیمت ادا نہیں کر سکے گا۔"

وہ ہنستے ہوئے بولی۔ "میں نوٹ کر رہی ہوں' تم میری ہر بات کو رومانس کی طرف لے جاتے ہو۔"

"میں ایک بزنس مین ہوں۔ شاعری نہیں کرتا۔ کبھی کسی کی زلفوں کا اسیر نہیں ہوتا مگر تمہیں پہلے کئی بار دیکھا ہے۔ دور ہی دور سے دیکھا ہے اور تم سے دور ہی رہنے کی کوشش ہے مگر دل بے ایمان ہے۔ تم پر ایمان لے آیا ہے' میں کیا کروں؟"

"تم خود فیصلہ کرو کہ تمہیں کیا کرنا چاہئے۔ تم میرے بارے میں بہت کچھ سوچتے رہے ہو گے۔"

"میں چاہتا ہوں' تم بھی میرے بارے میں سوچنا شروع کر دو۔"

"پہلے میرے شوق کی بات کرو۔ اس ہنڈا اکارڈ کی قیمت کیا ہے؟"

"تم تو جانتی ہو۔ باہر سے آنے والی کاروں کی قیمت تقریباً دگنی ہو جاتی ہے۔ اس کی قیمت چوبیس لاکھ روپے ہے۔"

وہ حیرانی سے بولی۔ "چوبیس لاکھ روپے! یہ تو بہت زیادہ ہیں جب کہ یہ امپورٹ نہیں کی گئی ہے۔ شاید بارڈر کے راستے لائی گئی ہے۔"

"امپورٹ لائسنس کے بغیر بھی اکثر کاریں امپورٹ کی جاتی ہیں۔ بڑے سیاست دانوں کو گاڑیاں لانے کی خصوصی اجازت مل جاتی ہے۔ ایسی گاڑیاں ہمارے پاس پہنچ جاتی ہیں۔ شارجہ میں ایک کھلاڑی کو یہ ہنڈا اکارڈ انعام کے طور پر دی گئی تھی۔ میں نے اس سے بیس لاکھ روپے میں خریدی ہے۔ چار لاکھ کا منافع تو مجھے ملنا چاہئے۔"

"اچھا دھندا کر رہے ہو۔ کاریں امپورٹ کرنے پر پابندی ہے۔ اس کے باوجود امپورٹر بنے ہوئے ہو۔"

"میں نے تم سے کہا تھا' پابندیاں عائد کی جائیں' آگے بڑھنے کے راستے روکے جائیں تو آدمی چور راستوں سے آگے بڑھنے لگتا ہے۔ یہ کار تمہیں پسند ہے تو قیمت کم ہو جائے گی۔"

"نئے ماڈل کی مہنگی کاریں نمائش کے لئے ہوتی ہیں کہ دیکھو' ہم کتنے امیر کبیر ہیں۔ دولت مند خواتین ایک دوسرے پر رشک کرتی ہیں۔ جو ایسی کاروں میں بیٹھے وہ برتر اور جو نہ بیٹھ پائے وہ کمتر ہو جاتی ہے۔ میں صرف برتر ہونے کے لئے لاکھوں روپے ضائع نہیں کروں گی۔"

"پھر کیا کرو گی؟ کل تو تم کار خریدنے کی باتیں کر رہی تھی۔"

"کوئی ضروری نہیں ہے کہ میں اسے خریدوں؟ کیا تم ایک آدھ ماہ کے لئے اسے کرائے پر دے سکتے ہو؟ کم مدت کے لئے سہی' نئے ماڈل کی مہنگی کار رکھنے کی برتری حاصل ہو جائے گی۔"

اپنی حیثیت ہو یا نہ ہو لیکن اونچی حیثیت ظاہر کرنے اور ثابت کرنے کے ہزار طریقے ہوتے ہیں۔ میں نے کہا۔ "اپنے پاس نئی کار کی نمائش کا یہ اچھا طریقہ ہے لیکن نئی کاروں کو کرائے پر نہیں دیا جاتا۔ تم اسے چلاؤ گی تو پھر یہ زیرو میٹر نہیں رہے گی۔ زیرو

میٹر کی اہمیت اور قیمت ہوتی ہے۔ اس کی قیمت گر جائے گی۔"

"تم بزنس مین بن کر بول رہے ہو۔ تمہارا وہ رومانی موڈ کہاں گیا؟"

"اس کی قیمت ایک دو لاکھ روپے گر جائے گی۔ رومانس کا جواب رومانس سے ملے گا تو میں یہ نقصان برداشت کر لوں گا۔ تم اپنی بات کرو۔"

"میں نے پہلی بار تمہیں دیکھا تھا تو تم سے انجان بن گئی تھی۔ یہ تاثر نہیں دینا چاہتی تھی کہ تم سے متاثر ہو گئی ہوں۔ عورت ایک عالی شان کوٹھی' شاندار کار اور بھاری بینک بیلنس کے ساتھ تمہارے جیسا ہینڈسم اور اسمارٹ ساتھی بھی چاہتی ہے۔ پھر تمہارے اندر ایک بزنس مین کی تمام خوبیاں ہیں۔ اگر میرے مزاج اور میری پسند کا خیال رکھو گے تو میں کہوں گی۔ آئی لائیک یو' آئی لو یو۔"

میں نے خوش ہو کر کہا۔ "تھینک یو۔ یہ گاڑی ایک ماہ کے لئے لے جاؤ۔ اسے چلاتی رہو۔ مجھ سے ملتی رہو۔ ملاقاتیں ہوتی رہیں گی۔ بات بنتی رہے گی تو ہم ایک دوسرے سے بہت کچھ حاصل کرتے رہیں گے۔"

میں نے اسے کار کی چابی دی۔ اس کے ساتھ ہنڈا اکارڈ میں آ کر بیٹھ گیا۔ پھر ہم شوروم سے نکل کر شاہراہوں پر آ گئے۔ وہ بہت خوش تھی۔ ڈرائیو کر رہی تھی۔ کچھ اپنے بارے میں بول رہی تھی اور میرے بارے میں کرید کرید کر معلومات حاصل کر رہی تھی۔

کئی دنوں تک ملاقاتوں کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ پھر بات شادی اور ازدواجی زندگی تک پہنچ گئی۔ اس نے کہا۔ "شادی ہو گی تو میں اس وقت تک ساتھ رہوں گی جب تک تم دوست بن کر رہو گے۔ شوہر اور حاکم بننا چاہو گے تو طلاق لے لوں گی۔"

میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے۔ میاں بیوی کو دوست بن کر رہنا چاہئے مگر چونکہ تم مجھے کسی وقت بھی چھوڑ سکتی ہو' اس لئے میں اپنا کاروبار اور اپنی کمائی تمہارے نام نہیں کروں گا۔"

"میں اپنے ڈیڈی کا کاروبار سنبھالتی ہوں۔ وہ کاروبار اب بھی میرا ہے اور شادی کے بعد بھی میرا رہے گا۔ تم میرے کاروباری معاملات میں مداخلت نہیں کرو گے۔"

اس کا باپ صفدر مرزا جرمنی سے دوائیں امپورٹ کرتا تھا۔ ان دواؤں کی سول ایجنسی اس کے پاس تھی۔ لاکھوں کا منافع حاصل ہو رہا تھا۔ اسماء نے باپ کی سرپرستی میں کاروباری ہتھکنڈے سیکھے تھے۔ خود بہت چالاک تھی۔ بڑی کامیابی سے کاروبار سنبھال

رہی تھی۔ دوسروں سے بہت کچھ وصول کرنا چاہتی تھی۔ اپنے پاس سے ایک تنکا کسی کو نہیں دیتی تھی۔ شادی سے پہلے مجھے بھی پابند کر رہی تھی کہ میں اس کے کاروبار میں مداخلت نہیں کروں گا۔ اس کے کاروبار سے کوئی فائدہ حاصل نہیں کروں گا۔

شادی بھی ایک کاروبار ہے۔ ہمارے درمیان جو معاملات طے ہو رہے تھے۔ اس کے مطابق نہ میں اسماء کو اپنے کاروبار سے کچھ دینے والا تھا' نہ وہ مجھے کچھ دینے والی تھی۔ لیکن انجام کار ہمارا سب کچھ ہماری اولاد کو ملنے والا تھا۔ ہم ساری دنیا کما کر اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتے تھے۔

ہمارے زبانی معاہدے سے یہ بات واضح تھی کہ ہم میاں بیوی بن کر بھی ایک دوسرے پر بھروسا نہیں کر سکتے تھے۔ ایک رشتے میں منسلک ہو کر ایک ساتھ رہ کر بھی کاروباری دنیا میں الگ رہنا چاہتے تھے۔

ہماری شادی ہوگئی۔ ہم ہنی مون کے لئے سوئٹزرلینڈ گئے۔ بڑے مسرت بھرے دن اور بڑی رنگین راتیں گزارتے رہے۔ ہمارے درمیان گہری اپنائیت تھی۔ ہماری کاروباری دنیا الگ تھی۔ وہ ہمارے درمیان حائل نہیں تھی۔ محبت اور جذبات کی دنیا میں ہم ایک دوسرے کے محبوب اور مطلوب تھے۔

ہم ہنی مون سے واپس آکر اپنے اپنے بزنس کی طرف توجہ دینے لگے۔ ہماری مصروفیات مختلف تھیں۔ ہمارے دفاتر الگ تھے۔ ہم رات کو ملتے تھے اور دن کو بچھڑ جاتے تھے۔ وہ کبھی کبھی کاروباری معاملات نمٹانے کے لئے اسلام آباد جاتی تھی۔ پھر دو چار دنوں میں واپس آجاتی تھی۔

میں نے کہا۔ "جب تم جاتی ہو تو میں تنہا رہ جاتا ہوں۔ تمہاری جدائی یہ سمجھاتی ہے کہ ہم جیسے تاجروں پر بھی محبت کے جذبات غالب آتے رہتے ہیں۔ ہمیں صرف منافع نہیں جکڑتا' ایک چاہنے والی عورت بھی جکڑ لیتی ہے۔"

اسماء نے کہا۔ "میں مانتی ہوں' تم سے دور ہو کر تمہیں مس کرتی ہوں لیکن مجبوری ہے۔ کاروبار کو آگے بڑھانا ضروری ہے۔"

"مجبوری کیا ہے؟ کوئی بزنس پرابلم ہے؟"

"پرابلم ہے بھی اور نہیں بھی۔ ہمیں دواؤں کے ضمن میں الکوحل امپورٹ کرنے کی اجازت ملتی ہے۔ علاج معالجے کے سلسلے میں ایسے مراحل آتے ہیں جب نشیلی دوائیں

بھی لازمی ہو جاتی ہیں۔ میں ایسی دوائیں زیادہ امپورٹ کرنا چاہتی ہوں۔ عام دواؤں کے مقابلے میں یہ نشیلی دوائیں کئی گنا زیادہ منافع دیتی ہیں۔ میں ان دواؤں کا پرمٹ حاصل کرنے کے لئے دو دنوں کے لئے جا رہی ہوں۔"

"کیا تم پرمٹ حاصل کر لوگی؟"

"پبلک ریلیشنگ ہو اور متعلقہ عہدے داروں سے اچھے تعلقات ہوں تو بڑے سے بڑا کام ہو جاتا ہے۔"

لوگ کہتے ہیں' آج کے بدترین سیاسی' معاشی حالات میں عام لوگوں کا زندہ رہنا محال ہوگیا ہے۔ روزی حاصل کرنے کے ذرائع محدود ہوگئے ہیں مگر ہمارے لئے تو لامحدود ذرائع ہیں۔ میں ایک کار ڈیلر کی حیثیت سے محدود رہ کر بھی اچھا کما سکتا تھا لیکن میں چور دروازوں سے کاریں امپورٹ کرتا ہوں۔ موقع ملے تو چوری شدہ کاریں بھی فروخت کرتا ہوں۔ اسماء دواؤں کی سول ایجنسی سے لاکھوں کما رہی تھی لیکن اس روزی کو محدود نہیں کر رہی تھی۔ زیادہ سے زیادہ الکوحل اور نشیلی دواؤں کا پرمٹ حاصل کرنے گئی تھی۔

اسماء تیسرے دن اسلام آباد سے واپس آگئی۔ وہ خوشی سے کھلی ہوئی تھی۔ اسے پرمٹ مل گیا تھا۔ میں نے کہا۔ "تم نے تو کمال کر دیا۔ مجھے امید نہیں تھی کہ یہ پرمٹ حاصل کر سکو گی۔ الکوحل اور نشیلی دواؤں کے سلسلے میں سخت پابندیاں ہیں۔ تم ان پابندیوں کو توڑ کر آئی ہو۔"

وہ فاتحانہ شان سے بولی۔ "یہ سب کچھ پی آر سے ہوتا ہے۔ یعنی پبلک ریلیشنگ سے ہوتا ہے۔ میری پی آر بہت مضبوط ہے۔ اسی لئے بہت اوپر تک میری پہنچ ہے۔"

مجھے پہلی بار ایسا لگا جیسے وہ صرف میری نہیں ہے۔ پبلک ریلیشنگ میں تقسیم ہوگئی ہے۔ اپنی پی آر مضبوط بنانے کے لئے دوسروں سے دوستی کرتی ہے۔ جو مسکراہٹیں اور جو ادائیں میرے لئے ہیں' وہ دوسروں کو بھی دیتی ہے۔ میں نے کہا۔ "تم وہاں دو راتیں رہ کر آئی ہو؟"

"ہاں تو کیا ہوا؟"

"بس یونہی پوچھ رہا ہوں۔ کیا تم پرل میں تھیں؟"

اس نے گھور کر مجھے دیکھا' پھر پوچھا۔ "کیا تم میرے پیچھے اسلام آباد آئے تھے؟"

"تم ایسے کیوں دیکھ رہی ہو؟ میں تمہارے پیچھے نہیں گیا تھا۔ مگر جا سکتا ہوں۔ تم

میری بیوی ہو' تمہاری خبر رکھنا میرا فرض ہے۔"

"کیا میں نادان بچی ہوں یا تم میرے باڈی گارڈ ہو؟"

"ضرورت کے وقت شوہر باڈی گارڈ بھی بن جاتا ہے۔"

"میں ایک نہیں دس باڈی گارڈ رکھ سکتی ہوں۔ تم شوہر ہو' شوہر ہی رہو۔ میں کہاں گئی تھی؟ کیا کرتی رہی تھی؟ یہ انکوائری نہ کرو۔ میں پہلے کہہ چکی ہوں کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے کاروباری معاملات میں مداخلت نہیں کریں گے۔ کیا تمہیں یاد نہیں ہے؟"

"یاد ہے۔ میں تمہارے کاروبار کے سلسلے میں کچھ نہیں پوچھ رہا ہوں۔ میں تو صرف اتنا پوچھ رہا ہوں کہ تم وہاں کہاں کہاں رہیں' کہاں وقت گزارتی رہیں؟"

"جب تک پرمٹ نہیں ملا۔ اسے حاصل کرنے کے لئے جہاں جہاں جانا تھا' جاتی رہی۔ جہاں جہاں گزارنا تھا' وقت گزارتی رہی۔ اور کچھ پوچھنا چاہتے ہو؟"

میں خاموش رہا۔ ہمارے درمیان جو معاملات طے ہو چکے تھے۔ ان کے مطابق مجھے خاموش ہی رہنا تھا لیکن یہ مناسب نہیں تھا۔ یہ تو ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے کہ اپنا وارث پیدا کرنے کے لئے اپنی عورت کے دن رات کا حساب رکھا جاتا ہے۔

لیکن اسماء حساب دینے والی نہیں تھی۔ اس نے پہلے ہی میرے حساب مانگنے والے کھاتے کو بند کر دیا تھا۔ اگر مجھے یہ پسند نہیں تھا تو مجھے اس سے معاہدہ نہیں کرنا چاہئے تھا اور اب اعتراض کروں گا تو وہ طلاق مانگے گی۔ شادی کو پانچ ماہ ہوئے تھے' یہ شادی مذاق بن جائے گی۔ کاروباری دنیا میں ہمارا نام ہے' عزت ہے۔ پھر اسماء کے کتنے ہی طلب گار ہیں۔ وہ سونے کی چڑیا کو پھانسنے میں لگ جائیں گے۔

ویسے ابھی بات بگڑی نہیں تھی۔ بس اتنا ہوا تھا کہ گھر کی چار دیواری میں بیوی کو سر سے پاؤں تک حاصل کر سکتا تھا۔ گھر کے باہر اس کا محاسبہ نہیں کر سکتا تھا۔ ایک شوہر کو محاسبے کا جو حق حاصل ہوتا ہے' میں اس سے محروم ہو گیا تھا۔

میں نے سوچا۔ وہ آئندہ ایک رات کے لئے بھی کہیں جائے گی تو مجھے اس کا پیچھا کرنا چاہئے۔ ایسا نہیں کروں گا' اپنا شبہ دور نہیں کروں گا تو اطمینان نہیں ہو گا۔ طرح طرح کے خیالات مجھے پریشان کرتے رہیں گے۔

مجھے اس سے اور کوئی شکایت نہیں تھی۔ وہ مجھے بہت چاہتی تھی۔ جب مصروفیت زیادہ نہیں ہوتی تو گھر میں رہ کر میرے لئے طرح طرح کے کھانے پکاتی تھی۔ کہتی تھی' یہ

عورت کی فطرت ہے۔ اپنے ہاتھ سے اپنے شوہر کو پکا کر کھلانا چاہتی ہے۔ اس کے منہ سے تعریفیں سننا چاہتی ہے۔

اور میں تعریفیں کرتا تھا۔ واقعی' وہ لذیذ کھانے پکاتی تھی۔ میرے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزارتی تھی۔ گھر میں میری پسند کا لباس پہن کر رہتی تھی۔ ایک بیوی کو جتنی محبت کرنی چاہئے' شاید وہ اس سے کچھ زیادہ ہی کرتی تھی۔ میں ایک دن بیمار پڑ گیا تو وہ دفتر نہیں گئی۔ فون کے ذریعے اہم معاملات نمٹاتی رہی۔ میری تیمار داری کرتی رہی۔

میں نے بخار کی حالت میں اسے اپنے قریب بلایا اور آغوش میں بھر کر کہا۔ "مجھے چھوڑ کر نہ جاؤ۔"

"میں کہاں جا رہی ہوں' میں تو تمہارے پاس ہوں۔"

"تمہاری کاروباری مصروفیات تمہیں مجھ سے دور کر رہی ہیں۔ تم مجھے پرایا سمجھ کر کہتی ہو کہ میں تمہاری مصروفیات کا حساب نہ پوچھا کروں۔ تہذیب کی ابتداء سے مرد کو یہ حق دیا گیا ہے کہ وہ اپنی عورت کا حساب رکھا کرے۔ تم میری خدمت کرتی ہو' مجھ سے بہت محبت کرتی ہو' مگر جو حق سب سے اہم ہے' وہ مجھے نہیں دیتی ہو۔"

"میں پہلے ہی تم سے صاف صاف کہہ چکی ہوں' ہم ایک دوسرے کے مزاج کے مطابق زندگی گزاریں گے۔ ہم میں سے کوئی کسی کے معاملے میں مداخلت نہیں کرے گا۔ اگر میری محبت میں اور میری توجہ میں کوئی کمی ہے تو میں تمہاری شکایت دور کروں گی۔ اپنی کوتاہیوں کی معافی مانگ لوں گی لیکن جو طے ہو چکا ہے' میں اس کے مطابق تمہاری اور صرف تمہاری شریکِ حیات بن کر زندگی گزاروں گی۔"

وہ اپنے طور پر درست کہہ رہی تھی۔ وہ ایک بیوی کی حیثیت سے بھرپور محبتیں دے رہی تھی۔ ایک شکایت کے سوا کوئی اور شکایت اس سے نہیں تھی اور میں یہ کہہ نہیں سکتا تھا کہ اس میں کوئی کھوٹ ہے۔ مجھے تو اب اسی طرح اس کے ساتھ زندگی گزارنی تھی۔

ایک ماہ بعد مجھ پر ایک افتاد آپڑی۔ ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس کی میں کبھی توقع نہیں کر سکتا تھا۔ دو افراد میرے شوروم میں آئے تھے۔ انہوں نے ایک کار پسند کی۔ اسے خریدنے سے پہلے اسے چلا کر دیکھنا چاہا۔ میں ان کے ساتھ کار میں بیٹھ گیا۔ ان میں ایک اسے ڈرائیو کرتے ہوئے ہائی وے کی طرف جانے لگا۔ راستے میں پٹرولنگ پولیس نے

روک لیا۔ ہم سب کو کار سے اتار کر تلاشی لینے لگے۔ ان میں سے ایک کے پاس بریف کیس تھا۔ دوسرے کے پاس بڑا سا بیگ تھا۔ بیگ میں ہیروئن کے بڑے بڑے پیکٹس رکھے ہوئے تھے اور بریف کیس میں ڈالرز اور پونڈز رکھے ہوئے تھے۔ یہ دیکھ کر میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

دھندا ہم بھی کرتے ہیں۔ ہم بھی روزی کے اور رزق کے لامحدود ذرائع اختیار کرتے ہیں۔ مگر عزت سے کرتے ہیں۔ کوئی ہم پر ہاتھ نہیں ڈالتا۔ ان دو کوڑی کے منشیات فروشوں کے باعث میں مصیبت میں پڑ گیا۔ انہوں نے مجھے بھی ان کے ساتھ گرفتار کرلیا۔ تھانے لے جاکر ان کے ساتھ میری بھی پٹائی کی۔

میں نے کسی طرح اسماء کو اطلاع دی۔ وہ دوڑی چلی آئی۔ تھانے کے انچارج اور پیٹرولنگ پولیس والوں پر گرجنے لگی۔ "آپ لوگ شریف اور عزت دار لوگوں کو نہیں پہچانتے۔ ایک ہی لاٹھی سے چور بدمعاشوں کے ساتھ ہانک دیتے ہیں۔ میں آپ لوگوں کی شکایت اوپر والوں تک کروں گی۔ تب پتا چلے گا کہ ہم کون لوگ ہیں۔"

ایس ایچ او نے کہا۔ "تمہیں جو کرنا ہے کرو' تمہارا آدمی مال کے ساتھ پکڑا گیا ہے۔ اس پر الزام ہے کہ یہ منشیات فروشوں کو شوروم کی گاڑیوں میں بٹھا کر لے جاتا ہے۔ یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ گاڑیوں کے خریدار ہیں۔ انہیں خریدنے سے پہلے چلا کر دیکھ رہے ہیں۔ اس طرح وہ انہیں شہر سے باہر پہنچا دیتا ہے۔ پولیس والے شوروم کی گاڑیوں سے دھوکا کھا جاتے ہیں۔ تمہارے آدمی کو سال دو سال کی سزا قید بامشقت ہوگی۔"

میں نے پریشان ہو کر اسماء سے کہا۔ "ان سے مک مکا والی بات کرو۔ کچھ دے دلا کر مجھے یہاں سے لے چلو۔"

مگر وہ مک مکا پر آمادہ نہیں ہوئے کیونکہ ہمیں ہائی وے کی پیٹرولنگ پولیس نے گرفتار کیا تھا اور ہمیں اس تھانے کے انچارج کی کسٹڈی میں دے کر گئے تھے۔ اسماء نے کہا۔ "تم فکر نہ کرو۔ میں تمہاری رہائی کا بندوبست کرتی ہوں۔"

وہ مجھے تسلیاں دے کر چلی گئی۔ اس وقت دن کے دو بجے تھے۔ میں بے چینی سے انتظار کرنے لگا۔ زندگی میں پہلی بار حوالات میں آیا تھا اور پولیس والوں نے میری دولت اور حیثیت کا خیال کئے بغیر میری پٹائی کی تھی۔ میری بڑی بے عزتی ہوئی تھی۔ اب آئندہ بے عزتی سے بچانے کے لئے اسماء ہی کچھ کر سکتی تھی۔

رات کے آٹھ بجے کہیں سے فون آیا۔ اسے سنتے ہی ایس ایچ او نے ایک دم سے اٹینشن ہو کر کہا۔ "یس سر!"

وہ دوسری طرف کی باتیں سنتا گیا اور "یس سر' یس سر" کہتا گیا۔ پھر اس نے ریسیور رکھ کر ایک سپاہی سے کہا۔ "اوئے' وہ جو عادل محبوب ہے' اسے حوالات سے نکال کر لے آ۔"

سپاہی مجھے حوالات سے نکال کر اس کے سامنے لے گیا۔ اس نے مجھے دیکھ کر کہا۔ "اوئے' تیری گھروالی کیا چیز ہے؟ اتنی جلدی اسلام آباد پہنچ گئی۔ ادھر سے حکم ہوا ہے۔ تجھے آرام سے رکھا جائے۔ اچھا کھانے پینے کو دیا جائے۔ صبح تیری رہائی کا آرڈر آئے گا۔ اوئے شیدے' اس کے لئے گرما گرم روٹیاں لے آ۔ ادھر دیوار کے پاس بستر لگا دینا۔ حکم ہوا ہے کہ اسے حوالات میں نہ رکھا جائے۔"

سپاہی چلا گیا۔ فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ ایس ایچ او نے ریسیور اٹھا کر ہیلو کہا۔ پھر دوسری طرف کی باتیں سن کر کہا۔ اچھا' آپ وہ بی بی جی ہیں۔ جی ہاں' آپ کے آدمی کو میں نے حوالات سے نکال دیا ہے۔ میرے سامنے کرسی پر بیٹھا ہے' آپ بات کریں۔"

اس نے مجھے ریسیور دیا۔ میں نے اسے کان سے لگا کر پوچھا۔ "ہیلو اسماء! تم ہو؟"

"ہاں میں بول رہی ہوں۔ اب وہ تمہارے ساتھ بدتمیزی نہیں کریں گے۔ میں تمہاری رہائی کی کوشش کر رہی ہوں۔ صبح تک تمہیں وہاں سے لے آؤں گی۔"

میں نے پوچھا۔ "کیا تم اسلام آباد میں ہو؟"

"نہیں۔ میں اسی شہر میں ہوں۔ اسلام آباد کا ایک اعلیٰ عہدے دار یہاں آیا ہوا ہے۔ اس کا نام اور عہدہ سن کر تھانے دار یہ سمجھ رہا ہے کہ اسے اسلام آباد سے فون کیا گیا ہے۔"

"لیکن مجھے یہاں صبح تک کیوں بٹھایا گیا ہے؟"

"رہائی آسانی سے نہیں ملتی۔ تمہیں مال کے ساتھ پکڑا گیا ہے۔ میں تمہاری ضمانت کا انتظام کر رہی ہوں۔ صبح ہوتے ہی آؤں گی۔ تم پریشان نہ ہونا۔ میں ہر حال میں تمہیں سزا سے بچاؤں گی۔"

اس نے مجھے حوصلہ دیا۔ تسلیاں دیں۔ پھر فون بند کر دیا۔ ایس ایچ او نے سپاہیوں سے کہا کہ وہ سونے جا رہا ہے۔ صبح اس کی گھر والی آئے گی۔ اسے چھوڑ دینا' میری نیند

خراب نہ کرنا۔

وہ وہاں سے چلا گیا۔ میرے لئے جو سالن اور روٹیاں لائی گئی تھیں۔ وہ میری پسند اور معیار کے مطابق نہیں تھیں۔ میں نے کھانے سے انکار کردیا۔ میں وہاں کا پانی بھی نہیں پینا چاہتا تھا۔ اپنی بے عزتی کا احساس مجھ پر حاوی ہو رہا تھا۔ مگر کیا کرسکتا تھا؟ جن کے ہاتھ میں قانون ہوتا ہے' وہی ظلم کریں تو فریاد کس سے کی جاسکتی ہے؟ انصاف کہاں سے مل سکتا ہے؟

ایک تو بے عزتی کا احساس تھا۔ اس پر یہ بات دماغ میں چبھ رہی تھی کہ مجھے صبح تک یہاں کیوں بٹھایا گیا ہے۔ ایس ایچ او نے سپاہیوں کو حکم دیا تھا کہ صبح اسماء آئے تو مجھے چھوڑ دیا جائے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ایس ایچ او کو میری رہائی کا آرڈر دے دیا گیا تھا۔ مگر صبح تک مجھے وہاں روکنے کا بھی حکم دیا گیا تھا۔

مجھے ابھی چھوڑ دیا جاتا تو میں گھر جاکر کمر سیدھی کر سکتا تھا۔ بڑی مار پڑی تھی' بدن دکھ رہا تھا۔

اسماء کہہ رہی تھی کہ وہ میری ضمانت کا انتظام کررہی ہے۔ میری رہائی کے لئے کوششیں کررہی ہے۔ اگر اب وہ مجھ سے رابطہ کرتی تو میں اسے بتاتا کہ رہائی کا آرڈر دے دیا گیا ہے۔ وہ یہاں آکر مجھے لے جاسکتی ہے۔

لیکن وہ صبح آئی۔ بہت تھکی ہوئی سی لگ رہی تھی۔ لباس پر شکنیں پڑی ہوئی تھیں۔ بال کچھ بکھرے ہوئے تھے۔ میں نے اس کے بازو کو تھام کر کہا۔ "تم نے دوسری بار فون نہیں کیا۔ تمہیں پتا نہیں ہے' رات ہی کو میری رہائی کا آرڈر مل چکا تھا۔"

اس نے مجھے ایسے دیکھا جیسے ایک نادان بچے کو دیکھ رہی ہو۔ پھر تھکے ہوئے انداز میں بولی۔ "آؤ چلیں۔"

ہم گھر آگئے۔ وہ بیڈ روم میں پہنچتے ہی نیا لباس نکال کر باتھ روم میں چلی گئی۔ میرا بدن بری طرح دکھ رہا تھا۔ میں بستر پر گر پڑا۔ پھر پتا نہیں کب میری آنکھ لگ گئی۔ میں گہری نیند سوتا رہا۔ یہ بھی ایک تجربہ تھا کہ لات جوتے کھا کر آنے سے گہری نیند آتی ہے۔

سہ پہر کے تین بجے میری آنکھ کھلی۔ میں چھت کو تکتے ہوئے سوچنے لگا۔ یہ اچانک کیسی مصیبت آگئی تھی۔ میرا نام منشیات فروشوں کی فہرست میں آنے والا تھا۔ سزا ایک

سال کی ہوتی یا ایک منٹ کی' سوسائٹی میں میری عزت دو کوڑی کی ہوجاتی۔ ایسے وقت دولت بھی کام نہیں آرہی تھی۔ اسماء نے ثابت کردیا تھا کہ وہ مجھے جی جان سے چاہتی ہے۔ پتا نہیں' اس کی پبلک ریلیشنگ کہاں تک ہے' وہ کہاں کہاں گئی ہوگی؟ کس قدر پریشان ہوتی رہی ہوگی؟

میں نے سر گھما کر دیکھا۔ وہ وسیع و عریض بیڈ کے دوسرے سرے پر آنکھیں بند کئے بے خبر سو رہی تھی۔ تن بدن کا ہوش نہیں تھا۔ لباس اِدھر سے اُدھر ہو رہا تھا۔ میں نے اٹھ کر اس کا لباس درست کیا۔ پھر اسے محبت سے دیکھنے لگا۔ اس نے مجھے بہت بڑی مصیبت سے بچایا تھا۔ میرے لئے بھاگتی رہی تھی۔ لڑتی رہی تھی۔ پھر مجھے جیت کر تھکن سے چُور ہوکر گر پڑی تھی۔ جی میں آیا۔ جھک کر اسے چوم لوں لیکن اس کی نیند میں خلل پڑتا۔ میں وہاں سے اٹھ کر باتھ روم میں چلا گیا۔

کبھی اچھے دن آتے ہیں' کبھی برے دن آتے ہیں۔ ہمارا وہ برا دن گزر گیا۔ پھر ایسا کوئی مسئلہ پیش نہیں آیا جو ہمارے لئے چیلنج بن جاتا۔ ہم اپنے اپنے کاروبار میں مصروف ہوگئے مگر میں لاشعوری طور پر کچھ الجھا ہوا تھا۔ یہ الجھن میری سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ میں نے اپنے آپ کو سمجھایا کہ زندگی میں پہلی بار تھانے گیا تھا اور بے عزتی برداشت کی تھی۔ شاید یہ توہین برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ اسی لئے لاشعور میں بیٹھ گئی تھی۔

ایک ماہ بعد اسماء نے خوشخبری سنائی کہ میں باپ بننے والا ہوں۔ میں نے چونک کر پوچھا۔ "باپ!"

وہ مسکراتے ہوئے میری گردن میں بانہیں ڈال کر بولی۔ "ہاں اور میں ماں بننے والی ہوں۔"

"تم ماں بننے والی ہو؟"

میرے لاشعور سے سوال ابھرا۔ "کس کے بچے کی.........؟"

☆======☆======☆

میں عادل محبوب ہوں۔ ایک پسماندہ علاقے میں رہتا ہوں۔ اپنی لائف ہسٹری کا کچھ حصہ بیان کرچکا ہوں۔ اور کیا بیان کروں؟ عشق نے غالب نکما کردیا۔

اسماء کے عشق نے میرا بینک اکاؤنٹ صفر کر دیا۔ میں ان علاقوں میں جاکر ادھار کی رقم وصول کرتا تھا۔ ادھار لے کر کھانے والے کھا کر ڈکار بھی نہیں لے رہے تھے۔ اپنی

آواز نہیں سناتے تھے۔ کبھی چھپ جاتے تھے' کبھی کوئی بیمار پڑ جاتا تھا۔ کبھی کسی کا باپ مر جاتا تھا۔ وہ قسطوں میں ادائیگی کر رہے تھے۔ مگر خوب دوڑاتے رہتے تھے۔ پورے مہینے میں بمشکل چھ سات سو روپے وصول ہوتے تھے۔ یہی ان کی مہربانی تھی کہ وہ کچھ نہ کچھ دے رہے تھے۔

لیکن ماہانہ چھ سات سو روپے سے گزارا نہیں ہوسکتا تھا۔ کبھی کوئی مرغی پھنستی تھی مگر سونے کا ایک انڈا دے کر چلی جاتی تھی۔ پتا نہیں شکار کیوں نہیں پھنس رہا تھا؟ میں آئینے میں خود کو توجہ سے دیکھتا تھا۔ کیا مجھ میں کوئی عیب پیدا ہوگیا ہے؟ مجھ میں کوئی کشش نہیں رہی ہے؟ میری خوبروئی ماند پڑ رہی ہے؟

جیسے جیسے وقت گزرتا ہے' طوائفیں ہاتھوں میں آئینہ لے کر دیکھتی ہیں۔ سر کا کوئی بال سفید تو نہیں ہوگیا ہے؟ کیا حسن بجھ رہا ہے؟ کیا جوانی آخری دہلیز پر آگئی ہے؟

مگر میری تو کوئی عمر نہیں ہوئی تھی۔ ابھی زندگی کے بتیس سال گزرے تھے۔ اس عمر میں مرد گھبرو جوان ہوتا ہے۔ میں بھی بھرپور جوان تھا۔ مایوسی یہ تھی کہ اب صرف آئینہ ہی مجھے خوبرو اور گھبرو کہہ رہا تھا۔ کسی رئیس زادی یا کسی رئیس خاتون کی نظریں مجھ پر مہربان نہیں ہو رہی تھیں۔

تاش کے پتے کبھی خوب ساتھ دیتے تھے اور کبھی ساتھ چھوڑ دیتے تھے۔ ایک ماہ تک تو ایسے برے حالات سے گزرتا رہا کہ سوزوکی کو بارہ ہزار میں بیچنا پڑا۔ ان بارہ ہزار نے پھر مجھے رئیس زادہ اور شہزادہ بنا دیا تھا۔ میں ٹیکسیوں میں بیٹھ کر سفر کرنے لگا۔ زبان کا ذائقہ بدلنے کے لئے کبھی مہنگے کھانے کھانے لگا۔ جی بہت چاہتا تھا کہ اسماء واپس آجائے یا دور ہی سے باتیں کرلے لیکن وہ بہت ضدی تھی۔ ایک بار اس سے سامنا ہوا تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر ٹھٹک گئی تھی۔ پھر منہ پھیر کر جانے لگی تھی۔ میں نے کہا۔ "خدا کے لئے رک جاؤ۔ مجھ سے دو باتیں کرلو۔"

وہ جانے لگی۔ مجھ سے بات تک نہیں کرنا چاہتی تھی۔ میں نے کہا۔ "ایسا تو دشمن بھی نہیں کرتے۔ اگر دشمن ہو تو گالیاں ہی دے دو۔ اپنی زبان سے میرے لئے کچھ تو بولو۔"

وہ چلتے ہوئے بولی۔ "ایک بار بولوں گی تو دوسری بار آؤ گے۔ پھر تیسری بار آؤ گے۔ یوں ملاقاتوں کا سلسلہ پھر شروع کرو گے۔"

"میں اپنے وعدے پر قائم ہوں۔ کبھی تمہارے گھر اور اسکول کی طرف نہیں آیا۔ یہاں اچانک ہماری ملاقات ہوئی ہے۔ کیا اتنا بھی نہیں سنو گی کہ میں کس طرح تباہ و برباد ہوگیا ہوں؟"

"کیا میں آباد ہوگئی ہوں؟ تم میرا سکون برباد کرچکے ہو اور اب کیا چاہتے ہو؟"

"میں تمہاری تمام شکایتیں دور کردوں گا۔ دن رات کوشش کر رہا ہوں۔ مجھے کچھ کر دکھانے کا کوئی نہ کوئی چانس ضرور ملے گا۔"

اس نے مجھے گھور کر دیکھا پھر کہا۔ "کوئی چانس ملنے کا انتظار کرتے کرتے ساری زندگی گزار دو گے۔ پتا نہیں مجھے کیا ہوگیا ہے۔ کیوں تم سے امید لگائے رہتی ہوں؟ گھر والے میری شادی کرنا چاہتے ہیں اور میں رشتے ٹھکرا رہی ہوں۔ تم کب میرے پیار کی انتہا کو سمجھو گے؟ کب میرے لئے کچھ کرگزرنے کے لئے تمہارے اندر جذبہ پیدا ہوگا۔"

میرا سر جھک گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا' کیا جواب دوں۔ غصہ آرہا تھا کہ میرے حالات کیوں نہیں بدل رہے ہیں؟ کوئی چانس کیوں نہیں مل رہا ہے؟

وہ بولی۔ "ہم نے وہ مکان چھوڑ دیا ہے اور میں دوسرے اسکول میں پڑھاتی ہوں۔ آج اتفاق سے ملاقات ہوگئی۔ آئندہ میں اس راستے سے بھی نہیں گزروں گی۔ اب انتظار کا حوصلہ نہیں ہے۔ بوڑھے ماں باپ پریشان ہو رہے ہیں۔ میرے لئے بھائی اور بھابی سے جھگڑتے رہتے ہیں۔ میں نے اپنا سکون برباد کیا ہے۔ اب ماں باپ کا سکون برباد نہیں کروں گی۔ وہ مجھے جس گھر میں دھکا دیں گے۔ میں اسی گھر کی ہو جاؤں گی۔"

میں نے اسے بے بسی سے دیکھا۔ کچھ کہنا چاہا مگر بس آگئی تھی۔ وہ اس میں بیٹھ کر چلی گئی۔ میں وہاں دیر تک کھڑا رہا۔ دیر تک سوچتا رہا۔ کیا میں ایک لڑکی کو.......... صرف ایک لڑکی کو حاصل نہیں کرسکتا۔ دھوکے سے' فراڈ سے' خود غرضی سے حاصل کرنا کچھ مشکل نہیں تھا لیکن کسی ایک چاہنے والی کو محبت سے حاصل کرنا ناممکن سا لگ رہا تھا۔

اب محبت آسان نہیں رہی۔ ایک چیلنج بن گئی ہے۔ مستقبل کا بوجھ بن گئی ہے۔ یہ درست ہے کہ محبت کی نہیں جاتی' ہو جاتی ہے لیکن محبت ہو جانے کے بعد محبت کرتے رہنا ایک مسئلہ بن گیا ہے۔ یہ سمجھ میں آرہا تھا کہ شاید میں بھرپور ذمے داریوں کے ساتھ اسماء سے محبت نہیں کرسکوں گا۔ میرا مطلب ہے' محبت تو کرتا ہوں' کرتا رہوں گا لیکن ذمے داریاں نباہ نہیں سکوں گا۔

میری ایک اکیلی سی جان ہے۔ اس ایک جان کو تین وقت کھلانا' اچھے کپڑے پہنانا' رات کو آرام سے سلانا اور تمام دن ہیرو بنائے رکھنا ضروری ہے لیکن ہیرو بننے کی خوش فہمی سدا نہیں رہتی۔ ٹھوکریں لگتی ہیں تو زندگی میں ہیرو کی سطح سے نیچے آکر کوئی چھوٹا رول ادا کرنا پڑتا ہے۔

میرے ساتھ پتے کھیلنے والے اور نشہ کرنے والے سب ہی دن کے وقت محنت مزدوری کرتے تھے۔ ملازمت کرتے تھے۔ رات کو پتے کھیلنے آتے تھے۔ میرے پاس اب کھیلنے کی رقم نہیں ہوتی تھی۔ میں بیٹھ کر دیکھتا تھا۔ میرے سامنے ہارنے والے ہارتے تھے اور جیتنے والے جیت کر اچھی خاصی رقم لے جاتے تھے۔ میرے اندر تحریک اور تڑپ پیدا ہوتی رہتی تھی۔ میرے پاس رقم ہوتی تو میں بھی اسی طرح رقم جیت کر لے جاتا۔

اسماء سے جدائی کا ایک برس گزر گیا۔ پھر دو برس گزر گئے۔ میں زندگی گزارنے کے لئے کوئی نہ کوئی ہیرا پھیری کرتا رہتا تھا۔ میرا ایک دوست ارشد ایک بہت بڑے جنرل اسٹور میں سیلز مین تھا۔ وہ دن کے گیارہ بجے سے رات کے نو بجے تک کاؤنٹر پر ڈیوٹی دیتا تھا۔ اسے ماہانہ تین ہزار روپے ملا کرتے تھے۔ میں نے پوچھا۔ "تم روز دس بارہ گھنٹے تک ڈیوٹی دیتے ہو۔ گاہکوں سے سر کھپاتے رہتے ہو اور تمہیں مہینے کے آخر میں ملتے ہیں صرف تین ہزار۔ کیا اس طرح پوری زندگی گزار دو گے؟"

اس نے کہا۔ "صرف تین ہزار میں پورے ایک کنبے کا پیٹ کیسے پال سکتا ہوں؟ میرے بیوی بچے ہیں۔ ماں باپ ہیں۔ تاش کے پتے ہیں۔ چرس کا سگریٹ ہے۔ اپنا شوق بھی پورا کرنا پڑتا ہے اور گھر کے اخراجات بھی پورے کرنے پڑتے ہیں۔"

"یہی تو کہتا ہوں۔ تم تین ہزار میں گزارا کر رہے ہو۔ جب کہ چھ ہزار میں بھی گزارا نہیں ہو سکتا۔"

"تم میری نہیں' اپنی فکر کرو۔ کچھ کمانا چاہتے ہو تو میرے ساتھ کام کرو۔ میں کاؤنٹر کے پیچھے کام کرتا ہوں' تم کاؤنٹر کے باہر دھندا کرو۔"

اس نے مجھے سمجھایا کہ میں اچھا لباس پہن کر ایک دوسرے شاپر میں کچھ ایسا سامان رکھ کر اس جنرل اسٹور کے اندر آؤں گا۔ یہ ظاہر ہونا چاہئے کہ میں دوسری دکانوں سے شاپنگ کر کے آرہا ہوں۔ پھر میں کوئی چیز خریدنے اس کاؤنٹر پر جاؤں گا جہاں ارشد کی ڈیوٹی ہوگی۔ وہاں کتنی ہی چیزیں پسند کروں گا مگر کوئی ایک چیز خریدوں گا۔ اس دوران میں

دو چار چیزیں دوسرے شاپر میں ڈالوں گا اور اپنی پسند کی صرف ایک چیز کی قیمت ادا کر کے اسے لے جاؤں گا۔

میں نے یہی کیا۔ ایک دن دو شاپرز میں کچھ سامان رکھ کر اس جنرل اسٹور میں گیا۔ ارشد کی ڈیوٹی کاسمیٹکس کے کاؤنٹر پر تھی۔ میں نے وہاں کئی طرح کے شیمپو' آفٹر شیونگ لوشن اور شیونگ کریم جیسی چیزیں نکلوائیں۔ پسند کیں' وہاں کے ہر کاؤنٹر پر ایک ایک سیلز مین تھا۔ میں نے ایک شیونگ کریم خریدی۔ ایک شیمپو اور تین مہنگے پرفیوم کی بوتلیں اپنے شاپرز میں ڈال لیں۔ پھر پیمنٹ کاؤنٹر پر جا کر ایک شیونگ کریم کی قیمت ادا کر کے جنرل اسٹور سے باہر آگیا۔ جب چوری کرانے والا سیلز مین ہو تو کوئی دوسرا مجھے پکڑ نہیں سکتا تھا۔ میں نے شیونگ کریم کی قیمت اسی روپے ادا کی تھی۔ ایک شیمپو کی قیمت ایک سو ساٹھ روپے تھی۔ ایک پرفیوم کی شیشی پر چھ سو روپے لکھے ہوئے تھے۔ باقی دو پرفیوم کی شیشیاں ایک ہزار روپے کی تھیں۔ اس جنرل اسٹور میں صرف اسی روپے دے کر ایک ہزار سات سو ساٹھ روپے کا سامان لے آیا تھا۔ وہ چور دروازے سے بارہ سو میں بیچ دیا گیا۔ ارشد نے اپنے پاس آٹھ سو رکھے اور مجھے چار سو دیئے۔

میں اس جنرل اسٹور میں روز نہیں جا سکتا تھا۔ ایسا کرنے سے ان کی نظروں میں آجاتا۔ مہینے میں ایک یا دو بار ایسی واردات کی جا سکتی تھی۔ ایسی واردات کرانے والا صرف ایک ارشد ہی نہیں تھا۔ اور بھی کئی دکانوں میں ایسے سیلزمین تھے جہاں چوری کا سامان فروخت ہوتا تھا۔ اس دکان والے نے مجھے دوسرے سیلز مین وغیرہ سے ملایا' میں ان کے ساتھ بھی یہی دھندا کرنے لگا۔ کبھی ایک دن میں سو روپے اور کبھی ہزار روپے ملنے لگے۔

آمدنی اور اخراجات برابر چل رہے تھے۔ باون پتے کبھی مالا مال کر دیتے تھے' کبھی کنگال بنا دیتے تھے۔ زندگی مزے سے گزر رہی تھی لیکن وہ ستر ہزار روپے والا چانس نہیں مل رہا تھا۔ میں نے اسماء کو جیسے بھلا دیا تھا لیکن راتوں کو نشے کے عالم میں بہت یاد آتی تھی۔ اچھا ہوا کہ میں اسے بھول رہا تھا۔ اسے نہ بھولتا تو مجھے اس کے لئے دن رات محنت کرنا پڑتی۔ جتنے آرام سے زندگی گزار رہا تھا' وہ آرام حرام ہو جاتا۔

یہ اسماء کا دانشمندانہ فیصلہ تھا کہ ناکام و نامراد ازدواجی زندگی گزارنے سے بہتر ہے کہ شادی نہ کی جائے۔ اس نے سمجھ لیا تھا کہ میں اس کے لئے مرادوں بھری زندگی کا

تاج محل نہیں بنا سکوں گا۔

اور کیسے بناتا؟ شاہ جہاں کے پاس اس کے باپ دادا کی دولت تھی۔ وہ اپنے محل میں بیٹھے بیٹھے دولت کماتا رہتا تھا۔ میرے پاس ایسے ذرائع نہیں تھے۔ دو نمبروں والی کمائی تھی۔ چور راستے اور چور دروازے تھے۔ سوال کیا جاتا ہے' تاج محل کیا ہے؟ جواب دیا جاتا ہے' محبت کی آنکھ سے ٹپکا ہوا ایک آنسو ہے۔

ہوسکتا ہے اسماء کی آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے ہوں۔ ہر قطرہ تاج محل نہ بن رہا ہو۔ ایک چھالا بن رہا ہو۔

ہیرا پھیری کرنے والے ایک جیسی آسودہ زندگی گزار نہیں پاتے۔ کبھی اچھا وقت گزار لیتے ہیں۔ کبھی برا وقت بہت بری طرح آتا ہے اور اچھی طرح ذلیل کرکے گزر جاتا ہے۔ ایک دن میں ایک بڑے اسٹور سے چوری کا سامان لے جاتے وقت پکڑا گیا۔ میرے شاپرز کی تلاشی لی گئی تو اس دکان کا سامان برآمد ہوا۔ ارشد گھبرا گیا۔ وہ بھی پکڑا جانے والا تھا۔ دوسرے کئی سیلزمین مجھے پکڑ کر میری پٹائی کر رہے تھے پھر انہوں نے مجھے پولیس کے حوالے کردیا۔

ارشد اور اس جیسے دوسرے سیلزمینوں نے کہا تھا کہ کبھی پکڑا جاؤں تو انہیں ہرگز الزام نہ دوں۔ ورنہ آئندہ میرے ساتھ دھندا نہیں کیا جائے گا۔ میں پہلی بار ایک دکان میں پکڑا گیا تھا۔ اگر ارشد کو اس واردات میں اپنا شریک بناتا تو پھر دوسرے واردات کرنے والے سیلزمین میرے ساتھ کبھی دھندا نہ کرتے۔

تھانے لے جاکر میری پٹائی کی گئی۔ میرا نام' پتا' ٹھکانا پوچھا گیا۔ جب پتا چلا کہ میں کنگال ہوں۔ رہائی پانے کے لئے انہیں ایک روپیا بھی نہیں دے سکوں گا تو انہوں نے دو دنوں تک مجھے حوالات میں رکھ کر خوب پٹائی کی' اس کے بعد چھوڑ دیا۔

اگر بچپن میں اپنے باپ سے اور استادوں سے اتنی مار کھائی ہوتی تو شاید پڑھ لکھ کر کسی قابل بن جاتا۔ تھانے والوں کی پٹائی کسی قابل نہیں بناتی یا تو چور بدمعاش بناتی ہے یا اپاہج بناتی ہے۔ مجھے ایسا ہی لگ رہا تھا جیسے میرے ہاتھ پاؤں توڑ دیئے گئے ہیں۔ بدن کی تمام ہڈیاں دکھ رہی تھیں۔ جسم اور چہرہ لات جوتے کھا کر اس قدر سوج گیا تھا کہ میں آئینے کے سامنے خود کو نہ پہچان سکا۔

میں تھانے سے رہائی پاکر تکلیف سے کراہتا ہوا ایک فرنیچر کی دکان کے پاس سے

گزر رہا تھا۔ ایک الماری میں بڑا سا آئینہ لگا ہوا تھا۔ میں نے خود کو اس میں دیکھا۔ آہ! میں کتنا ہینڈسم اور اسمارٹ تھا۔ آئینے میں دور دور تک میری خوبروئی کی ایک جھلک بھی نہیں رہی تھی۔ مجھے بچے دیکھتے تو ڈر جاتے۔ عورتیں مجھے دیکھے بغیر گزر جاتیں اور ایسا ہو رہا تھا۔ کوئی نظر مجھ پر نہیں ٹھہر رہی تھی۔

مگر وہ ٹھہر گئی۔ مجھے دیکھتے ہی ٹھٹک گئی۔ فرنیچر کی دکان کے اندر تھی۔ باہر آرہی تھی۔ ایسے ہی وقت اس نے مجھے دیکھا تھا۔ میرا لباس کئی جگہ سے پھٹا ہوا تھا۔ پولیس والے اس طرح مارتے ہیں کہ اوپر سے زخم نظر نہیں آتا۔ مگران کی مار ہڈیوں کے اندر تک پہنچتی ہے اور اوپر سے حلیہ بدل دیتی ہے۔

اس پر جیسے سکتہ طاری ہوگیا تھا۔ وہ ایسے دیکھ رہی تھی جیسے میری اس بدترین حالت کا یقین نہ آرہا ہو۔ میں اس سے نظریں چرا رہا تھا۔ اس نے شدید حیرانی سے پوچھا۔ "یہ تم ہو؟"

یہ پوچھتے ہی اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "وہ.........وہ کچھ لوگ میرے دشمن بن گئے ہیں۔ اگر وہ ایک ایک کرکے آتے تو میں ان سے نمٹ لیتا۔ مگران سب نے مل کر مجھے مارا ہے۔"

"اپنی صفائی میں کچھ نہ کہنا۔ میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ تم کبھی سچ نہیں بولو گے۔ جو غنڈے بدمعاش ہوتے ہیں' وہ بھی کسی وجہ اور کسی مقصد کے بغیر ایک شریف آدمی پر ہاتھ نہیں اٹھاتے۔ کیا کرتے ہو؟ کیا کماتے ہو؟ یہ میں نہیں جانتی لیکن یقین سے کہتی ہوں کہ محنت مزدوری نہیں کرتے ہو؟ الٹے سیدھے دھندے کر رہے ہو۔ ہیرا پھیری کرنے والوں کی یہی حالت ہوتی ہے' جو تمہاری ہو رہی ہے۔"

وہ بولتی رہی۔ میں چپ چاپ سنتا رہا۔ اس نے کہا۔ "گھر جاؤ اور سوچتے رہو۔ اگر تم بیمار ہوتے' کسی حادثے میں زخمی ہو کر گھر آتے تو ایک محنت کرنے والی بیوی تمہاری تیمارداری کرتی۔ تمہارے زخموں پر مرہم رکھتی۔ جاؤ اور جاکر دیکھو۔ کیا وہاں کوئی تمہاری عیادت کو اور مزاج پرسی کو آئے گا؟ تمہاری زندگی میں کوئی مسیحا بننے والی ہستی ہے؟"

میں اوپر سے ٹوٹا پھوٹا ہوا تھا۔ اندر سے بھی بری طرح ٹوٹ گیا تھا۔ اس کی یہ بات اثر کر رہی تھی کہ میرے زخموں پر مرہم رکھنے والا کوئی نہیں ہے۔ میں اس کی انگلی پکڑ کر چلتا تو آج وہ مجھے دونوں بانہوں میں سمیٹ کر میری مسیحا بن جاتی۔ میں نے شرمندگی سے

کہا۔ "میں اب تک ناکام رہا ہوں۔ تم نے بھی ایک ہی بار میرا ساتھ دیا۔ پھر مجھے چھوڑ کر چلی گئیں۔ ایک بار......... صرف ایک بار پھر میرا ساتھ دو۔ میرا ہاتھ تھام لو۔ مجھے پہلے جیسی محبتیں دو۔ پھر جو تم کہوگی' کروں گا۔"

"کرنے والے کسی سے کوئی وعدے نہیں کرتے۔ وہ کہنے سے پہلے کچھ کر دکھاتے ہیں۔ تم مرد ہو۔ میرا سہارا کیوں چاہتے ہو' صاف بولو' مجھ سے کیا چاہتے ہو؟ اگر محبت چاہتے ہو تو میرا دل' میرا دماغ' میرا خیال' میرے خواب سب ہی تمہارے نام ہو چکے ہیں؟ تم سے اس لئے نہیں ملتی' اس لئے دور رہتی ہوں کہ قریب رہوں گی تو تم صرف میری محبت کا دم بھرتے رہو گے' ہماری مشترکہ زندگی اور خوش حالی کا خواب کبھی پورا نہیں کرو گے۔"

"تم اپنی ہی بات نہ کرو۔ میری باتوں کو بھی سمجھو۔ مجھے ایک نادان بچہ ہی سمجھ لو۔ مجھے تمہاری قربت سے حوصلہ ملے گا۔ میری حالت دیکھو' پھر مجھے چھوڑ کر جانے سے پہلے بتا دو کہ میں کہاں جاؤں؟"

اس نے پوچھا۔ "یہاں کھڑے رہو گے یا اسپتال چلو گے؟ وہ سامنے ایک کلینک ہے' وہاں چلو۔"

وہ آگے بڑھ گئی۔ میں سر جھکا کر ایک سعادت مند بچے کی طرح اس کے پیچھے چلنے لگا۔ کلینک میں ڈاکٹر نے مجھے دیکھ کر پوچھا۔ "کہاں سے مار پیٹ کرکے آئے ہو؟"

میں نے کہا۔ "وہ بدمعاش تعداد میں کئی تھے۔ انہوں نے میرے کپڑے پھاڑ دیئے اور یہ حال کیا ہے۔"

ڈاکٹر نے مجھے ایک بیڈ پر لیٹنے کے لئے کہا پھر میرا معائنہ کرتے ہوئے بولا۔ "ان بدمعاشوں نے تمہارے جسم کی کوئی ہڈی نہیں چھوڑی ہے۔ میں ابھی دوائیں دے رہا ہوں۔ انجکشن بھی لگا رہا ہوں۔ نسخہ بھی لکھ کر دوں گا۔ گھر جاکر بستر پر پڑے رہو۔ زیادہ سے زیادہ آرام کرو اور ہڈیوں کو آرام پہنچاؤ۔"

ڈاکٹر نے مجھے دوائیں کھانے کے لئے دیں۔ انجکشن لگایا۔ پورے بدن پر مالش کرنے کی دوا لکھ دی۔ اسماء نے اس کا بل ادا کیا۔ ایک کیمسٹ سے میرے لئے انجکشن اور دوائیں خریدیں۔ پھر مجھے رکشے میں بٹھا کر میرے گھر لے آئی۔ میں دو دن حوالات میں رہ کر آیا تھا۔ میرے وہ تمام دوست میرے لئے پریشان تھے۔ صبح اور رات کو آتے

تھے پھر میرے دروازے پر تالا دیکھ کر چلے جاتے تھے۔

وہ اتوار کا دن تھا۔ دکانیں بند تھیں۔ چھٹی کے دن انہوں نے میرے گھر کے کئی چکر لگائے۔ جب میں اسماء کے ساتھ دروازہ کھول کر اندر پہنچا تو وہ بھی چلے آئے۔ ایک نے کہا۔ "عادل' ہم تیرے لئے بہت پریشان ہیں۔ ہم تجھے تھانے سے لانے کے لئے کچھ نہیں کرسکتے تھے۔"

دوسرے نے کہا۔ "ہم ڈر رہے تھے کہ تُو نے چوری کی واردات میں ہم سب کا ذکر کیا ہوگا۔ ہماری شامت بھی آنے والی ہے۔"

وہ سب بول رہے تھے اور اسماء حیرانی اور بڑے دکھ سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کبھی انہیں اور کبھی مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے پریشان ہوکر چیختے ہوئے ان سے کہا۔ "چپ ہو جاؤ۔ بکواس نہ کرو۔ میں نے کوئی چوری نہیں کی ہے۔ میں تھانے میں نہیں تھا۔ تم لوگوں سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہاں سے چلے جاؤ۔"

ان میں سے ایک نے کہا۔ "ہاں ٹھیک ہے' ٹھیک ہے۔ نہ تُو چور ہے نہ ہم چور ہیں۔ ان دو دنوں میں ہمیں یقین ہوگیا ہے کہ تُو نے تھانے میں ہمارا نام نہیں لیا ہے۔ ٹھیک ہے' تجھ سے مل کر یقین ہوگیا ہے۔"

دوسرے نے کہا۔ "یار چلو' اسے پریشان نہ کرو۔ اسے آرام کرنے دو۔"

ایک اور نے پانچ سو کا نوٹ نکال کر میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اسے رکھو۔ ہم تمہارے علاج کے لئے اور دیں گے۔"

میں نے اسماء کی طرف دیکھا۔ وہ منہ چھپا کر رو رہی تھی۔ میں نے غصے سے کہا۔ "میں تھوکتا ہوں' تمہارے پانچ سو روپے پر۔ یہاں سے چلے جاؤ' ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔"

انہوں نے مجھے ناگواری سے دیکھا۔ پھر بڑبڑاتے ہوئے چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد اسماء نے گھور کر مجھے دیکھا پھر اپنے آنچل سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "کتنا جھوٹ بولو گے؟ کب تک دھوکا دیتے رہو گے؟ آدمی دال روٹی کھاتا ہے یا فاقے کرتا ہے مگر عزت سے رہتا ہے۔ تمہاری کوئی عزت ہے؟ تم جھوٹ بولتے ہو۔ دھوکا دیتے ہو۔ پتے کھیلتے ہو۔ چوری کرتے ہو۔ تھانے میں مار کھاتے ہو اور تم جیسے نہایت گرے ہوئے انسان سے محبت کرنے والی میں ایک اسکول ٹیچر ہوں۔ سچائی اور دیانت داری کا درس دیتی ہوں۔ کیا

ہمارا کوئی میل ہے؟ کیا ایمانداری کے ساتھ بے ایمانی کا نکاح ہوسکتا ہے؟ میں اپنی آبرو کسی ایسے شخص کے نام کیوں کروں جس کی اپنی کوئی آبرو نہ ہو۔ ہائے عادل! میں کڑی دھوپ میں اس طرح نہ جلتی جیسے تمہارے سائے میں جل رہی ہوں۔"

میں سمجھ گیا تھا۔ اب وہ رد کے نہیں رکے گی۔ مجھے ایسے چھوڑ کر جائے گی کہ ہمیشہ کے لئے واپسی کا راستہ بھول جائے گی۔ میں بڑی مشکل سے کراہتے ہوئے بستر سے اٹھ گیا۔ ڈگمگاتا ہوا دروازے کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ اسے بند کرتے ہوئے بولا۔ "میں تمہیں روک نہیں سکوں گا۔ ڈاکٹر نے مجھے انجکشن لگاتے ہوئے کہا تھا کہ نیند آجائے گی۔ میں تکلیف اور تھکن سے چُور ہوں۔ اس سے پہلے کہ میں سوجاؤں' ڈوب جاؤں' مجھے بچالو اسماء!"

وہ کشمکش میں تھی۔ الجھی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ واقعی میرا سر چکرا رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے بے ہوش ہوجاؤں گا' میں نے کہا۔ "بس آخری بات کہتا ہوں۔ میں چوکھٹ پر بیٹھا ہوں۔ تمہیں ٹھوکر مار کر جانا ہوگا ورنہ میں جانے نہیں دوں گا۔"

میں بولتے بولتے بند دروازے کے پاس اوندھا ہوگیا۔ مجھ میں اٹھنے کی سکت نہیں رہی تھی۔ اس نے قریب آکر مجھے تھام کر کہا۔ "یہاں سے اٹھو۔ بستر پر چلو۔"

اس کا اتنا ہی سہارا کافی تھا۔ پھر مجھے یاد نہیں ہے کہ میں کس طرح اس کے سہارے اٹھ کر بستر تک پہنچا تھا اور کب اپنے آپ سے غافل ہوگیا تھا۔

پھر پتا نہیں مجھ پر کب تک غفلت طاری رہی۔ جب آنکھ کھلی تو رات ہو چکی تھی۔ میرے پاس گھڑی نہیں تھی۔ معلوم نہیں کتنا وقت ہو رہا تھا۔ کمرے میں ایک بلب روشن تھا۔ وہ کمرے میں نظر نہیں آرہی تھی۔ شاید کچن میں ہوگی۔ میں نے آواز دی۔ "اسماء مجھے پیاس لگ رہی ہے۔"

کوئی جواب نہیں ملا۔ میں اٹھ کر بیٹھنے لگا تو ہڈیاں دکھنے لگیں۔ میرے سینے پر ایک تہہ کیا ہوا کاغذ رکھا ہوا تھا۔ میرے اٹھتے وقت وہ بستر پر گر گیا۔ میں نے اسے اٹھا کر کھولا۔ اسماء نے مجھے کچھ لکھا تھا۔ میں اسے پڑھنے لگا۔ "عادل! میں یہاں رات دس بجے تک کشمکش میں مبتلا رہی۔ اب جا رہی ہوں۔ تم قابلِ رحم ہو۔ تم سے ہمدردی کی جاسکتی ہے' محبت کی جاسکتی ہے۔ مگر تمہارے ساتھ زندگی نہیں گزاری جاسکتی۔ جو عزتِ نفس کو نہ سمجھتا ہو اور نہایت کم تر درجے کے لوگوں کی طرح تھانے میں مار کھاتا ہو' اس کے ساتھ

ایک اسکول ٹیچر نہیں رہ سکتی۔ مجھے افسوس ہے' میں تمہیں چھوڑ کر جارہی ہوں۔"

میں نے اتنا ہی پڑھا پھر دروازے کی طرف دیکھا۔ وہ دروازہ بند تھا لیکن اس کی کنڈی نہ اندر سے لگی ہوئی تھی نہ وہ باہر سے لگا کر گئی تھی۔ میرا دل نہیں مان رہا تھا کہ وہ مجھے اس بری حالت میں چھوڑ کر گئی ہے۔ شاید اس نے پھر آنے کی بات لکھی ہو۔ میں نے آگے پڑھا۔ اس میں لکھا تھا۔

"میری محبت اپنی جگہ ہے اور یہ میری انسانیت ہے کہ میں نے تمہیں یہاں گھر تک پہنچایا ہے۔ ضرورت کے مطابق دوائیں تمہارے پاس ہیں۔ تمہیں باقاعدہ علاج کرانے کی ضرورت ہے۔ میرے پاس ایک ہزار پندرہ روپے ہیں۔ میں بس کے کرائے کے لئے اپنے پاس پندرہ روپے رکھ رہی ہوں اور ایک ہزار تمہارے تکیئے کے نیچے رکھ کر جارہی ہوں۔ یہ بھی خیال ہے کہ بیمار ہو۔ نیند سے اٹھو گے تو بھوک لگے گی۔ میں نے ایک کلو دودھ گرم کرکے' دو انڈے ابال کر چولہے کے پاس رکھ دیئے ہیں۔ گھر میں کچھ ہوتا تو تمہارے لئے پکا کر جاتی۔ میرا ضمیر مطمئن ہے کہ میں تمہارے لئے کچھ کرکے جارہی ہوں۔ اب شاید کبھی ہماری ملاقات نہ ہو۔ میں دور رہ کر بھی ایک ہی دعا کرتی رہوں گی کہ خدا تمہیں عقل دے۔"

میں نے خط پڑھ کر تکیئے کے نیچے دیکھا۔ وہاں سو سو کے دس نوٹ رکھے ہوئے تھے۔ مجھے ندامت سی ہورہی تھی۔ جب بھی وہ میرے لئے اچھا کرتی تھی اور میں اس کے لئے کوئی اچھائی نہیں کرتا تھا تو احساس ہوتا تھا' شرمندگی ہوتی تھی۔ مگر جو کچھ بھی ہوتا ہے۔ وہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بجھتا رہتا تھا۔ کبھی کبھی ہوا کے ایک جھونکے کی طرح اس کی بات یاد آتی تھی۔ پھر میں اپنے کام سے لگ جاتا تھا۔

زیادہ احساس نہیں ہونا چاہئے۔ احساسات انسان کو جذباتی بنا دیتے ہیں۔ جذبات کے سیلاب میں بہا دیتے ہیں۔ حالات کا تقاضا یہ ہے کہ زندگی کے چیلنج کو قبول کیا جائے۔ اسے اپنے مقاصد اور اپنے مزاج کے مطابق گزارا جائے اور میں اسے اپنے مزاج کے مطابق گزار رہا تھا۔

وہ ایک ہزار روپے میرے بہت کام آئے۔ میں گھر میں پڑا اپنا علاج کراتا رہا۔ اتنی سی رقم میں پوری طرح علاج نہیں ہوسکتا تھا پھر بھی میرے چہرے اور ہاتھ پاؤں کی سوجن ختم ہوگئی۔ میں اچھی طرح چلنے پھرنے کے قابل ہوگیا۔

مجھے جیسے لوگ کسی نہ کسی چانس کے انتظار میں زندگی گزارتے رہتے ہیں۔ انسان کے مقدر میں ہمیشہ بدنصیبی نہیں ہوتی۔ کبھی خوش نصیبی بھی آتی ہے اور زندگی کی گاڑی کچھ دور تک چلانے کے لئے ہمارے اندر تھوڑا سا پیٹرول ڈال کر چلی جاتی ہے۔ ایک دن ایک فلم ڈائریکٹر میرے دروازے پر آگیا۔ وہ انتہائی ناکام ڈائریکٹر تھا۔ فلم لاکھوں روپے کی لاگت سے بنتی ہے۔ کسی کے پاس پچاس ہزار ہوں تو وہ ڈائریکٹر سبز باغ دکھا کر اسے فلم ساز بنا دیتا تھا۔ ہیروئن اور سائڈ ہیروئن بننے والی لڑکیوں سے اسے ملاتا تھا۔ جب وہ کنگال ہو جاتا تو پھر وہ کسی دوسرے فلمساز کو پھانسنا شروع کر دیتا تھا۔

اس نے کئی بار مجھے بھی فلم میں چانس دینے کا وعدہ کیا تھا۔ اس کی کوئی فلم کبھی بن نہ سکی لیکن میں اس سے جیب خرچ لیتا رہتا تھا۔ میں نے اسے اپنے دروازے پر دیکھ کر پوچھا۔ "عالمگیر صاحب! آپ یہاں کیسے؟ آپ کو میرا پتا کس نے بتایا؟"

وہ اندر آکر میرے اجاڑ سے کمرے کو دیکھ کر بولا۔ "ابھی تک وہیں ہو جہاں سے چلے تھے؟"

میں نے کہا۔ "آپ کے ساتھ بھی یہی ہوتا ہے۔ بہت دور تک کمائی کرتے جاتے ہیں۔ پھر واپس اپنی اوقات میں آجاتے ہیں۔"

"اب میں وہ عالمگیر نہیں ہوں۔ ایک کوٹھی خریدنے والا ہوں اور کار تو خرید چکا ہوں۔ باہر کھڑی ہے۔ میرے ساتھ چلو۔"

"کیا کوئی نئی فلم شروع کر رہے ہیں؟"

"فلموں پر لعنت بھیجو۔ میں شو بزنس سے توبہ کر چکا ہوں۔ ایک بہت بڑا شادی دفتر کھولا ہے۔ خوب کما رہا ہوں۔ کیا تم نہیں کماؤ گے؟"

"میں شادی دفتر سے بھلا کیا کماؤں گا؟ نہ شادی کی ہے نہ کرنے کا ارادہ ہے؟"

"میں تمہاری برات لے جانے نہیں آیا ہوں۔ دھندے کی بات کرنے آیا ہوں۔"

میں نے پوچھا۔ "دھندا کیا ہے؟ کچھ معلوم تو ہو؟"

"مجھے کچھ اچھی صورت والی لڑکیوں اور لڑکوں کی ضرورت ہے۔ ایسے میں تمہارا خیال آیا۔ تم اس کاروبار کے عین مطابق ہو۔ لڑکیاں اور ان کے گھر والے تمہیں دیکھیں گے تو ضرور پھنسیں گے۔"

"تو پھر کیا ہوگا؟"

"تو پھر لین دین کے معاملات طے ہوں گے۔ مجھے یاد ہے تمہارے پاس ایم اے کا سرٹیفکیٹ ہے۔ تم بوڑھے ماں باپ کے بے روزگار بیٹے ہو۔"

"میرے بوڑھے ماں باپ کہاں ہیں؟"

"بھئی سمجھا کرو۔ فلموں میں رول کرنے کے لئے ماں باپ کہاں سے آجاتے ہیں۔ ہم ماں باپ، بہن بھائی اور میاں بیوی کے کردار پیدا کرتے ہیں۔"

"سمجھ گیا۔ کرائے کے ماں باپ آئیں گے۔ ہمارا کرائے کا ایک مکان ہوگا۔ کرائے کا قاضی نکاح پڑھانے آئے گا۔ آپ کسی لڑکی سے میری شادی کرا دیں گے، اس شادی کے بعد کیا ہوگا؟"

"شادی کے بعد تمہارے حصے کی رقم تمہیں ملے گی۔"

"یہ رقم کہاں سے آئے گی؟ کتنی آئے گی؟ اور مجھے کتنی ملے گی؟ کھل کر بتاؤ گیم کیا ہے؟"

"ایک جوان بیٹی کے بوڑھے والدین ہیں۔ وہ کسی اچھے تعلیم یافتہ جوان کو داماد بنانا چاہتے ہیں۔ وہ اچھا خاصا جہیز بھی دیں گے اور داماد کو کاروبار کرنے کے لئے پانچ لاکھ روپے بھی دیں گے۔"

"عالمگیر صاحب، یہ تو تقدیر کی لاٹری کھل رہی ہے۔"

"میں جانتا تھا تم سنتے ہی پھڑک اٹھو گے، فوراً راضی ہو جاؤ گے۔"

"ایسے کیسے راضی ہو جاؤں گا؟ آگے پیچھے اچھی طرح دیکھنا ہوگا۔ سمجھنا ہوگا۔ میں شادی کے بعد کسی مصیبت میں پھنس سکتا ہوں۔"

"یہ دھندا ایسا ہے کہ ایک پھنسے گا تو سب پھنسیں گے۔ ورنہ سب کا بیڑا پار ہوگا۔ تم شادی کے بعد چاہو گے تو ایک برس اور دس برس تک اس کے ساتھ زندگی گزار سکتے ہو اور نہ چاہو تو ایک دن بھی اس کے ساتھ نہیں گزارو گے۔ ہم شادی سے پہلے انہیں بتائیں گے کہ تم کھیپئے ہو۔ یہاں سے سنگاپور اور بنکاک وغیرہ مال لے جاتے ہو اور وہاں کا مال یہاں لاکر بیچتے ہو۔ تم شادی کے بعد اپنے حصے کی رقم لے کر سچ مچ کھیپئے کا دھندا کر سکتے ہو۔ ملک سے باہر رہ سکتے ہو یا اسی ملک میں روپوش رہ سکتے ہو۔ تمہارے بارے میں یہ رائے قائم کی جائے گی کہ تم کہیں کسی حادثے کا شکار ہو گئے ہو۔"

"میں اس چکر بازی میں گرفتار ہو سکتا ہوں۔ لڑکی والے الگ پٹائی کریں گے۔"

"اور شادی کے بعد اگر لڑکی کسی حادثے کا شکار ہو جائے تو؟"

میں نے سوچتی ہوئی نظروں سے عالمگیر کو دیکھا پھر کہا۔ "پھر تو ہماری کوئی ذمے داری نہیں ہوگی۔ لڑکی والے ہمیں الزام نہیں دے سکیں گے۔"

"تو پھر راضی ہو؟"

"یہ تو بتاؤ مجھے کتنا حصہ ملے گا؟ نقد پانچ لاکھ روپے ہیں۔ پھر ڈیڑھ لاکھ کا جہیز بھی ہوگا۔"

"تمہیں دس فیصد ملے گا۔ پانچ لاکھ میں سے پچاس ہزار ملیں گے۔ دو لاکھ کے جہیز میں سے بیس ہزار ملیں گے۔ لڑکی تمہارے حصے میں آئے گی۔"

"میرے سر پر پہاڑ رکھ دو مگر لڑکی نہ رکھو۔ اسے لے کر میں کیا کروں گا۔ میں کہیں بھاگ جاؤں گا یا وہ کسی حادثے کا شکار ہو جائے گی تو مجھے پولیس والوں کا سامنا کرنا ہوگا۔ آپ شادی کرانے کے بعد ذمے دار نہیں رہیں گے۔ میں گرفتار بھی ہو سکتا ہوں۔ مجھے بے وقوف نہ بناؤ۔ آمدنی میں ففٹی ففٹی کرو گے تو میں راضی ہوں۔"

"آدھا حصہ تمہیں دے دوں گا تو مجھے کچھ نہیں ملے گا۔ دفتر کے اخراجات بہت زیادہ ہیں۔ جو تمہارے ماں باپ بنیں گے اور جو اس علاقے کا دادا ہے' ان سب کو حصہ دینا ہوگا۔ تمہاری شادی میں الگ رقم خرچ ہوگی۔ مجھے کیا خاک ملے گا' ایسی بات کرو کہ آگے بھی ہمارا دھندا چلتا رہے۔"

ہمارے درمیان لین دین پر بحث ہونے لگی۔ بہت بڑی پارٹی پھنس رہی تھی۔ عالمگیر کے البم میں میری ایک تصویر تھی۔ عالمگیر نے وہ تصویر لڑکی کے ماں باپ کو دکھائی تھی اور وہ راضی ہو گئے تھے۔ اس لئے عالمگیر میرے پاس آیا تھا۔ میں اس کی ضرورت بن گیا تھا۔ ایسے ہی موقع سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔

میں نے کہا۔ "آخری بات کہتا ہوں۔ پانچ لاکھ میں سے دو لاکھ لوں گا۔ جب تک لڑکی کسی حادثے کا شکار نہیں ہوگی' اس کے ساتھ زندگی گزارنی ہوگی۔ اس وقت تک جہیز کا سامان فروخت نہیں ہوگا۔ فروخت کرنے کے بعد جو رقم ہاتھ آئے گی' اس میں سے بیس فیصد لوں گا۔"

وہ کچھ کہنا چاہتا تھا۔ میں نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "بس کرو۔ میں آگے بحث نہیں کروں گا۔ اور جب تک شادی نہیں ہوگی' رقم نہیں ملے گی تب تک تم مجھے روزانہ سو روپے

دو گے۔"

"ابھی آمدنی شروع نہیں ہوئی' تمہیں روزانہ سو روپے کہاں سے دیا کروں گا؟"

"میری کوئی آمدنی نہیں ہے۔ کیا میں ہوا کھا کر زندہ رہوں گا؟ یہ حساب کرو کہ کتنے دنوں میں یہ شادی کا معاملہ نمٹے گا اور روز روز کے حساب سے تم مجھ پر کتنا خرچ کرو گے؟ میں اتنی رقم تمہیں بعد میں دے دوں گا۔"

"ایک مہینے میں سارا لین دین ہو جائے گا۔ لڑکی والے تو جلدی کر رہے ہیں۔ تمہیں ایک بار دیکھیں گے۔ تم سے باتیں کریں گے' پھر شادی کی تاریخ طے ہو جائے گی۔"

ہمارے درمیان معاملہ طے ہو گیا۔ میں اس کے ساتھ ایک پرانی سی کار میں بیٹھ کر اس کے دفتر میں آیا۔ اس نے بڑا شاندار دفتر بنایا تھا۔ وہاں تین کمرے تھے۔ ایک میں اس کا دفتر تھا۔ دوسرے کمرے کو ویٹنگ روم بنایا تھا۔ تیسرا کمرا پرائیویٹ تھا۔ وہاں لڑکی اور لڑکے والوں سے معاملات طے ہوتے تھے۔ ہر کمرے میں نیا فرنیچر تھا' نئی ڈیکوریشن تھی۔ دیوار پر فریم کئے ہوئے ایسے دو بڑے سرٹیفکیٹ تھے جن سے ثابت ہوتا تھا کہ وہ شادی خانہ آبادی کا مستند ادارہ ہے اور اس دفتر کے ذریعے کئی کامیاب شادیاں کرائی گئی ہیں۔

کتنے ہی شادی شدہ جوڑوں کی تصویریں ایک بڑے سے البم میں تھیں۔ ان کے نام پتے اور شادی کی تاریخیں لکھی ہوئی تھیں۔ میں نے پوچھا۔ "جو یہاں رشتہ کرانے آتے ہیں۔ کیا وہ ایسے پتے ٹھکانے پر جا کر انکوائری نہیں کرتے؟"

اس نے البم کی ایک ایک تصویر دکھاتے ہوئے کہا۔ "ان میں سے کسی کی دلہن مر چکی ہے اور کوئی دلہن بیوہ ہو چکی ہے۔ ان میں اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جو کرائے کے مکانوں پر رہتے تھے۔ اب وہ دوسرے مکانوں میں منتقل ہو گئے ہیں۔ کچھ ایسے ہیں جو روزگار کے لئے ملک سے باہر چلے گئے ہیں۔ کسی بھی پتے پر جانے سے یہ تو معلوم ہوگا کہ یہ شادی ہوئی تھی۔ محلے پڑوس والے یہ نہیں بتا سکیں گے کہ کس شادی دفتر کے ذریعے ہوئی تھی۔"

میں نے پوچھا۔ "میری شادی جس لڑکی سے ہوگی' وہ کون لوگ ہیں؟"

"ایک ریٹائرڈ ملازم ہے۔ وہ بوڑھا ہو چکا ہے۔ ایک بیٹے اور ایک بیٹی کی شادی کر چکا ہے۔ ایک جوان بیٹی رہ گئی ہے۔ وہ بوڑھے ماں باپ اس آخری فرض سے بھی جلد ہی سبکدوش ہونا چاہتے ہیں۔"

"کیا لڑکی مجھے دیکھے گی؟ اور میں لڑکی کو دیکھوں گا؟"

"نہیں' صرف اس کے ماں باپ تمہیں دیکھیں گے۔ دراصل لڑکی کا بھائی اور بھابی اس شادی پر اعتراض کر رہی ہیں۔ ان کے اپنے خاندانی جھگڑے ہیں۔ نہ لڑکی یہاں آنا چاہتی ہے نہ تمہیں دیکھنا چاہتی ہے۔ وہ ماں باپ کے فیصلے پر راضی ہے۔ ادھر تم بھی راضی ہو۔ اسی ایک ماہ کے اندر سارا معاملہ نمٹ جائے گا۔"

"لڑکی اور اس کے باپ کا نام کیا ہے؟"

"باپ کا نام علیم الدین شیخ ہے اور لڑکی کا نام اسماء بانو۔"

میرا دل دھک سے رہ گیا پھر دھڑکنیں اپنی نارمل رفتار سے زیادہ ہوگئیں۔ واہ ری قسمت۔ مجھے گھما پھرا کر اسماء کے پاس پہنچا رہی تھی۔ وہ ایک بار ملی تو میرے پاس ستر ہزار روپے تھے۔ اب میری زندگی میں آ رہی ہے تو مجھے لاکھوں روپے ملنے والے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ اسماء میرے لئے خوش قدم تھی۔ وہ مجھ سے دور رہنا چاہتی تھی۔ تقدیر اسے قریب لے آتی تھی۔ میں نے پوچھا۔ "لڑکی گھر کی چار دیواری میں رہتی ہے یا کچھ کرتی بھی ہے؟"

"ملازمت کرتی ہے۔ کسی اسکول میں ٹیچر ہے۔"

میں خوشی سے اچھل کر کھڑا ہوگیا پھر بولا۔ "ہائے' ایک تیر میرے سینے پہ مارا کہ ہائے ہائے۔"

عالمگیر نے حیرانی سے پوچھا۔ "تم اتنے خوش کیوں ہو رہے ہو؟"

"یار! میں پچھلے تین برسوں سے اسے راضی کر رہا ہوں۔ بڑی ضدی اور اصول پسند ہے۔ راضی ہی نہیں ہوتی تھی۔ یہ اچھا ہے کہ شادی سے پہلے وہ مجھے نہیں دیکھے گی۔ میں سرپرائز دولھا بن کر اس کی زندگی میں آؤں گا۔"

عالمگیر نے کہا۔ "اچھا تو اس لڑکی پر تمہاری بھی نیت خراب ہے؟"

میں نے پوچھا۔ "بھی" کا مطلب کیا ہوا؟"

"اس علاقے کا دادا بھی اسے حاصل کرنا چاہتا ہے۔ آگے کہیں لے جاکر اس سے مال کمائے گا۔ سب کے اپنے اپنے دھندے ہیں۔ ہمیں کسی سے کیا لینا ہے۔ ہمیں تو اپنا اُلو سیدھا کرنا ہے۔"

"ایسی بات نہ کرو۔ وہ میری ہے اور شادی کے بعد بھی میری رہے گی۔"

اس نے کہا۔ "دادا سے پہلے ہی معاملہ طے ہوچکا ہے۔ شادی کے بعد تم روپوش ہو جاؤ گے یا لڑکی کو اغوا کیا جائے گا۔ دونوں صورتوں میں وہ دادا بھائی کے پاس پہنچے گی۔"

"نہیں۔ دادا سے ایسا کوئی سودا نہ کرو۔ وہ میری شریکِ حیات بن کر رہے گی۔"

"یار' بنتی ہوئی بات نہ بگاڑو۔ وہ بہت پہلے سے اسماء پر دانت گاڑے بیٹھا ہے۔ وہ اس علاقے کا شیر ہے۔ ہم اس کے منہ سے لقمہ چھینیں گے تو وہ ہمیں کچا چبا جائے گا۔ یہاں دھندا نہیں کرنے دے گا۔"

میں پریشان ہو کر سوچنے لگا۔ ایک مدت کے بعد اسماء میری زندگی میں آ رہی تھی لیکن اس کے سر پر خطرات منڈلا رہے تھے۔ وہ آگے جاکر غنڈوں اور موالیوں کے ہاتھ لگنے والی تھی۔

عالمگیر نے پوچھا۔ "تم کس سوچ میں پڑ گئے؟ بھئی' تم اسے حاصل کرنا چاہتے تھے' وہ تمہیں مل جائے گی۔ وہ تمہارے پاس دلہن بن کر آئے گی۔ تم اس کے ساتھ ایک نہیں دس راتیں گزارو۔ دادا بھائی کو اعتراض نہیں ہوگا کیونکہ اسے ہم سے بھی رقم ملنے والی ہے۔ جب تمہارا جی بھر جائے گا تو تم اسے چھوڑ دو گے۔ وہ آگے جاکر اس سے وصولی کرے گا۔ یہ تمہارے لئے بھی بہتر ہوگا۔ کہاں بیوی بچوں کے جھمیلے میں پڑو گے۔"

میں سر جھکائے سوچ رہا تھا۔ ایک بات سمجھ میں آ رہی تھی۔ اس شادی سے انکار کروں گا تو یہاں میری جگہ کسی دوسرے مہرے کو لایا جائے گا۔ اسماء کے ماں باپ سے لاکھوں روپے بھی وصول کئے جائیں گے اور اسماء کی عزت سے بھی کھیلا جائے گا۔ میں نے کہا۔ "تم اسماء اور اس کے والدین کے بارے میں اتنا کچھ بتا رہے ہو۔ اس کے گھر کا پتا تو بتاؤ۔"

"کیا تم وہاں جاؤ گے؟ اسماء کے بھائی اور بھابی اعتراض کریں گے۔ اس کے باپ علیم الدین شیخ نے کہا ہے کہ شادی جتنی جلدی ہوسکے' چپ چاپ راز داری سے کر دی جائے ورنہ بھائی اور بھابی رکاوٹیں پیدا کریں گے۔"

عالمگیر نے مجھے اس کے گھر کا پتا نہیں بتایا۔ اسماء نے پچھلی بار ایک ملاقات میں کہا تھا کہ انہوں نے وہ پہلا والا مکان چھوڑ دیا ہے اور اب وہ کسی دوسرے اسکول میں پڑھاتی ہے۔ میرے لئے یہ لازمی ہوگیا تھا کہ میں کسی طرح اسماء تک پہنچ کر اسے اس شادی سے روک دوں۔ اگر میں اس شادی پر اعتراض کروں گا اور عالمگیر وغیرہ کے خلاف کچھ بولوں

گا‘ کچھ کروں گا تو اس علاقے کا دادا میری جان کو آجائے گا۔

ان سب نے مل کر شادی دفتر کا بہت بڑا سیٹ اپ قائم کیا تھا۔ لڑکیوں کی شادیاں کرانے والے تھے۔ ان کے والدین اور سرپرستوں سے اچھی خاصی رقمیں وصول کرنے کے بعد ان لڑکیوں سے آگے بھی مال کمانے والے تھے۔ میں اس سیٹ اپ کے خلاف ایک آواز بھی اٹھاتا تو وہ مجھے قتل کردیتے۔

عالمگیر نے کہا۔ "اچھی طرح سوچ لو۔ میں نے تمہیں راز دار بنایا ہے۔ اگر تم اس لڑکی سے عشق کررہے ہو تو بڑی مصیبت میں پڑ جاؤ گے۔ دادا تمہیں ایک کے بعد دوسری سانس لینے نہیں دے گا۔"

میں نے کہا۔ "میں دادا کے خلاف جانے کی جرأت نہیں کروں گا۔ ہمارے درمیان معاملات طے ہو چکے ہیں۔ تم اس کے مطابق مجھے رقم دو گے۔ آج کی دیہاڑی مجھے دو۔"

اس نے مجھے سو روپے دیئے۔ میں اسے جیب میں رکھ کر چلا آیا۔ پہلی بار احساس ہوا کہ وہ سو روپے حرام کے ہیں۔ اوپری جیب میں جہاں وہ نوٹ رکھا تھا‘ وہاں وہ دل کے پاس انگارے کی طرح دہک رہا تھا۔ میں نے فٹ پاتھ پر چلتے چلتے اس نوٹ کو جیب سے نکال لیا۔ اپنی مٹھی میں دبالیا۔ میری مٹھی میں انگارا دہکنے لگا۔

آج سے نئی کہانی شروع ہورہی تھی۔ وہ پہلے دن کی کمائی تھی۔ میں اسے چھوڑ نہیں سکتا تھا۔ یہ مٹھی جلنے لگی۔ تو میں نے اسے دوسری مٹھی میں دبوچ لیا۔ کیوں ہورہی ہے جلن؟ اسماء سے میرا کیا رشتہ ہے؟ ایک طویل مدت گزر چکی تھی اور میں نے اس کی صورت بھی نہیں دیکھی تھی۔ خدا کو نہ دیکھنے سے کیا اس سے عشق نہیں رہتا؟ میں نہیں جانتا عشق کیا ہوتا ہے؟ کیسے اندر سے جلاتا ہے؟ پہلے میرے سینے میں جلن ہوئی۔ پھر ایک مٹھی میں انگارا دہکا۔ پھر دوسری مٹھی میں دہکنے لگا۔ میں نے گھبرا کر مٹھی کھول دی۔ مڑا تڑا ہوا سا نوٹ فٹ پاتھ پر گر پڑا۔ میں اس سے دور ہٹ گیا۔ اسے دور سے گھور گھور کر دیکھنے لگا۔ وہ لال رنگ کا نوٹ انگارے کی طرح دہک رہا تھا۔

ایک بوڑھے راہ گیر نے اسے اٹھالیا۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ کوئی اس نوٹ کا دعوے دار نہیں تھا۔ "مال مفت دل بے رحم" یہ قوم اسی تاک میں رہنے لگی ہے کہ راستہ چلتے روپے سے بھری ہوئی تھیلی یا نوٹوں سے بھرا ہوا بریف کیس مل جائے۔ کسی کا بھی مال ہو‘ ہمارے ہاتھ لگ جائے۔ وہ بوڑھا اسے جیب میں رکھ کر تیزی سے چلتا ہوا بھیڑ

میں گم ہوگیا۔

میں بس میں بیٹھ کر اس محلے میں آیا جہاں پہلے اسماء رہا کرتی تھی۔ میں نے وہاں محلے پڑوس والوں سے پوچھا۔ "وہ کس علاقے میں رہنے لگی ہے؟" بڑے شہروں میں ایک پڑوسی دوسرے پڑوسی کا نام تک نہیں جانتا پھر پتا کیا جانے گا۔ مجھے اس کے دوسرے مکان کا پتا معلوم نہیں ہوسکا۔

میں نے اس علاقے کے اسکولوں میں جاکر معلوم کیا۔ ایک اسکول میں پتا چلا کہ اسماء وہاں پڑھایا کرتی تھی لیکن مکان چھوڑتے وقت اسکول بھی چھوڑ دیا۔ یہ کوئی نہیں جانتا کہ وہ اب کس علاقے کے کس اسکول میں پڑھاتی ہے۔ دوسرے دن اسماء کے ماں باپ شادی دفتر میں مجھے دیکھنے آئے۔ وہاں عالمگیر اور اس کا ایک ماتحت بیٹھا ہوا تھا۔ میں ان کی موجودگی میں ان کے گھر کا پتا معلوم نہ کرسکا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ انہیں اسماء کے سلسلے میں میرے دلی جذبات کا پتا چلے۔ کسی طرح اسماء سے ملاقات ہوجاتی‘ وہ اپنے ماں باپ کو اس شادی دفتر میں جانے سے روک دیتی تو یہ سلسلہ آپ ہی آپ ختم ہوجاتا۔ وہ دادا اس کے علاقے میں جاکر داداگیری نہیں دکھا سکتا تھا اس لئے اپنے علاقے میں بلاکر پھانس رہا تھا۔

اس کے والدین نے مجھے پسند کیا۔ مجھ سے بہت سی باتیں کیں۔ پھر دس دن بعد شادی کی تاریخ مقرر کردی گئی۔ میں زندگی میں کبھی اس قدر پریشان نہیں ہوا تھا۔ پہلی بار اسماء کی فکر میں نیند اڑ گئی۔ نہ کھانے کو جی چاہتا تھا‘ نہ زندہ رہنے کو جی چاہتا تھا۔ دل اسے پکار رہا تھا۔ "کہاں ہو؟ ایک بار صورت دکھا دو۔ میں بے غیرت سہی‘ تمہیں بے آبرو نہیں ہونے دوں گا۔"

مجھے روز سو روپے مل رہے تھے۔ اگلے دس دنوں تک ملنے والے تھے۔ اس کے بعد لاکھوں روپے مل جاتے۔ میں اپنی دیرینہ خواہش کے مطابق بہت لمبا ہاتھ مار رہا تھا۔ مجھے اس کامیابی پر جشن منانا چاہئے تھا اور جشن تو سہاگ رات کو منانے ہی والا تھا۔ دولت بھی ہاتھ آئی۔ اسماء بھی آغوش میں آجاتی۔

ایک شام میں پارک میں بیٹھا ہوا تھا۔ وہاں اپنے ہم نام عادل محبوب سے سامنا ہوگیا۔ ایک بار پہلے بھی اس سے ملاقات ہوچکی تھی۔ وہ اپنی بیوی اور تین برس کے بیٹے کے ساتھ تھا۔ اس نے اپنی وائف سے کہا۔ "اسماء! اس سے ملو۔ اس کا نام بھی عادل

محبوب ہے۔ ایک بار اس نے کہا تھا کہ اس کی ہونے والی شریکِ حیات کا نام اسماء ہے۔ یہ بھی ایک عجیب اتفاق ہے۔"

اسماء نے کہا۔ "یہ کوئی عجیب اتفاق نہیں ہے۔ ہر ملک' ہر شہر اور ہر علاقے میں کتنے ہی ہم نام رہتے ہیں۔ چلو اچھا ہے' تمہیں باتیں کرنے کے لئے ایک ہم نام مل گیا ہے۔ میں بچے کو جھولا جھلانے جا رہی ہوں۔"

وہ بچے کے ساتھ چلی گئی۔ وہ میرے پاس بینچ پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "تم ابھی تک وہیں ہو' جہاں سے چلے تھے' کیا کر رہے ہو آج کل؟"

میں نے کہا۔ "تقدیر مذاق کر رہی ہے اور میں مذاق بن رہا ہوں۔ بڑی مدت کے بعد ایک لمبا ہاتھ مارنے کا چانس مل رہا ہے مگر میرے ہاتھ چھوٹے پڑ رہے ہیں۔"

"ایسا ہوتا ہے۔ جب کوئی اچھا چانس ملتا ہے تو چانس کے مطابق حوصلہ نہیں ملتا۔ اگر حوصلہ کر کے کامیابی حاصل کی جائے تو میری طرح دن رات بے چینی میں مبتلا رہنا پڑتا ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "کیا تم خوش نہیں ہو؟ پچھلی بار تم نے کہا تھا کہ تمہارا اپنا لاکھوں کا کاروبار ہے اور جلد ہی اسماء سے شادی کر کے کروڑ پتی بننے والے ہو۔"

"میں کروڑ پتی بن چکا ہوں۔ مگر پتا ہے' ہم زیادہ سے زیادہ دولت کیوں حاصل کرتے رہنا چاہتے ہیں؟"

میں نے کہا۔ "اپنے عیش و آرام کے لئے' اپنی عزت اور وقار کے لئے' دوسروں پر اپنی امارت کا رعب جمانے کے لئے' ایک اچھی زندگی گزار کر ایک اچھی موت مرنے کے لئے۔"

"موت کے بعد کروڑوں کی دولت اور جائداد کا کیا ہوتا ہے؟ کیا وہ ہماری رہتی ہے؟"

"ہماری اولاد کی رہتی ہے۔ اس دنیا میں ہماری اولاد رہتی ہے' ہمارا نام بھی رہتا ہے اور ہماری دولت بھی رہتی ہے۔ ہم دنیا سے نامراد نہیں جاتے۔"

اس نے دور ایک جھولے کی طرف اشارہ کیا۔ وہ بڑا سا دائرہ نما جھولا نیچے سے اوپر اور اوپر سے نیچے گھوم رہا تھا۔ اس نے کہا۔ "اس جھولے میں میری بیوی اپنے بچے کو جھلا رہی ہے۔"

میں نے کہا۔ "صرف اپنے بچے کو نہیں' تمہارے بچے کو بھی جھلا رہی ہے۔"

"یہی سوال میرے اندر چبھتا رہتا ہے کہ وہ میرا بھی ہے یا نہیں۔"

"کیا بات کرتے ہو' بیوی تمہاری ہے تو بچہ بھی تمہارا ہے۔"

"یہ کوئی ضروری نہیں ہے۔ ہانڈی ہمارے گھر میں پکتی ہے۔ مگر اس میں باہر کا مسالہ پڑتا ہے۔ ہم اس کھانے کو صرف اس لئے اپنا سمجھتے ہیں کہ وہ ہانڈی ہمارے نام سے منسوب ہو جاتی ہے۔"

"تمہاری بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔"

"اس میں سمجھنے کی کیا بات ہے' ہماری اونچی سوسائٹی میں اکثر بیویوں کے دن رات کا حساب ان کے شوہر نہیں کر پاتے۔ ایسی بھینسیں پتا نہیں کہاں کہاں سے چارہ کھا کر آتی ہیں اور اپنے گھر میں دودھ دیتی ہیں۔"

"بھینس کو برداشت کیا جاتا ہے۔ بیوی کو برداشت نہیں کیا جاسکتا۔ ایسی بیوی کو تو طلاق دے دینی چاہئے۔ تعجب ہے' وہ بچہ تین برس کا ہو گیا ہے اور تم ابھی تک صرف تلملا رہے ہو۔ اسے چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟"

"کیا تم لمبا ہاتھ مارنے کا خیال چھوڑ سکتے ہو؟ تم نیچی سطح سے اوپر آنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارتے رہتے ہو۔ میں اونچی سطح سے نیچے نہیں گر سکتا۔ میری وائف اسماء نے الکوحل اور نشیلی دواؤں کا پرمٹ حاصل کیا۔ ہم کروڑ پتی بن چکے ہیں۔ میری اسماء نے مجھے سال دو سال کی سزا سے بچایا ہے۔ اتنے پاپڑ بیلنے کے بعد وہ بچہ پیدا ہوا ہے۔ بچے سے انکار کرنے کا مطلب ہے کروڑ پتی بننے سے انکار کر دوں۔ اسماء سے بچے کا حساب لوں گا تو وہ مجھ سے طلاق لے لے گی۔ پھر اس ہانڈی کو دوسروں کے ساتھ میں نے بھی پکایا ہے۔ باقی پکانے والے لاتعلق ہیں۔ صرف میرے نام یہ کھانا ہے۔ کیا تم کروڑ پتی بیوی کے پکوان سے انکار کرو گے؟"

"تمہاری اسماء جیسی بیوی ملے تو انکار نہیں کروں گا۔ میں تو تمہاری سطح پر آنا چاہتا ہوں۔ میری اسماء جیسی بیوی ہو گی تو وہ ایسے راستے سے کروڑ پتی بنانے والے کے منہ پر تھوک دے گی۔ میں پریشان ہوں۔ اس کی آبرو کی سلامتی چاہتا ہوں۔ میں اس سے شادی کروں یا نہ کروں۔ وہ غلط ہاتھوں میں جانے والی ہے۔"

"بلندی پر تنہا چڑھنا پڑتا ہے۔ کسی کو ساتھ لے کر چڑھو گے تو وہ اپنے ساتھ تمہیں

بھی گرائے گی۔"

"میں یہی سوچتا تھا کہ اسماء کے ساتھ زندگی گزاروں گا تو ساری زندگی اسی پسماندہ علاقے میں رہوں گا۔ اس کا ایمان اور اس کی دیانت داری مجھے آگے بڑھنے نہیں دے گی۔ اب اس سے شادی کروں گا تو مجھے کم از کم دو ڈھائی لاکھ روپے ملیں گے لیکن وہ مجھ سے چھین لی جائے گی۔ میں اس سے محروم نہیں ہونا چاہئے۔"

"عجیب احمق ہو۔ تمہیں لاکھوں روپے مل رہے ہیں اور تم اسماء سے محروم نہیں ہونا چاہتے۔ آخر اس میں کیا بات ہے؟ کیا خوبی ہے؟"

"دیکھا جائے تو کوئی قابلِ ذکر خوبی نہیں ہے۔ وہ عام لڑکیوں جیسی ہے۔ اس کے پاس حسن اور وہی کشش ہے جو دوسری لڑکیوں میں ہوا کرتی ہے۔ میں نہیں جانتا کہ وہ مجھے کیوں اچھی لگتی ہے؟ وہ کب اور کن حالات میں مجھے متاثر کرتی رہی ہے؟ میں پرانا پاپی ہوں۔ عورتوں کو دیکھ کر نہیں للچاتا۔ ساری بازیاں میری کھیلی ہوئی ہیں۔ میں سچ کہتا ہوں۔ اس کے حسن کے لئے اس کے شباب کے لئے نہیں للچاتا ہوں۔ پتا نہیں یہ عشق کیا ہوتا ہے؟ کسی لالچ، کسی مقصد اور کسی وجہ کے بغیر اس کا اسیر بن چکا ہوں۔"

"پھر تو یہ عشق ہے۔ نہ سوچا نہ سمجھا۔ دیوانہ ہو گیا۔ اور دیوانے اگر پروانے بن جائیں تو آگ میں جل جاتے ہیں۔ سوہنی کا کچا گھڑا بن جائیں تو دریا میں اتر جاتے ہیں۔ تم کام سے گئے۔ پہلے ہی کوئی کام نہیں کرتے تھے۔ اب کیا کرو گے؟"

"میں تو یہ سوچنا ہی بھول گیا ہوں کہ مجھے اپنے لئے کیا کرنا ہے۔ میں تو دن رات اپنی اسماء کے لئے سوچ رہا ہوں۔ اسے ظالموں سے کس طرح بچاؤں گا۔ میں ان سے یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ میرے حصے کے دو ڈھائی لاکھ لے لو اور اسماء کو میری دلہن بن کر رہنے دو مگر وہ میری بات نہیں مانیں گے۔ پتا نہیں وہ آگے اس سے کتنا کمانے والے ہیں۔ وہ اب تک میری خاطر کنواری بیٹھی تھی۔ اب حالات سے مجبور ہو کر شادی کر رہی ہے۔ انجانے میں ایک بہت بڑے گڑھے میں گرنے والی ہے۔"

اس عادل محبوب نے کہا۔ "میں اکثر سوچتا ہوں کہ میرے پاس یہ دولت ہے۔ اس دولت سے دنیا کی ہر چیز حاصل کر لیتا ہوں لیکن ایسی باحیا لڑکی کہاں سے خرید کر لاؤں جسے کسی نے ہاتھ نہ لگایا ہو۔ جو صرف میری بن کر رہے۔ میرے پاس اس کے دن رات کا حساب رہے۔ وہ صرف میری اولاد پیدا کرے۔"

میں نے کہا۔ "اسماء جیسی باحیا لڑکیاں بہت ہیں۔"

"ہوں گی۔ مجھے عورت ذات پر بھروسا نہیں رہا ہے۔ جیسے تم اسماء کی پاک دامنی کی ضمانت دے سکتے ہو ویسے کسی دوسری لڑکی کی ضمانت نہیں دے سکتے۔ تمہاری اسماء کبھی کبھی، کسی کسی کو ملتی ہے۔ تم چاہو تو مجھے بھی مل سکتی ہے۔"

"میرے چاہنے سے تمہیں باحیا لڑکی کیسے ملے گی؟ کہاں سے ملے گی؟"

اس نے کہا۔ "میں خفیہ طور پر ایک شادی کرنا چاہتا ہوں۔ اپنے یقین کے مطابق اس سے اپنی اولاد پیدا کرنا چاہتا ہوں۔ میں اپنی دولت و جائداد اپنی خالص اولاد کو دینا چاہتا ہوں۔ ان کے حوالے سے مرنے کے بعد بھی زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ ہم یہی خالص کمائی دنیا سے کما کر جاتے ہیں۔ باقی ساری زندگی حرام کماتے رہتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم ساری عمر دو نمبر کام کرتے رہیں اور اولاد نمبرون پیدا کریں؟ اولاد بھی دو نمبر ہی ہو گی۔"

"اگر تم مجھ سے سودا کرو تو مجھے کم از کم اولاد خالص ملے گی۔"

"میں کیا سودا کروں؟ کیا کہیں سے ایک باحیا لڑکی ڈھونڈ کر لاؤں اور تم سے شادی کرا دوں؟"

"تم ڈھونڈ کر لاؤ گے ہیرا۔ وہ نکلے گی پتھر۔ تمہیں ڈھونڈنے کی کیا ضرورت ہے۔ تمہارے پاس تو وہ ہیرا ہے جسے پرکھنے کی ضرورت نہیں رہی ہے۔ تم اپنی اسماء کی شادی مجھ سے کرا دو۔"

"یہ کیا بکواس کر رہے ہو؟ میں اسے ظالموں سے نجات دلانا چاہتا ہوں۔ تم ایک اور ظالم بن کر اسے مجھ سے چھیننا چاہتے ہو۔"

"مجھے ظالم نہ کہو۔ میں تو اسے عزت اور دولت سب کچھ دینا چاہتا ہوں۔ وہ میری شریک حیات بن کر رہے گی تو غنڈے موالی اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکیں گے۔ کیا تم اسے غنڈوں سے بچا سکو گے؟ کیا تم میں اتنا دم خم ہے؟"

یہی بات مجھے پریشان کر رہی تھی کہ مجھ میں دم خم نہیں ہے۔ دم کیسے پیدا ہوتا ہے؟ حوصلہ کیسے ملتا ہے؟ قوت اور توانائی کس سرچشمے سے آتی ہے؟

رزقِ حلال سے' اے طائر لاہوتی! اندر سے جو توانائی ملتی ہے۔ وہ رزقِ حلال سے پیدا ہوتی ہے۔ اے طائر لاہوتی! جذبہ ایمانی ہو تو رزق شیطانی نہیں ہوتا۔ تیرے پروں کو

قوتِ پرواز ملتی ہے۔ یہ نہ ہو تو پرواز نیچی ہو جاتی ہے اور نیچی پرواز مکھیوں اور مچھروں کی ہوتی ہے۔

اے طائرِ لاہوتی! اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

میرے ہم نام عادل محبوب نے کہا۔ "کس سوچ میں پڑ گئے۔ سوچنا ہے تو یہ سوچو کہ اپنی اسماء کی بہتری چاہتے ہو۔ اسے تباہی سے بچانا چاہتے ہو۔ تم پتھروں سے ٹکرا ٹکرا کر سر پھوڑ لو گے مگر اسے نہیں بچا سکو گے۔ صرف میں ہی اسے تحفظ دے سکتا ہوں۔"

میں نے پوچھا۔ "تم اسے کیسے تحفظ دو گے؟ کیا وہ دادا اور اس کے غنڈے میری اسماء کو نقصان نہیں پہنچائیں گے؟"

"ان کی دادا گیری اپنے علاقوں میں چلتی ہے۔ وہ اتنی اونچی جگہ آ کر مجھ جیسے اونچے بندے سے نہیں ٹکرائیں گے۔ پھر بھی تم کہو گے تو میں شادی دفتر والوں کو' ان کے غنڈوں کو اچھی خاصی رقم دوں گا۔ انہیں ٹھنڈا کر دوں گا۔ تمہیں بھی اتنی رقم دوں گا کہ عیش کرتے رہو گے۔"

اس کی یہ آخری بات مجھے جوتے کی طرح لگی۔ میرے لاشعور میں یہ بات تھی کہ میں اسماء کو کسی کے حوالے کر کے عیش کرنے کے لئے یہ دولت حاصل نہیں کروں گا۔ ہاں' یہ ہو سکتا تھا کہ اپنے ہم نام عادل محبوب سے ایک پیسا بھی نہ لوں۔ اسماء تو یوں بھی شادی دفتر کے ذریعے کسی سے شادی کرنے والی تھی۔ بہتر ہوتا کہ وہ اس امیر کبیر عادل محبوب سے شادی کر لیتی۔ ایک شاندار خوش حال زندگی گزارتی رہتی۔

میں نے قائل ہو کر کہا۔ "تم درست کہتے ہو۔ مجھے اس کی بہتری کے لئے سوچنا چاہئے۔ میں تمام عمر اسے کچھ نہیں دے سکوں گا۔ تم اسے بہت کچھ دیتے رہو گے۔ اپنے اپنے نصیب کی بات ہے۔ وہ میری نہیں ہو گی۔ تمہاری ہو جائے گی۔"

میں نے اسے عالمگیر کے شادی دفتر کا پتا اور فون نمبر بتایا۔ پھر اسے سمجھایا۔ "اس سے میرا ذکر نہ کرنا ورنہ اسے شبہ ہو جائے گا کہ میں اس کا دھندا خراب کر رہا ہوں۔ اب شادی کو چھ دن رہ گئے۔ اگر تم نے آج کل میں کچھ نہیں کیا تو میں کم از کم اس سے شادی کر کے اسے یہ تو بتا سکوں گا کہ اس کے ساتھ کیسا فراڈ ہو رہا ہے۔ وہ میرے ساتھ راضی رہے گی تو میں اسے یہاں سے لے کر کہیں دور چلا جاؤں گا۔"

"اور وہاں جا کر اسے بھوکا مارو گے۔ تم فکر نہ کرو۔ میں اسماء کو غلط ہاتھوں میں نہیں جانے دوں گا۔ اس سے شادی کرنے کے بعد تمہیں اس سے ملاؤں گا۔"

"نہیں اب میں اس سے نہیں ملوں گا۔ تم وعدہ کرو۔ اس سے میرا ذکر نہیں کرو گے۔ اسے میرے سامنے کبھی نہیں لاؤ گے۔"

"تم اس کے لئے قربانی دے رہے ہو۔ اس کی خوشحالی کے لئے اس سے دستبردار ہو رہے ہو۔ اسے ایک نئی زندگی دے کر اس پر احسان کر رہے ہو۔ اسے یہ سب کچھ معلوم ہونا چاہئے۔"

میں نے کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔ "کاش' میں قربانی دیتا۔ اپنے ہیرو بننے کی خواہش اور چور دروازوں سے دولت مند بننے کی خواہشوں کی قربانیاں دے سکتا تو وہ بہت پہلے ہی میری شریکِ حیات بن چکی ہوتی۔ میں آج تک اس کے سر سے سہاگ کا ارمانوں بھرا خیالی آنچل نوچتا آیا ہوں۔ میں تو اسے منہ دکھانے کے قابل نہیں ہوں۔ آج کے بعد تم مجھ سے کبھی نہ ملنا۔"

اس کی وائف اسماء اپنے بچے کو اٹھائے پیار کرتی ہوئی واپس آ رہی تھی۔ میں وہاں سے اٹھ کر چلا آیا۔ یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آ گئی تھی کہ میرا زندگی گزارنے کا طریقہ غلط رہا ہے۔ وہ مجھے صحیح راستہ دکھا رہی تھی۔ میں اس کی دل جوئی کی خاطر اس کے راستے پر چلتا رہتا تھا مگر اپنی حرکتوں سے باز نہیں آتا تھا۔ اس کے بتائے ہوئے صحیح راستے پر چل نہ سکا۔ زندگی کی ایک اہم بازی میں اسے ہار رہا تھا۔

میں اپنی ہار دیکھ رہا تھا۔ اسماء کی جیت دیکھنے کے لئے دوسرے دن شادی دفتر گیا۔ عالمگیر دفتر میں نہیں تھا۔ کہیں گیا ہوا تھا۔ دوپہر کو واپس آیا۔ وہ بہت خوش تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھا۔ "جانتے ہو' میں کہاں گیا تھا؟ تمہارے ایک ہمنام سے ملنے گیا تھا۔ اس کا نام بھی عادل محبوب ہے۔ کہاں وہ اور کہاں تم؟ وہ کاروں کا بہت بڑا ڈیلر ہے۔ کروڑ پتی ہے۔ میری اس سے ایک بہت بڑی ڈیلنگ ہو رہی ہے۔ ابھی تم اپنی شادی کا معاملہ کینسل سمجھو۔ میں دوسرے معاملے میں مصروف رہوں گا۔"

میں نے انجان بن کر پوچھا۔ "کیا اسماء کے ماں باپ راضی نہیں ہیں؟"

"ہاں' کچھ ایسی ہی بات ہے۔ انہیں کوئی دولت مند داماد مل رہا ہے۔ تم فکر نہ کرو۔ ابھی کئی لڑکیوں کے رشتے ہیں۔ تمہیں یہاں سے مال کمانے کا موقع دیتا رہوں گا۔"

میں نے کرسی سے اٹھ کر کہا۔ ”میں کل سے یہاں نہیں آؤں گا۔ میں نے وہ کرائے کا مکان چھوڑ دیا ہے۔ میری تلاش میں وہاں نہ جانا۔ تمہیں مجھ جیسے کئی خوبرو جوان مل جائیں گے۔“

میں اس شادی دفتر کا راستہ بھول گیا۔ میں اور بہت کچھ بھول جانا چاہتا تھا۔ مجھے صرف وہ ہی باتیں یاد آنے لگی تھیں جو اسماء کیا کرتی تھی۔ وہ مجھے ایک مرد کی طرح محنت کرتے ہوئے دیکھنا چاہتی تھی۔ میں رکشا اور ٹیکسی کے مالکان سے ملنے لگا۔ ایک سیٹھ کی ٹیکسی چلانے لگا۔ مجھے صبح سے شام تک محنت کرنا منظور نہیں تھا۔ میں کہا کرتا تھا۔ اس طرح مسلسل محنت گدھے کرتے ہیں۔ اب ٹیکسی چلاتے وقت یہ احساس نہیں ہوا کہ میں گدھے کی طرح صبح سے شام تک اور کبھی رات گئے تک ٹیکسی چلا رہا ہوں۔

میں نے کرائے کا وہ مکان نہیں چھوڑا تھا۔ ایک رات میں نے خواب میں اسماء کو دیکھا تھا۔ وہ پھر اس دروازے پر آئی تھی۔ مجھ سے کہہ رہی تھی۔ ”دروازہ کھلا رکھنا۔“

بس اتنا کہا پھر چلی گئی۔ اس نے خواب میں یہ کہا تھا۔ مگر ایسا لگ رہا تھا۔ جیسے وہ پھر آئے گی۔ اسی لئے دروازہ کھلا رکھنے کو کہا ہے۔ اب ایسا سوچنا حماقت تھی۔ میں نے ایک بار عالمگیر سے ملاقات کی تھی۔ اس نے بتایا کہ بہت بڑا دھندا کیا ہے۔ اس نے اسماء کے ماں باپ سے معاملات طے کرکے اس کی شادی میرے نام سے کرائی ہے۔ اپنی توقع سے زیادہ مال کمایا ہے۔

بس اتنی معلومات کافی تھیں۔ اسماء نے ایک طویل عرصے تک میرا انتظار کیا تھا۔ اب وہ خوش نصیب سہاگن بن گئی تھی۔ یہ سوچنا ہی حماقت تھی کہ میں دروازہ کھلا رکھوں گا اور وہ کبھی آئے گی۔

میرے گھر میں کون سی دولت جمع کی ہوئی تھی کہ چور ڈاکو آتے اور چرا کر لے جاتے۔ میں خوامخواہ دروازے پر تالا لگایا کرتا تھا۔ صرف اتنا سوچتا تھا کہ دروازہ ہوا سے کھلا رہے گا تو گلی کے کتے اندر آئیں گے۔ اب وہ نہیں آئے گی' کبھی نہیں آئے گی۔ مجھے دروازہ کھلا نہیں رکھنا چاہئے تھا مگر کیا کرتا' وہ خواب اچھا لگا تھا۔ میں باہر جاتے وقت دروازے کی کنڈی لگاتا تھا لیکن تالا نہیں لگاتا تھا۔ آنے والی کنڈی کھول کر آسکتی تھی۔ کوئی آنے والی نہیں تھی۔

☆------☆------☆

میرا نام عادل محبوب ہے۔ کامیاب و کامران عادل محبوب۔ اس سے بڑی شادمانی اور کامرانی کیا ہوگی کہ میں ایک باحیاء اسماء کو دلہن بنا کر لے آیا تھا۔ میری پہلی وائف اسماء ڈیفنس میں رہتی تھی۔ میں نے دوسری وائف اسماء کے لئے سوسائٹی کے ایک مہنگے علاقے میں کوٹھی خریدی تھی۔ وہ کبھی سوچ نہیں سکتی تھی کہ اسے مجھ جیسا محبت کرنے والا دولت مند شوہر ملے گا۔

میں نے اس سے شادی سے پہلے ہی سوچ لیا تھا کہ میں کس طرح اسے اپنا پابند بنا کر رکھوں گا۔ اسے تنہا باہر جانے کی آزادی نہیں دوں گا۔ جب تک وہ میرے بچے کی ماں نہیں بنے گی۔ میں اس کی کڑی نگرانی کرتا رہوں گا۔ کوٹھی کے باہر مین گیٹ پر ایک چوکیدار تھا اور مالی تھا۔ انہیں کوٹھی کے اندر آنے کی اجازت نہیں تھی۔ اندر تین عورتوں کو ملازم رکھا تھا۔ دو عورتیں اسماء کی خدمت گزاری اور کوٹھی کی صفائی کے لئے تھیں۔

میری یہ دوسری وائف اسماء بہت فرمانبردار تھی۔ اسے پردہ کرنے کو کہتا تو وہ کرتی تھی۔ اسے حکم دیتا' اپنے میکے نہ جاؤ تو وہ نہیں جاتی تھی۔ کبھی بوڑھے ماں باپ' بھائی اور بھابی آتے تھے تو ان سے مل کر بہت خوش ہوتی۔ باقی وہ دوسرے رشتے داروں سے نہیں ملتی تھی۔ وہ میرے مزاج کو سمجھ گئی تھی اور میرے مزاج میں ڈھل گئی تھی۔

ایک برس گزرنے کے بعد اس نے ایک خوبصورت بیٹے کو جنم دیا تھا۔ میری خوشی کی انتہا نہیں تھی۔ میرا یہ بیٹا خالص تھا۔ دونمبر کمائی سے نہیں آیا تھا۔ ہم بھی کیا لوگ ہیں۔ اپنی نسل بھی دو نمبری پیدا کرتے ہیں۔ میں نے خوش ہو کر اسماء سے کہا۔ ”میں تمہیں انعام دینا چاہتا ہوں۔ مانگو' کیا مانگتی ہو؟“

اس نے کہا۔ ”میں ایک چھوٹی سی مگر اہم چیز مانگنا چاہتی ہوں۔ شاید آپ نہیں دے سکیں گے۔“

میں نے بچے کو چوم کر کہا۔ ”تم نے بے اعتمادی کے کیچڑ میں اعتماد کا یہ کنول کھلایا ہے۔ تم جو مانگو گی' وہ تمہیں دوں گا۔ آج میں بہت خوش ہوں۔“

”میں آپ کا اعتماد چاہتی ہوں۔ میں دیکھتی آرہی ہوں کہ آپ مجھ پر اعتماد نہیں کرتے۔ طرح طرح سے پابندیاں عائد کرتے ہیں۔ آپ ایسا نہ کریں۔ یہ عورت کی توہین ہے۔ تمام عورتیں ایک جیسی نہیں ہوتیں۔ آپ سمجھنا چاہیں تو سمجھ سکتے ہیں۔ پانچوں

انگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔"

"ہوس کے دسترخوان پر لقمہ اٹھاتے وقت پانچوں انگلیاں برابر ہوتی ہیں۔ ویسے میں تمہارے مزاج کو' تمہاری عادتوں کو سمجھ رہا ہوں۔ تم بہت اچھی ہو۔ اب میں تم پر کسی حد تک اعتماد کروں گا۔"

"آپ صرف اس حد تک اعتماد کریں کہ میں اس چاردیواری سے دوسری چاردیواری تک جاسکوں۔ ایک ہی چار دیواری میں دم گھٹنے لگا ہے۔"

"میں تمہیں حبس بے جا میں نہیں رکھنا چاہتا۔ تم کبھی کبھی میکے جانا چاہتی ہو؟"

"نہیں۔ میکے والے تو یہاں آجاتے ہیں۔ میں اسکول میں بچوں کو پڑھانا چاہتی ہوں۔ مجھے ہمیشہ سے بچوں کو پڑھانے کا شوق رہا ہے۔"

میں ناگواری سے بولا۔ "اسکول......... ٹیچنگ......... تم ٹیچر بنو گی؟ اب اپنی اونچی حیثیت کو سمجھو۔ میں لاکھوں روپے کماتا ہوں۔ میری ایک وائف' تمہاری سوکن کروڑپتی ہے اور تم اسکول میں بچوں کو پڑھاؤ گی؟ میرا مذاق اڑاؤ گی' میری عزت کا کچھ خیال ہے تمہیں؟"

"ٹیچنگ تو ایک مقدس پیشہ ہے۔ ہم بچوں کو تعلیم دیتے ہیں۔ ناخواندگی کے خلاف جہاد کرتے ہیں۔ تعلیم انسان کو خدا کے قریب کرتی ہے۔"

"ہم نے انسان کو خدا کے قریب کرنے کا ٹھیکا نہیں لیا ہے۔ کوئی ایسا کام کرو جو ہمارے شایان شان ہو۔"

"علم سیکھنا اور سکھانا ایمان ہے۔ ایمان میں ہی ہماری شان ہے۔ مگر آپ جانے دیں' میں نے پہلے ہی کہا تھا' جو مانگوں گی وہ آپ نہیں دیں گے۔"

"تم نے میرا اعتماد مانگا ہے۔ میں تم پر اعتماد کروں گا' کچھ اور مانگو۔ اپنی سوکن اسماء کی طرح کچھ حاصل کرتے رہنے کی تدبیریں کرتی رہو۔ سماجی خدمت گزاری میں وقت ضائع نہ کرو۔"

"میں آپ کی اسماء کے نقش قدم پر نہیں چلوں گی۔ میں اس سے مختلف ہوں۔ اسی لئے آپ نے مجھ سے شادی کی ہے۔ اس کی طرح ہوتی تو کیا مجھ سے شادی کرتے؟"

وہ اسماء کے بارے میں میرے خیالات میں جانتی تھی کہ میں اس سے ہونے والے بچے پر شبہ کرتا ہوں۔ اس نے دوسرے پہلو سے سوچ کر یہ کہا تھا کہ دونوں سوکنیں ایک

جیسی نہیں ہوسکتیں لیکن اس وقت مجھے ایسا لگا جیسے وہ اپنی سوکن کے بارے میں ایسی کوئی بات جانتی ہے۔

میں نے کہا۔ "تم کہنا کیا چاہتی ہو؟ خود کو اس سے مختلف کہہ رہی ہو۔ اختلاف کیا ہے' فرق کیا ہے؟"

"بہت بڑا فرق ہے۔ میں آپ کی پابندیوں میں رہتی ہوں' وہ نہیں رہتی۔ جتنا اعتماد مجھ پر کرتے ہیں' اتنا اس پر نہیں کرتے۔ گھر کی چار دیواری میں رہنے والی بیوی کی محبت خالص ہوتی ہے۔ ملاوٹ زدہ نہیں ہوتی۔"

وہ اپنی ذہانت سے وہ سب کچھ سمجھ رہی تھی' جو اسے بتایا نہیں گیا تھا۔ اس نے کہا۔ "میں آپ کے مزاج کے خلاف آزادی اور مختاری نہیں چاہتی۔ آپ مجھے کسی اسکول میں بھی نہ جانے دیں لیکن میں اپنا ایک اسکول بنا سکتی ہوں۔ ایک الگ' بہت بڑا سا اسکول' وہاں صرف لڑکیاں پڑھنے آئیں گی اور خواتین ٹیچرز پڑھایا کریں گی۔"

میں نے خوش ہو کر کہا۔ "یہ ہوئی نا کاروباری بات! آج کل اسکول کے کاروبار میں بہت منافع ہے پھر مہنگے علاقوں کے اسکول کی تعلیم تو یوں بھی مہنگی ہوتی ہے۔ بس ایک بار رقم لگانی ہوتی ہے۔ پھر ہر ماہ لاکھوں نہ سہی' ہزاروں روپے گھر آتے رہتے ہیں۔ تمہاری ٹیچنگ کا شوق پورا ہوگا۔ نیکی کی نیکی ہوگی' منافع کا منافع ہوگا۔"

اس علاقے میں میری چار ہزار گز کی زمین خالی پڑی تھی۔ اسماء میری اجازت سے وہاں ایک بہت بڑا اسکول' کمپیوٹر ٹریننگ سینٹر' لیبارٹری اور لائبریری کی عمارت تعمیر کرنے کی پلاننگ کرنے لگی۔ اس کی مرضی اور مزاج کے مطابق اسے بہت کچھ کرنے کا موقع مل رہا تھا۔ وہ بہت خوش تھی۔ میرے بچے کی پرورش اور اپنے پروجیکٹ میں مصروف رہنے لگی۔

میں نے ابتداء میں دوسری شادی کی بات پہلی بیوی اسماء سے چھپائی تھی۔ مگر ایسی باتیں چھپی نہیں رہتیں۔ اسے معلوم ہوچکا تھا' اس نے کہا۔ "تم نے مجھے دھوکا دیا ہے۔ دوسری شادی کی ہے۔ میرے لئے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں اپنی جگہ خوش ہوں۔ تمہاری دوسری اسماء اپنی جگہ خوش رہے گی۔ میں اپنی تمام دولت جائداد صرف اپنے پیٹ سے ہونے والی اولاد کے نام کروں گی۔"

"ٹھیک ہے۔ میں اپنی تمام دولت اور جائداد دوسری بیوی سے ہونے والے بیٹے

امجد عادل کے نام کروں گا۔"

"یہ ناانصافی ہوگی۔ مجھ سے ہونے والا احمد عادل آپ کا بھی بیٹا ہے۔ وہ بھی آپ کا وارث ہے۔"

"وہ مشکوک ہے۔ تمہیں برا تو لگے گا مگر تم خود سمجھ سکتی ہو۔"

وہ حیرانی سے بولی۔ "میں کیا سمجھوں، تم اپنے بیٹے کے بارے میں کیا کہہ رہے ہو؟ کیا ہے تمہارے دل میں؟"

میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "میں کیا بولوں؟ کیوں میری زبان کھلوانا چاہتی ہو۔ نادان تو نہیں ہو، میں جو کہہ رہا ہوں، اسے خوب سمجھ رہی ہو۔"

وہ ناگواری سے سخت لہجے میں بولی۔ "مرد کی طرح کھل کر بولو۔ تم میرے بیٹے کے بارے میں اب تک کیا سمجھتے آ رہے ہو؟"

"تم اسلام آباد میں راتیں گزار کر آئیں اور نشیلی دواؤں کا پرمٹ حاصل کر لیا۔ پھر ایک رات گزار کر آئیں اور مجھے دو سال کی سزا سے بچا لیا۔ پھر مجھے ماں بننے کی خوشخبری سنائی۔ کیا میں نادان ہوں، اتنا بھی نہیں سمجھ سکتا کہ وہ بیٹا میرا نہیں ہو سکتا اور ہو بھی سکتا ہے مگر مکسچر ہے۔"

وہ غصے سے بولی۔ "آئی ہیٹ یو۔ تم نے میری محبت اور دیانتداری کو بس اتنا ہی سمجھا ہے؟ میں تسلیم کرتی ہوں کہ میں نے کہیں راتیں گزاری ہیں۔ اس پہلو سے مجھے بے حیا کہہ سکتے ہو لیکن اپنے بیٹے احمد عادل کے معاملے میں دیانت دار ہوں۔ جس دن تمہیں حوالات سے رہائی دلائی، اسی دن سے مجھے ماہانہ تکالیف شروع ہو گئی تھیں۔ کیا بھول گئے کہ تم مجھے ڈاکٹر کے پاس لے گئے تھے؟ حساب تمہارے سامنے ہے عادل! یہ جو میرا پیٹ ہے، ایک ماں کا پیٹ ہے۔ میں نے پورے حساب سے تمہارے بیٹے کو جنم دیا ہے۔ ٹھوس ثبوت کے باوجود یقین نہیں کرو گے۔ میرے پیدا کئے ہوئے بیٹے کو کمتر بناؤ گے تو میں تم پر لعنت بھیج کر بیٹے کو یہاں سے لے جاؤں گی۔"

اس نے مجھے یاد دلایا تو یاد آیا۔ حوالات سے آنے کے دوسرے دن میں اسے لیڈی ڈاکٹر کے پاس لے گیا تھا۔ وہ ہر ماہ دو چار دنوں تک ایسی تکلیف میں مبتلا رہتی تھی۔ اس تکلیف سے آرام پانے کے بعد بیس پچیس دن گزر گئے تب اس نے بچے کی خوش خبری سنائی تھی۔ وہ بچہ میرا ہی تھا۔ میں نے کہا۔ "سوری میں نے تمہیں غلط سمجھا تھا۔"

"تم نے میرے اور اپنے بیٹے کو غلط سمجھا تھا۔ میں تو غلط ہوں، کھل کر کہتی ہوں۔ لیکن مجھ میں اتنی عقل ہے کہ اپنی اولاد میں ملاوٹ نہیں ہونی چاہئے۔"

میں نے تسلیم کر لیا۔ پہلی بیوی اسماء سے پیدا ہونے والا بیٹا خالص تھا۔ میرا اپنا تھا لیکن اپنا ہونے کے باوجود ایک عجیب طرح کی ناگواری تھی۔ پہلی بیوی بے شک میرے بیٹے کی ماں تھی مگر مصفا نہیں تھی۔ اس کا دل میرے لئے دیانت داری سے پاک تھا مگر بدن پاک نہیں تھا۔ وہ مجھ سے بہت محبت کرتی تھی۔ میں آخری دم تک اس کی محبت کا دم بھرتا رہوں گا لیکن معزز بیوی تو وہی ہوتی ہے جو اپنے دن رات کا حساب دیتی رہتی ہے۔

☆======☆======☆

میں آخری نٹ بولٹ کسنے کے بعد گاڑی کے نیچے سے نکل آیا۔ میرا لباس جگہ جگہ سے سیاہ داغ دار ہو رہا تھا۔ چہرے اور ہاتھوں پر کالک لگی ہوئی تھی۔ پہلے میں اسی لئے موٹر مکینک کا کام نہیں کرتا تھا۔ کپڑے بھی کالے ہو جاتے ہیں، منہ ہاتھ بھی کالے ہو جاتے ہیں لیکن جب میں غسل کرتا تھا اور دھلا ہوا لباس پہنتا تھا تو پہلے سے زیادہ اجلا ہو جاتا تھا۔ رزقِ حلال میں جو نور ہے، اس نور سے میری ہستی منور ہو جاتی تھی۔

میں بہت خوش رہتا ہوں۔ صرف ایک بات کا افسوس رہتا ہے کہ اپنی اسماء کو کھونے کے بعد عقل آئی۔ میری مردانگی نے چیلنج کیا کہ میں ایک لڑکی، صرف ایک لڑکی کے لئے کچھ نہ کر سکا۔ جب اسے آخری وقت آفات سے نہ بچا سکا تو اسے دوسرے عادل محبوب کے حوالے کر دیا۔ اگر میں پہلے سے ایک مستحکم رزق کھانے والے مرد کی طرح اپنے پیروں پر کھڑا رہتا تو آج اسماء میری شریکِ حیات بن کر رہتی۔

اب میں کس لئے محنت کر رہا ہوں؟

مرد بن کر رہنے کے لئے.......... میں اپنے گھر کا دروازہ کھلا رکھتا ہوں۔ وہ آئے یا نہ آئے۔ اس نے میری دنیا بدل دی ہے۔ دروازہ اس کے نام سے کھلا رہے گا۔ اس کی یادیں مجھے حوصلہ دیتی ہیں۔ وہ خوابوں میں آتی ہے اور کہتی ہے۔ "اسماء ایک لڑکی نہیں ہے، ایک محبت ہے۔ یہ محبت درس دیتی ہے اور طائرِ لاہوتی کو قوتِ پرواز دیتی ہے.........."

میں خیالات سے چونک گیا۔ ایک کار میرے قریب آ کر رکی۔ عادل محبوب نے کھڑکی

سے سر نکال کر دیکھا پھر قہقہہ لگاتے ہوئے پوچھا۔ "یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے؟ کیا یہاں نوکری کر رہے ہو؟"

میں نے کہا۔ "میرا اپنا چھوٹا سا گیراج ہے۔ پانچ برسوں سے محنت کرتے کرتے اتنا کچھ حاصل کیا ہے۔"

"معلوم ہوتا ہے' شادی نہیں کی ہے۔ بیوی بچے نہیں ہیں۔ اس لئے کچھ جمع کر کے یہ گیراج کھولا ہے۔ پھر ہیرا پھیری تو تمہاری پرانی عادت ہے۔ گاہک گاڑیوں کی ایک خرابی دور کرانے آتے ہوں گے' تم دس خرابیاں نکال کر انہیں نچوڑ لیتے ہوگے۔ بھئی مجھ پر رحم کرنا۔ ذرا چیک کرو گیئر پھنس رہا ہے۔ اس میں کوئی اور گڑبڑ نہ کرنا۔"

میں نے اس کی کار کا گیئر چیک کیا۔ اسے درست کیا پھر کہا۔ "تم کار کے ڈیلر ہو۔ جانتے ہو کہ گیئر کیوں پھنس رہا تھا۔ بہرحال اب تمہیں پرابلم نہیں ہوگی' میرے پندرہ روپے بنتے ہیں۔"

"صرف پندرہ روپے؟" اس نے جیب سے پچاس روپے کا نوٹ نکال کر دیا۔ پھر کار میں بیٹھنے لگا۔ میں نے باقی روپے اسے واپس کئے' وہ بولا۔ "رکھ لو۔ تم نے میرا لحاظ کیا ہے۔ کوئی دوسرا ہوتا تو اسے ستانہ چھوڑتے۔"

میں نے باقی رقم اس کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے کہا۔ "میں صرف محنت کے پیسے لیتا ہوں۔ ہم ویسے تو ہم نام رہیں گے مگر ہم مزاج نہیں رہیں گے۔ تم میری محنت اور حوصلہ دیکھ رہے ہو؟"

وہ بولا۔ "ہم' ہم نام کیوں ہیں؟ میرا یا تمہارا کوئی دوسرا نام بھی ہو سکتا تھا۔"

"ہمارے نام اور ہمارے مزاج ایک جیسے ہوتے ہیں۔ ہمارے ملک میں' ہمارے شہروں میں' ہماری گلیوں اور گھروں میں ہر تیسرا شخص عادل محبوب دو نمبر ہے۔ جھوٹ اور فریب کا پیدا کردہ رزق حاصل کرتا ہے اور ہر تیسری عورت اسماء ہے۔ تمہاری اسماء کی طرح خود غرض اور میری اسماء کی طرح بے غرض اور بے لوث۔"

"اسے اپنی اسماء نہ کہو۔ وہ میری شریکِ حیات ہے۔ تمہیں یہ سن کر یقین نہیں آئے گا کہ وہ میرے رنگ میں رنگی گئی ہے۔ ایک بہت بڑے اسکول کی مالکن اور ہیڈ مسٹریس ہے۔ ایجوکیشن بورڈ کے اعلیٰ عہدے داروں تک سلام دعا رکھتی ہے۔ نویں جماعت اور دسویں جماعت کے بورڈ کے امتحانات سے پہلے امتحانی پرچے جس پریس میں

شائع ہوتے ہیں' وہاں سے وہ پرچے حاصل کر لیتی ہے۔ اس کے اسکول کی طالبات نمایاں کامیابی حاصل کرنے کے لئے ایک ایک ہزار میں ایک ایک پرچہ حاصل کرتی ہیں۔ سب رئیس زادیاں ہوتی ہیں۔ ان کے لئے ہزار روپے کچھ نہیں ہوتے۔ اسماء ہر سال صرف نویں اور دسویں جماعتوں سے لاکھوں روپے کما لیتی ہے۔"

میں حیرانی سے یہ باتیں سن رہا تھا۔ یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ چور دروازوں کی کمائی سے نفرت کرتی تھی۔ مجھے بھی جھوٹ فریب سے باز رکھنے کی کوشش کرتی رہتی تھی۔ وہ ایسا کرے گی' ایک اسکول کھول کر چور راستوں سے لاکھوں کمائے گی' یہ یقین کرنے والی بات نہیں تھی۔ میں نے غصے سے کہا۔ "یہ جھوٹ ہے۔ میری اسماء کبھی ایسا نہیں کرے گی۔"

وہ بولا۔ "تمہاری اسماء! تمہاری اسماء کہاں سے آ گئی؟ میں اپنی اسماء کی بات کر رہا ہوں۔"

میں نے کہا۔ "سوری' وہ تمہاری اسماء ہے مگر وہ ایسی نہیں ہے۔ حرام نہیں کھاتی ہے۔"

"کیا ہم حرام کھاتے ہیں؟ بکواس نہ کرو۔ محنت مزدوری کرنے لگے ہو تو ہماری کمائی میں کھوٹ نظر آ رہا ہے۔ ورنہ تم بھی ایسی کھوٹی زندگی گزار رہے تھے۔"

"بھئی غصہ نہ کرو۔ اسماء کی بات کرو۔ میرا دل' میرا دماغ نہیں مانتا کہ وہ نیک کمائی بھول کر لمبے ہاتھ مار رہی ہے۔"

اس نے ڈیش بورڈ کے خانے سے ایک کارڈ نکال کر مجھے دیتے ہوئے کہا۔ "یہ اس کے اسکول کا پتا ہے۔ فون نمبر بھی ہے۔ جاؤ' اس سے ملو' باتیں کرو' یقین آ جائے گا۔"

وہ کار ڈرائیو کرتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ میں نے اس کارڈ کو پڑھا۔ اس پر اسماء عادل ہیڈ مسٹریس لکھا ہوا تھا۔ اسکول کا پتا اور فون نمبر درج تھا۔ میں نے پاس والی دکان سے اسے فون کیا۔ رابطہ ہونے پر دوسری طرف فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں انتظار کرنے لگا۔ پھر آواز سنائی دی۔ "ہیلو.........؟"

میں نے کہا۔ "ہیلو' تم اسماء بول رہی ہو؟"

اسماء نے سخت لہجے میں پوچھا۔ "تم کون ہو؟ بے تکلفی سے میرا نام کیوں لے رہے ہو؟"

مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ بہت پہلے اسے بے تکلفی سے اسماء کہہ کر مخاطب کیا کرتا تھا' میں نے کہا۔ "سوری' میں عجلت اور بے خیالی میں آپ کو ہیڈ مسٹریس کہنا بھول گیا۔ یہ بھی بھول گیا کہ آپ ایک امیر کبیر کار امپورٹر کی مسز ہیں اور وہ بسوں میں بیٹھ کر جانے والی اسکول ٹیچر نہیں ہیں۔"

"یہ کیا بکواس کر رہے ہو؟ کون ہو تم.........؟"

"تمہارے مجازی خدا عادل محبوب نے تمہارا یہ فون نمبر دیا ہے۔ تاکہ میں گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے والی سے دو باتیں کروں اور یہ یقین کروں کہ تم تعلیم کو کاروبار بنا کر لاکھوں کما رہی ہو۔"

دوسری طرف سے فون بند کر دیا گیا۔ میں نے ریسیور رکھ دیا۔ اس نے میری آواز نہیں پہچانی تھی۔ میرا بھولا ہوا نام یاد نہیں کیا تھا۔ اس کی بھی وہ پہلے جیسی آواز اور لہجہ نہیں رہا تھا۔ انسان کے تیور بدلتے ہیں تو اس کا سب کچھ بدل جاتا ہے۔

اس نے فون بند کر دیا تھا۔ مجھے بات کرنے کے قابل نہیں سمجھ رہی تھی۔ میں تو نیک کمائی والی اسماء کا لحاظ کر رہا تھا۔ اب تک ندامت سے اس کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مگر اب تو اسے نادم ہونا چاہئے تھا۔ خدا نے اسے دولت دی تھی۔ اسے اور نیکی اور دیانت داری کے راستوں پر چلنا چاہئے تھا مگر وہ تو مجھ سے بھی زیادہ گر گئی تھی۔

گیراج میں ایک گاڑی کھڑی ہوئی تھی۔ میں اس میں بیٹھ کر تیزی سے ڈرائیو کرتا ہوا اسکول کی طرف جانے لگا۔ میں اندر سے بہت تکلیف میں مبتلا ہو گیا تھا۔ جس کے نام سے زندہ رہنے اور زندگی کو مردانہ وار حوصلہ اور سچائیوں سے گزارنے کا عزم کر چکا تھا' وہی نیک کمائی کی نفی کر رہی تھی۔ میں اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ وہ مجھے پھول دے کر کانٹے کیوں خرید رہی ہے؟

اسکول پہنچا تو چھٹی کا وقت ہو چکا تھا۔ طالبات جا رہی تھیں۔ مردوں کو اندر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ میں نے چپراسی کو اپنا نام بتایا۔ میرا نام سن کر مجھے بلایا گیا۔ ایک بڑے سے آفس میں ایک خاتون ہیڈ مسٹریس کی کرسی پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ اس نے دوسری خاتون کو وہاں سے جانے کے لئے کہا پھر مجھ سے پوچھا۔ "اچھا' تو آپ عادل محبوب ہیں۔ میرے میاں نے ابھی بتایا ہے کہ آپ کی مہربانی سے میری شادی ہوئی ہے۔ آپ نے مجھے شادی دفتر کے فراڈ سے بچایا تھا۔"

میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "آپ تشریف رکھیں۔ میرے میاں واش روم میں ہیں۔ ابھی آتے ہیں۔ یہ محض ایک اتفاق ہے کہ آپ کا نام بھی عادل محبوب ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "آپ شادی سے پہلے اسکول میں پڑھایا کرتی تھیں؟"

"ہاں۔ یہ میرا شوق رہا ہے۔"

"لیکن آپ وہ نہیں ہیں جو آج سے آٹھ برس پہلے ناظم آباد میں رہا کرتی تھیں۔"

"میں کبھی ناظم آباد نہیں رہی۔"

عادل محبوب واش روم سے نکل کر تولئے سے منہ ہاتھ پونچھ رہا تھا۔ میں نے پوچھا۔ "یہ تمہاری وائف ہیں؟"

وہ بولا۔ "ہاں' یہ میری وائف اسماء بانو ہے' جس کے تم کبھی دیوانے تھے۔"

میں نے اچانک قہقہہ لگایا۔ وہ دونوں مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ میں دل کھول کر ہنستے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "یہ وہ اسماء نہیں ہے' جس کا میں دیوانہ تھا۔ یہ وہ نہیں ہے اور وہ یہ نہیں ہے۔ وہ تو صرف وہ ہے' جو کوئی نہیں ہو سکتی۔"

میں وہاں سے پلٹ کر تیزی سے جانے لگا۔ عادل محبوب نے آواز دی۔ مجھے اس کی آواز سنائی نہیں دی۔ مجھے کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ باہر گیراج کی گاڑی کھڑی ہوئی تھی۔ وہ بھی دکھائی نہیں دی۔ میں دوڑنے لگا۔ خوشی سے چھلانگیں لگانے لگا۔ میرے قریب سے گزرنے والے مجھے پاگل سمجھ رہے تھے۔ مجھ سے ٹکرانے سے اور میری چھلانگوں سے بچنے کے لئے دور ہٹتے جا رہے تھے۔

میرے اندر شور برپا تھا' اس کی شادی نہیں ہوئی ہے۔ میں اسے اپنے ہم نام کی سہاگن سمجھ رہا تھا مگر وہ کسی کی نہیں ہوئی تھی۔ وہ میری تھی۔ اس نے کہا تھا کہ میں نے خود کو اس کے قابل نہ بنایا تو مجھ سے دور ہو جائے گی لیکن کنواری رہے گی۔ آخری سانس تک میرے نام سے زندہ رہے گی۔

میں ایک میدان میں آ کر گھاس پر گر گیا۔ چاروں شانے چت ہو کر ہانپتے ہوئے نیلے آسمان کو دیکھ کر دونوں ہاتھ اٹھا کر چیخنے لگا۔ "وہ زندہ ہے۔ جہاں بھی ہے' میرے نام سے زندہ ہے.........."

اس سے بچھڑ کر آٹھ برس گزر چکے تھے۔ میں نے اس دوران میں اس کی پرچھائیں

بھی نہیں دیکھی تھی۔ مگر میرا دل کہہ رہا تھا' وہ میرے لئے کہیں زندہ ہے۔ میرا خواب سچا تھا۔ اس نے کہا تھا۔ "دروازہ کھلا رکھنا.........."

اور میں دروازہ کھلا رکھتا تھا۔ یہ میرے اعتماد کی سچائی تھی کہ میں اپنی پچھلی تمام غلطیوں کی تلافی کرتا رہوں گا۔ اپنی دلربا کے مزاج کے مطابق رزقِ حلال کے لئے محنت و مشقت کرتا رہوں گا تو خدا کبھی نہ کبھی مجھے انعام ضرور دے گا۔

میں تھوڑی دیر تک گھاس پر اِدھر سے اُدھر لوٹتا رہا۔ پھر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اب ایک ہی کام رہ گیا تھا' اسے تلاش کرنا۔

میں تلاش کرنے لگا۔ گیراج میں میرے ملازم کام کرتے تھے۔ میں صبح نکلتا تھا' شام کو آتا تھا۔ گیراج بند کرکے پھر اس کی تلاش میں بھٹکنے لگتا تھا لیکن وہ کہاں مل سکتی تھی؟ ناظم آباد والا مکان آٹھ برس پہلے چھوڑ دیا تھا۔ شہر کے ہر علاقے کے تمام اسکولوں میں جاکر اس نام کی ٹیچر کو پوچھ رہا تھا۔ وہ نہیں مل رہی تھی۔ شاید پڑھانا چھوڑ دیا تھا۔ کوئی دوسری ملازمت کررہی ہوگی۔

چھ ماہ کے دوران میں نے کوئی اسکول نہیں چھوڑا۔ پھر ان ملوں اور فیکٹریوں میں جانے لگا' جہاں عورتیں کام کرتی تھیں۔ کتنے ہی چہرے نظر آتے تھے۔ وہ ایک چہرہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ "میری ماؤ! میری بہنو! دعا کرو' وہ مجھے مل جائے۔"

میں نے اخبارات میں اشتہارات کے کالموں میں اسے پکارا۔ "اسماء! کہاں ہو' آجاؤ۔ میں بہت پریشان ہوں۔ اپنا پتا لکھ رہا ہوں اور میرے اس گھر کا دروازہ بھی کھلا رہتا ہے.........."

"میں اور کہاں ڈھونڈوں؟ یا خدا! ڈھونڈنے سے تو نہیں ملتا' اسے تو ملنے دے.........."

ایک جگہ اور رہ گئی تھی۔ میں شہرِ خموشاں میں آگیا۔ ایک ایک قبر کے کتبے کو پڑھتا گیا۔ کسی بھی کتبے پر میری اسماء کا نام نہیں تھا۔ وہ میرے لئے زندہ تھی۔ خدا جانے کہاں سانسیں لے رہی تھی۔

میں ایک قبر کے سرہانے بیٹھ گیا۔ اسے تلاش کرتے کرتے ایک برس چار ماہ گزر چکے تھے۔ مجھے تھکن کا احساس نہیں تھا۔ میں تو دم لئے بغیر اسے تلاش کرتا ہی رہوں گا۔ ابھی ذرا بیٹھ گیا تھا۔ آسمان سیاہ ہورہا تھا۔ بارش ہونے لگی تھی۔ میں بھیگ رہا تھا۔ عشق

میں بھیگ رہا تھا۔ "میرے بھائیو! میرے بزرگو! دعا کرو۔ اگر زبان پاک نہیں ہے' رزق پاک نہیں ہے تو پاک کرو' میرے لئے پاک کرو' دعا کرو۔ وہ مجھے مل جائے' کہیں نہ کہیں مل جائے۔ اگر نہ ملے تو نہ سہی۔ جہاں رہے' سلامت رہے' شاد و آباد رہے.........."

"جب زبان پر رزقِ پاک ہوتا ہے تو دعاؤں کو شرفِ قبولیت حاصل ہوتا ہے۔ مہنگائی کے دوزخ میں زندہ رہنے والو! میں بھی تمہارے لئے دعا کرتا ہوں۔ خدا کرے' تمہاری زندگی میں بھی کوئی اسماء آئے اور جینے کا ڈھنگ شیطانی ہو تو ایمانی کردے.........
آمین!"

میرا ایمان ہے' وہ مجھے ضرور ملے گی۔

☆======☆======☆

دو پاٹن کے بیچ

وہ لوگوں کے ہجوم کو چیرتا ہوا آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ کبھی گرتا' کبھی سنبھلتا' کبھی کسی سے ٹکرا جاتا۔ اس ہجوم میں ایک شناسا چہرہ اسے چھب دکھا کر نہ جانے کہاں کھو گیا تھا؟ وہ دیوانہ وار اسے تلاش کر رہا تھا۔ وہ یقین اور بے یقینی کی کیفیت میں مبتلا تھا۔ آنکھیں کہہ رہی تھیں' وہ تھی' وہی تھی' ابھی یہاں اس بھیڑ میں کہیں تھی مگر ذہن تسلیم نہیں کر رہا تھا۔ اسے فریبِ نظر کہہ رہا تھا اور تسلیم کرتا بھی کیسے؟

وہ تو مر چکی ہے' ہاں۔ وہ اب اس دنیا میں نہیں رہی۔ کیا کبھی مردے بھی زندہ ہو سکتے ہیں؟ نہیں۔ عقل تسلیم نہیں کر رہی تھی مگر دل اور نگاہیں ایک بار پھر اس کی ایک جھلک کے لئے بھٹک رہی تھیں۔

چاند رات کے باعث بازار میں بہت بھیڑ تھی۔ ہر طرف سے مول تول کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ کتنے ہی لوگوں کی نظریں آسمان کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ لوگوں کو اپنے اعمال نظر نہیں آتے لیکن وہ لاکھوں میل دور سے نظر آنے والے بال جیسے باریک چاند کو دیکھ لیتے ہیں۔ اپنے عیبوں سے نظر چرا کر صرف مسرتوں کا چہرہ دیکھنا اچھا لگتا ہے۔ وہ بھی عقل کو نظرانداز کر رہا تھا' حقیقت سے کترا رہا تھا۔ سچ کڑوا ہوتا ہے' اسی لئے وہ اب اسے دیکھنے کے بعد مردہ تصور نہیں کرنا چاہ رہا تھا۔

اس کی آواز کا ترنم اور لہجے کی کھنک علی کے کانوں میں سرگوشیاں کر رہی تھی۔

"علی! میں تمہاری اسی دنیا میں ہوں۔ ان ہواؤں کو سمجھو' محسوس کرو۔ میری سانسوں کی سرگم ہواؤں کے دوش پر تمہاری سانسوں تک پہنچ رہی ہے۔"

وہ گہری گہری سانسیں لینے لگا' اسے اپنے اندر کھینچ لینا چاہتا تھا۔ وہ عورتوں اور مردوں کی بھیڑ سے گزرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ اسے نہ تو چاند رات کی خوشی تھی اور نہ ہی خریداری کرنی تھی۔ وہ تنہائی سے گھبرا کر اس ہجوم میں آ گیا تھا۔ دوسروں کی خوشیوں

سے خود کو بہلانا چاہتا تھا۔ دانشور کہتے ہیں۔ "اگر اپنے نصیب میں خوشیاں نہ ہوں تو دوسروں کی خوشیوں میں ان کا ساتھ دو۔ تمہارے سامنے ایک عورت یا معصوم بچہ مسکرائے گا تو بے اختیار تمہارے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ آجائے گی۔"

فکر اور صدمے سے کبھی کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا' دانائی یہ ہے کہ کہیں بھی کسی طرح بھی مسکرانے کا بہانہ ڈھونڈا جائے۔ کبھی کبھی ایک مختصر سا تبسم بھی ذہن کے دریچے کھول دیتا ہے۔ زخم پر مرہم لگا دیتا ہے۔ تبسم کی مسیحائی مقدر بدل دیتی ہے۔

ایک جھلک میں دکھائی دینے والے اس چہرے کے تبسم نے علی کے ذہن کے تاریک گوشوں کو روشن کر دیا تھا مگر اس روشنی میں وہ اس چہرے کو دوبارہ نہ دیکھ سکا۔ اس نے تلاش روک دی۔ ذہن کی بات تسلیم کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ واقعی یہ ناممکن ہے' مردے زندہ نہیں ہوتے۔ جو اپنے پیاروں کو روتا ہوا چھوڑ جاتے ہیں وہ کبھی ان کے آنسو پونچھنے واپس نہیں آتے۔

وہ اس حقیقت کو تسلیم کر کے تھکے ہوئے انداز میں خریداری میں مصروف لوگوں کو دیکھنے لگا۔ آج ماضی کی یادیں تازہ ہو گئی تھیں۔ اسے بے چین کرنے کے لئے ایک ایک کر کے اس کے ذہن میں ابھرنے لگی تھیں۔ اس نے ان سے نظریں چراتے ہوئے اپنی آنکھیں بند کر لیں لیکن دل و دماغ میں ابھرنے والے منظر تو بند آنکھوں سے مزید صاف دکھائی دینے لگتے ہیں۔

اس کا نام سبیکا تھا۔ وہ واقعی اپنے نام کے معنی کی طرح پگھلی ہوئی چاندی تھی۔ پانی کی طرح بنا اجازت دوسروں کے دلوں میں جگہ بنا لیتی تھی۔ وہ بہت زیادہ حسین و جمیل نہیں تھی مگر بلا کی کشش رکھتی تھی۔ باتوں سے ذہانت جھلکتی تھی۔ آنکھوں میں جھیل سے زیادہ گہرائی تھی۔ لہجے میں اپنائیت ایسی کہ جس سے بات کرتی وہ اس کا گرویدہ ہو جاتا۔ امیر گھرانے سے تعلق رکھنے کے باوجود اس کی طبیعت میں عاجزی اور انکساری کا پہلو نمایاں تھا۔

وہ خودنمائی سے کتراتی تھی۔ آج کل کے ماڈرن زمانے میں بالوں کو کٹوانا' فیشن ایبل لڑکیوں نے اپنا سمبل بنا رکھا ہے مگر سبیکا ان میں سے نہیں تھی۔ اس کی کمر سے نیچے لہراتے بال ایسی ماڈرن لڑکیوں کو بھی اپنی طرف متوجہ کر لیتے تھے جو بالوں کو تراش کر اپنے

چہروں کو "ماڈرن لُک" دیتی تھیں۔

پتلی کمر پر سانپ کی طرح لہراتی' بل کھاتی چوٹی کالج کے لڑکوں کو ڈستی رہتی تھی۔ کتنے ہی دل تھے جو ان زلفوں کے سائے میں آ کر دھڑکنا چاہتے تھے۔ ان بہت سے دلوں میں ایک دل علی کا بھی تھا۔

علی سیکنڈ ایئر کا اسٹوڈنٹ تھا جبکہ سبیکا بی اے فائنل ایئر کی اسٹوڈنٹ تھی۔ وہ کلاسز میں اس سے جونیئر تھا۔ ظاہر ہے عمر میں بھی جونیئر ہی تھا مگر باڈی بلڈنگ کے باعث اپنی عمر سے بڑا اور بھرپور جوان دکھائی دیتا تھا۔ کتنی ہی لڑکیاں اس کی جسمانی کشش کو دیکھ کر آہیں بھرنے لگتی تھیں۔ اس چٹان جیسے سینے والے مرد کو اپنا محافظ بنا لینا چاہتی تھیں۔ علی بہت ذہین اور محنتی لڑکا تھا' وہ ان چکروں میں پڑ کر اپنا وقت برباد کرنے کے بجائے تعلیم پر زیادہ توجہ دیتا تھا مگر سبیکا نے اس کے خیالات بدل ڈالے تھے۔ نہ جانے وہ کب سے اس کالج میں تعلیم حاصل کر رہی تھی؟

علی اور سبیکا کا ٹکراؤ اس وقت ہوا تھا جب وہ فرسٹ ایئر کا ایڈمیشن فارم لینے آیا تھا۔ اس دن صبح سے آسمان پر گہری کالی گھٹائیں اٹھلاتی پھر رہی تھیں۔ ہوا میں خنکی تھی۔ موسم کا یہ مزاج تقریباً سب ہی کے دلوں کو لبھاتا ہے۔ اس لئے کالج کے تقریباً تمام ہی اسٹوڈنٹس حاضر تھے۔

علی بس سے اترا تو ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ کالج کے مین گیٹ تک آتے آتے پھوار تیز بارش میں تبدیل ہو گئی۔ وہ بارش سے بچنے کی خاطر تیزی سے چلتا ہوا مین گیٹ سے اندر داخل ہوا۔ لان میں ٹہلنے والے اور باہر سے آنے والے تمام اسٹوڈنٹس کی کوشش کی تھی کہ وہ جلد از جلد کالج کی عمارت میں داخل ہو جائیں۔ عجیب افراتفری کا عالم تھا۔ ایسے وقت اچانک کوئی اس کی پشت سے آ ٹکرایا۔ سانسوں کی آنچ کان کی لو سے گردن تک پھیلتی چلی گئی۔ گداز سینے کا لمس اس کے اندر سنسنی سی پیدا کر رہا تھا۔

اس ایک لمحے نے علی کو نہ جانے کس دنیا میں پہنچا دیا تھا؟ اس کے آس پاس کا سارا منظر دھندلا گیا تھا' گہری خاموشی چھا گئی تھی۔ صرف بارش کا شور سنائی دے رہا تھا' یا پھر اجنبی اور بے ترتیب دھڑکنوں کی آہٹ!

اچانک ہی یہ خوابیدہ سلسلہ رک گیا۔ ایک مترنم سی آواز علی کی سماعت سے

ٹکرائی۔ "سوری۔"

اجنبی دھڑکنوں کا احساس ختم ہو گیا۔ وہ اس سے علیحدہ ہو گئی۔ اردگرد کا سارا منظر واضح طور پر دکھائی دینے لگا۔ علی نے گردن گھما کر بائیں جانب دیکھا۔ سبیکا نظریں جھکائے' جھینپی جھینپی سی تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ وہ ایک دنیا سے نکل آیا تھا مگر سبیکا کے بھیگے حسن نے اسے ایک اور دنیا میں پہنچا دیا۔ بدن سے چپکا ہوا لباس اس کے جسمانی اتار چڑھاؤ کو واضح کر رہا تھا۔ بل کھاتی ہوئی کمر پر اِدھر سے اُدھر لہراتی ہوئی چوٹی اسے ہپناٹائز کر رہی تھی۔

وہ جہاں تھا' وہیں ٹھہر گیا۔ وہاں تمام اسٹوڈنٹس کی منزل کالج کی عمارت تھی مگر علی کو ایسا لگ رہا تھا' جیسے اس نے اپنی حقیقی منزل پالی ہے۔ وہ مل گئی ہے' جسے دل ڈھونڈتا رہا تھا۔

اچانک وہ چونک گیا۔ پیچھے سے آنے والی کار کے ہارن نے اسے خیالات کی دنیا سے باہر لا پھینکا۔ وہ انسانوں کے ہجوم میں تھا اور اس ہجوم میں سبیکا کے لئے بھٹک رہا تھا۔ ابھی ابھی وہ چوڑیوں کی دکان کے پاس دکھائی دی تھی پھر نگاہوں سے اوجھل ہو گئی تھی۔ سب ہی کو امید تھی کہ آج چاند نظر آئے گا۔ وہ بھی اپنے چاند کے پیچھے دوڑ رہا تھا اور وہ نظر نہیں آ رہا تھا۔

انتیس روزے ہو چکے تھے۔ اکثر انتیس روزوں کے بعد ہی چاند کی نوید سنائی جاتی ہے۔ چھوٹے بڑے سارے دکان دار دل ہی دل میں دعائیں مانگتے ہیں کہ انتیس کا چاند نہ ہو' تیس کا چاند ہو گا تو وہ ایک دن کے اضافے سے ہزاروں لاکھوں کی دکانداری کر سکیں گے۔

علی اس بھیڑ میں تنہا اِدھر سے اُدھر بھٹک رہا تھا۔ وہ بیس برس کا قدآور صحت مند جوان تھا۔ اسے دیکھ کر یہ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ چاند رات کے اس میلے میں اپنوں سے بچھڑ گیا ہے۔ ہاں.......... مگر یہ ضرور تھا کہ وہ زندگی کے میلے میں اپنی جانِ حیات سے بچھڑ گیا تھا۔

اکثر وہ خیالوں میں چپ چاپ چلی آتی تھی۔ اس کی گردن میں بانہیں ڈال کر سماعت میں رس گھولنے لگتی تھی۔ "کیا ہوا..........؟ اگر تم مجھے بازوؤں میں نہیں لے

سکتے' میں تو تمہیں بانہوں میں لے لیتی ہوں۔ میں تمہارے خوابوں میں ہوں اور جاگتی آنکھوں میں بھی' کسی نہ کسی بہانے تمہارے ساتھ رہتی ہوں۔ غم نہ کرو۔ کیا یہ کم ہے کہ مجھے چھو نہیں سکتے مگر پھر بھی مجھے پا لیتے ہو۔ علی..........! مجھے یادوں میں پکارو' میں چلی آؤں گی مگر میرے وجود کو نہ پکارو۔ تمہاری یہ آرزو پوری کرنا میرے بس میں نہیں ہے۔"

علی یہ سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی کہ وہ اب اس دنیا میں نہیں ہے' اس کا وجود مٹی ہو چکا ہے پھر بھی اکثر اسے تلاش کرنے کے لئے اِدھر اُدھر بھٹکنے لگتا تھا مگر آج رات تو اسے ایسا لگا تھا' جیسے وہ زندہ ہے۔ اپنے خوبصورت وجود کے ساتھ اس دنیا میں موجود ہے۔

اچانک وہ آگے بڑھتے بڑھتے ٹھٹک گیا۔ اس کے کانوں میں سبیکا کے باپ سیٹھ عبدالقادر سومرو کے طنز میں ڈوبے جملے گونجنے لگے۔ "کیوں میری بیٹی کے پیچھے دوڑ رہے ہو۔ وہ تیس لاکھ کی گاڑی میں بیٹھ کر آتی جاتی ہے۔ اس مہنگی گاڑی کے پیچھے دوڑو گے تو ٹھوکر کھا کر اوندھے منہ گرو گے۔ میری بیٹی ایک دن میں ہزاروں لاکھوں کی شاپنگ کرتی ہے۔ تم بتاؤ۔ تمہاری ماہوار آمدنی کتنی ہے؟ کیا تم میری بیٹی کے اخراجات پورے کر سکتے ہو؟ جس دن ہماری برابری کا دعویٰ کر سکو' اس دن چلے آنا۔ فی الحال تو تمہاری اوقات ہمارے پاؤں کی جوتی سے بھی کم ہے۔"

علی کے کانوں میں سیٹھ عبدالقادر سومرو کی طنزیہ باتیں گونج رہی تھیں۔ وہ ایک جگہ ٹھہر کر چاروں طرف نظریں دوڑا رہا تھا' اور وہ سوچ رہا تھا۔ "اب تو میں اس قابل ہو گیا ہوں کہ سبیکا کی مہنگی گاڑی کے پیچھے اپنی کار دوڑا سکوں۔ اب میں دو کمروں کے فلیٹ کے بجائے' ایک کوٹھی کا مالک بن گیا ہوں۔ میں نے اپنے اکاؤنٹ میں اتنی رقم جمع کر لی ہے کہ سبیکا کو اپنے باپ کے سامنے ہاتھ پھیلانے کی ضرورت محسوس نہیں ہو گی مگر..........
جب میں اس قابل ہو گیا ہوں تو قدرت نے سبیکا کو مجھ سے دور کر دیا ہے لیکن..........
جب وہ زندہ نہیں ہے تو پھر مجھے اس بازار کے ہجوم میں جیتے جاگتے انسان کی طرح کیوں نظر آئی تھی؟"

وہ ایک بار پھر دیوانہ وار اس وسیع و عریض بازار کے ایک سرے سے دوسرے

سرے تک سبیکا کو تلاش کرنے لگا۔ نہ جانے کتنی ہی دیر وہ بھٹکتا رہا۔ بازار کی بھیڑ میں کمی آ گئی تھی۔ فجر کی اذان سن کر دکاندار دکانیں بند کر رہے تھے۔ عید کی نماز ادا کرنی تھی، لیکن کچھ منافع خور دکاندار اب بھی کسی گاہک کے انتظار میں دکانیں کھولے بیٹھے تھے۔ بازار میں خریدار برائے نام رہ گئے تھے۔

علی سوچنے لگا۔ "اب تو ہجوم بھی کم ہو گیا ہے۔ وہ یہاں ہوتی تو آسانی سے نظر آ جاتی۔ اگر وہ زندہ ہے اور یہاں شاپنگ کے لئے آئی تھی تب بھی اس وقت تک تو وہ واپس جا چکی ہو گی۔"

اس نے ایک بار پھر سرسری سی نگاہ بازار پر ڈالی مگر نگاہیں مایوس ہو کر پلٹ آئیں۔ وہ نڈھال ہو کر گھر واپس آ گیا۔ بیڈ روم کی دیوار پر آویزاں سبیکا کی بڑی سی تصویر کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔

وقت گزر جاتا ہے، لوگ گزر جاتے ہیں، ان کی یادیں رہ جاتی ہیں۔ کبھی تصور کی صورت میں، کبھی تصویر کی صورت میں۔ اس تصویر نے یادوں کو اور بھڑکا دیا اور وہ عمر رفتہ کو آوازیں دینے لگا۔

☆======☆======☆

وہ فرسٹ ایئر کا ایڈمیشن فارم لینے کالج پہنچا تو تیز بارش نے اسے سبیکا سے ملوا دیا۔ اس دن کالج میں فارم حاصل کرنے والوں کا ہجوم تھا لیکن سب کو مایوسی ہوئی۔ وہاں نوٹس بورڈ لکھا ہوا تھا کہ فرسٹ ایئر کے ایڈمیشن فارم دوسرے روز ملیں گے۔

اب اسے فارم حاصل کرنے کی عجلت نہیں تھی۔ وہ اسٹوڈنٹس کے ہجوم میں اسی چہرے کو تلاش کرنے لگا جس سے بارش کے باعث ٹکراؤ ہوا تھا۔ بہت سے چہرے دکھائی دے رہے تھے مگر وہ چہرہ کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ اسے اب تک واپس چلے جانا چاہئے تھا مگر ایک لگن تھی جو اسے روک رہی تھی۔

وہ اب تک اپنی پشت پر گداز سینے کی دھڑکن محسوس کر رہا تھا۔ اس ایک لمحے نے علی کی دنیا بدل ڈالی تھی۔ بوجھ کسی کو بھی اچھا نہیں لگتا مگر جوانی کا بوجھ اٹھانے سے کوئی کافر انکار نہیں کرتا۔

وہ کالج کینٹین میں آ کر بیٹھ گیا۔ اجنبی سانسوں کی تپش اب بھی اس کی گردن کو گرما

رہی تھی۔ جذبات کے الاؤ کو دہکا رہی تھی۔ وہ زندگی میں پہلی بار نسوانی لمس سے آشنا ہوا تھا اور یہ شناسائی اسے دیوانہ بنا رہی تھی۔ وہ بہت ریزرو رہنے والا لڑکا تھا۔ لڑکیوں سے کتراتا تھا بلکہ بیزار رہتا تھا۔ اس نے اسکول لائف میں کبھی کسی لڑکی کو نظر بھر کر نہیں دیکھا تھا۔ آج پہلی بار ایک چہرہ سامنے آیا تھا۔ وہ بھی چند لمحوں کے لئے۔ اس نے گردن گھما کر دیکھا تو وہ ٹکرانے کے باعث جھینپ گئی تھی۔ اس سے نظریں چرا کر چلی گئی تھی۔

حسین چہروں کو زندگی بھر دیکھتے رہو۔ کوئی تاثر پیدا نہیں ہوتا، اس کے برعکس ایک لمحے میں جھلک دکھا کر گم ہو جانے والا چہرہ حواس پر چھا جاتا ہے۔

وہ بھی اپنے حواسوں میں نہیں تھی۔ ایئر کنڈیشنڈ کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی اجلے شیشوں پر بہتے ہوئے شفاف قطروں کو دیکھ رہی تھی۔ آج صرف باہر بارش نہیں ہو رہی تھی اس کے اندر بھی ساون بھادوں کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔ شیشوں کے پار گزرتے ہوئے مناظر تھے لیکن اس کی آنکھوں کے سامنے ایک ہی منظر تھا۔ وہ پھسلتے پھسلتے اس اجنبی کی پشت سے لپٹ گئی تھی۔ پہلی بار پتہ چلا کہ سمندر کی منہ زور لہریں سخت چٹانوں سے ٹکرا کر کس طرح بکھر جاتی ہیں؟ وہ پہلی بار اپنے وجود کے اندر بکھر گئی تھی۔ تب سے اب تک خود کو سمیٹ نہیں پا رہی تھی۔

کار ایک محل نما کوٹھی کے سامنے آئی تو وہاں کھڑے ہوئے دو مسلح سکیورٹی گارڈز نے اس کا آہنی گیٹ کھول دیا۔ کار کوٹھی کے احاطے میں آ کر رکی۔ ایک باوردی ملازم نے تیزی سے آگے بڑھ کر اس کا پچھلا دروازہ کھولا۔ سبیکا کار سے اتر کر کوٹھی کے بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ وہاں بھی ایک باوردی ملازم کھڑا ہوا تھا۔ اس نے سبیکا کو سلام کرتے ہوئے کوٹھی کا بیرونی دروازہ کھول دیا۔

سبیکا کروڑ پتی بزنس مین سیٹھ عبدالقادر سومرو کی اکلوتی اولاد تھی۔ جس کا بزنس پاکستان کے علاوہ یورپ کے کئی ممالک میں بھی پھیلا ہوا تھا۔ صوبہ سندھ میں کروڑوں مالیت کی آبائی زمینیں تھیں اور سبیکا اس تمام دولت و جائیداد کی تنہا وارث تھی۔ وہ چار برس کی تھی، جب اس کی ماں اس دنیا سے رخصت ہو گئی۔ تب سے اب تک اس کے باپ نے اکلوتی بیٹی کی محبت کے باعث دوسری شادی نہیں کی تھی۔ اس کی ہمیشہ یہ کوشش رہی تھی کہ وہ بیٹی کو بھرپور پیار اور توجہ دے، اسے کبھی تنہائی کا احساس نہ ہونے پائے

اور وہ اس میں کسی حد تک کامیاب بھی رہا تھا۔

مگر اس کے ساتھ ساتھ اس نے سبیکا کے لئے ایک گورنس بھی رکھی ہوئی تھی۔ ماں کے بعد اسی نے سبیکا کی پرورش کی ذمے داری سنبھال رکھی تھی۔ وہ بھی اسے ماں کا درجہ دیتی تھی۔ اپنی بہت سی باتیں باپ کے بجائے گورنس میری کو ہی بتاتی تھی۔

سبیکا کوریڈور سے گزر کر اپنے خوبصورت بیڈروم میں آئی تو بیڈ شیٹ درست کرتی ہوئی میڈم میری نے چونک کر پوچھا۔ "کیا ہوا بے بی! آج تم جلدی آگئیں؟"

اس نے ہاتھ میں تھامی ہوئی کتابوں کو رائٹنگ ٹیبل پر رکھ کر صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "ہاں۔ بے چارے پروفیسرز۔ ہم جیسے رئیس خاندان کے بچوں کو تعلیم و ہنر تو دیتے ہیں' مگر انہیں اپنے گھر سے کالج تک آنے کے لئے گاڑی کی بھی سہولت میسر نہیں ہوتی۔ بارش کے باعث پروفیسرز نہیں آئے تھے۔ اسی لئے میں بھی چلی آئی۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے سینے کے دائیں طرف ہاتھ رکھا' چہرے پر تکلیف کے آثار نمایاں ہوئے۔ میڈم میری نے اس کے قریب آتے ہوئے پوچھا۔ "آر یو آل رائٹ بے بی! کوئی پریشانی ہے؟"

وہ منہ پھیر کر سوچنے لگی۔ جب اس سے ٹکرائی تھی تب ایک عجیب سا احساس ہوا تھا۔ بعد میں وہاں تکلیف ہونے لگی تھی۔ چٹان سے وہ حصہ زیادہ ٹکرایا تھا۔ تکلیف تو ہونی ہی تھی۔ اب وہ اپنی گورنس کو کیا بتاتی کہ کس چٹان نے اسے کیسے بیٹھے بیٹھے درد سے نوازا ہے؟

میڈم میری نے اسے ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھا پھر پوچھا۔ "اینی پرابلم؟"

اس نے ایک طرف ہاتھ رکھ کر کہا۔ "یہاں تکلیف ہو رہی ہے۔"

میڈم میری نے کہا۔ "تمہیں فوراً کسی ڈاکٹر سے کنسلٹ کرنا چاہئے۔"

وہ جھجکتے ہوئے بولی۔ "نہیں۔ مجھے شرم آتی ہے۔"

میری اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ "نہیں بے بی! ایسی باتوں میں شرمانا یا جھجکنا نہیں چاہئے۔ میں ابھی فون پر لیڈی ڈاکٹر سے کنسلٹ کرتی ہوں۔ وہ یہاں آ کر تمہارا معائنہ کرے گی۔"

یہ کہتے ہوئے وہ فون کی طرف بڑھی۔ سبیکا اسے روکتے ہوئے بولی۔ "آپ پریشان

نہ ہوں۔ میں کوئی ٹیبلٹ لے لیتی ہوں۔ معمولی سا درد ہے' ابھی ٹھیک ہو جائے گا۔"

وہ پلٹ کر بولی۔ "سمجھنے کی کوشش کرو۔ یہی چھوٹی چھوٹی تکلیفیں آگے چل کر بریسٹ کینسر کا سبب بن جاتی ہیں۔ ان میں کوتاہی برتنا بے وقوفی ہے اور پھر لیڈی ڈاکٹر سے کیسی شرم؟"

وہ سر جھکا کر بولی۔ "ٹھیک ہے مگر میں معائنہ نہیں کراؤں گی۔ فون پر ہی مشورہ کر لیں۔"

میڈم میری ریسیور کان سے لگا کر نمبر پنچ کرنے لگی پھر رابطہ ہونے پر بولی۔ "ہیلو ڈاکٹر انیلہ!"

پھر وہ دوسری طرف سے آنے والی آواز سن کر بولی۔ "بے بی کو کچھ پرابلم ہے۔ اس لئے فون کیا ہے۔"

وہ ریسیور کان سے لگائے اور دوسری طرف کی بات سن کر پرابلم بتانے لگی پھر اس نے سبیکا کی طرف ریسیور بڑھاتے ہوئے کہا۔ "یہ تم سے کچھ پوچھنا چاہتی ہیں۔"

اس نے جھجکتے ہوئے میڈم میری سے ریسیور لے کر اسے کان سے لگاتے ہوئے کہا۔ "ہیلو!"

دوسری طرف سے ڈاکٹر انیلہ کی آواز سنائی دی۔ "ہیلو۔ سبیکا کیا پریشانی ہے؟"

وہ میری کی طرف دیکھتے ہوئے دھیمی آواز میں بولی۔ "وہ.......... بس ذرا سینے میں تکلیف محسوس ہو رہی تھی۔"

"اس کی کوئی وجہ تو ہوگی۔"

ڈاکٹر انیلہ وجہ پوچھ رہی تھیں۔ اب وہ انہیں کیا بتاتی کہ اس اجنبی نے نہ ملاقات کی تھی' نہ ہی کوئی بات کی تھی۔ صرف تکلیف دی تھی اور یہی تکلیف اس کی یاد دلا رہی تھی۔ وہ سوچنے لگی کہ کیا بتائے؟ پھر کچھ سوچ کر بولی۔ "وہ.......... میں کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ ڈرائیور نے اچانک بریک لگایا تو میں اگلی سیٹ کی پشت سے ٹکرا گئی۔"

وہ بولیں۔ "یہ تو کوئی ایسا بڑا مسئلہ نہیں' مگر تم نے اچھا کیا کہ مجھ سے کنسلٹ کر لیا۔ میں دوائیں لکھ رہی ہوں۔ کسی ملازم کو بھیج کر نسخہ منگوا لو۔ میڈیکل اسٹور سے دوائیں منگوا کر نسخے کے مطابق استعمال کرو۔ انشاء اللہ جلد ہی افاقہ ہو جائے گا۔"

اس نے شکریہ ادا کر کے فون بند کر دیا۔ پھر میڈم میری سے کہا۔ "کسی ملازم کو ڈاکٹر انیلہ کے کلینک بھیج کر نسخے کے مطابق دوائیں منگوا لیں۔"

میری ہاں کے انداز میں سر ہلاتی ہوئی کمرے سے باہر آ گئی۔ ملازم کو پکارتی ہوئی کامن روم میں آئی پھر ایک ملازم کو دیکھ کر بولی۔ "ڈاکٹر انیلہ کے کلینک جاؤ۔ وہ نسخہ دیں گی۔ اس کے مطابق میڈیکل اسٹور سے دوائیں لے آؤ۔"

سیٹھ عبدالقادر نے وہاں سے گزرتے ہوئے اس کی بات سن لی تھی۔ اس نے پریشان ہو کر پوچھا۔ "کیا بات ہے؟ کس کی طبیعت خراب ہے؟"

اس نے کہا۔ "وہ بے بی کے ساتھ کوئی پرابلم تھی۔ ڈاکٹر انیلہ سے کنسلٹ کیا تھا۔ انہوں نے کچھ دوائیں لکھی ہیں۔ وہی منگوا رہی ہوں۔"

"میری بیٹی کی طبیعت خراب ہے؟ کیا ہوا اسے.........؟"

وہ بولی۔ "آپ پریشان نہ ہوں۔ دوائیں کھانے سے ٹھیک ہو جائے گی۔"

وہ اس سے نظریں چرا کر بول رہی تھی۔ اس کے انداز نے سمجھا دیا تھا کہ جوان بیٹی کے ساتھ ضرور کوئی ایسا مسئلہ ہے جسے میڈم میری اس سے چھپا رہی ہے۔ وہ سبیکا کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

وہ سنجیدگی سے سوچنے لگا۔ "وقت کتنی تیزی سے گزر جاتا ہے؟ کل کی بات ہے' سبیکا بچی تھی اور آج جوان ہو گئی ہے۔ اس عمر میں اپنے مسئلے اور الجھنیں ہوتی ہیں جنہیں باپ سے چھپایا جاتا ہے۔ مجھے اب سنجیدگی سے اس کی شادی کے بارے میں سوچنا چاہئے۔"

وہ سوچتا ہوا اپنے بیڈ روم میں آ گیا۔ ایسے ہی وقت اس کے موبائل کا بزر سنائی دیا۔ اس نے اسے آن کر کے کان سے لگاتے ہوئے کہا۔ "ہیلو' میں عبدالقادر سومرو بول رہا ہوں۔"

وہ دوسری طرف سے آنے والی آواز سن کر بولا۔ "آہا وڈیرا سائیں! کہاں ہو آج کل؟"

دوسری طرف سے آواز سنائی دی۔ "تمہارے شہر میں آیا ہوا ہوں۔"

"اچھا؟ یہاں آنے سے پہلے مجھے اطلاع کیوں نہیں دی؟ کہاں ٹھہرے ہوئے ہو؟"

"پرل میں ہوں۔ کل رات سے یہاں ہوں۔"

"بڑے افسوس کی بات ہے۔ اس شہر میں میری تین تین کوٹھیاں ہیں اور تم ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہو؟ میں ابھی آ رہا ہوں۔ تم ہوٹل میں نہیں میرے رنگ محل میں ٹھہرو گے۔"

"اسی لئے تو فون کیا ہے۔ جب بھی یہاں سے جاتا ہوں۔ تمہارے رنگ محل کی رنگینیاں بہت یاد آتی ہیں۔ یہ بتاؤ۔ آج کل ہے کوئی نئی نویلی.........؟"

"کتنی ہی آتی جاتی رہتی ہیں۔ جسے پہلے ہاتھ نہ لگایا ہو' وہ نئی لگتی ہے۔ شباب نئے سے نیا ہو تو جادو جگاتا ہے' شراب پرانی سے پرانی ہو تو ہوش اڑا دیتی ہے۔ اپنا سامان پیک کرو۔ میں آ رہا ہوں۔"

وہ موبائل آف کر کے وہاں سے جانے لگا۔ وہ سبیکا کے لئے ایک شفیق باپ تھا۔ کہتا تو یہی تھا کہ اس نے بیٹی کی خاطر دوسری شادی نہیں کی۔ اس کے لئے سوتیلی ماں نہیں لایا لیکن دل میں ایک بیٹے کی خواہش تھی کہ بے انتہا دولت اور جائیداد کا کوئی وارث ہونا چاہئے۔ یہ ضروری نہیں تھا کہ دوسری یا تیسری شادی کر لینے سے بیٹا پیدا ہو جاتا۔

اس نے دوسری شادی نہیں کی لیکن جو حسینہ دل کو بھا جاتی تھی اسے داشتہ بنا لیتا تھا اور کہتا تھا۔ "بیٹا پیدا کرو گی تو باقاعدہ شادی کر لوں گا۔ ورنہ داشتہ بن کر رہا کرو گی۔"

پچھلے اٹھارہ برسوں میں اس نے چار داشتاؤں سے تعلقات رکھے تھے۔ ہر ایک سے امید کرتا رہا کہ وہ بیٹا پیدا کرے گی لیکن وہ بیٹیاں پیدا کرتی رہیں۔ چوتھی عورت ایک مطلقہ تھی۔ اس نے پہلے شوہر سے ایک بیٹے کو جنم دیا تھا۔ طلاق کے بعد شوہر نے بیٹا چھین لیا تھا۔ وہ بڑے بھرپور بدن والی حسینہ تھی۔

عبدالقادر سومرو نے سوچا۔ "اس نے پہلے شوہر کے پاس بیٹا پیدا کیا ہے۔ میرے لئے بھی بیٹا پیدا کر سکتی ہے۔ یہ ضرور میری دلی تمنا پوری کرے گی۔"

لیکن ایک برس بعد اس نے بھی بیٹی پیدا کی۔ وہ جھنجھلا گیا۔ ان اٹھارہ برسوں میں یقین ہو گیا کہ وہ کبھی ایک بیٹے کا باپ نہیں بن سکے گا۔ اب وہ ایک ہی بیٹی پر اکتفا کر رہا تھا۔

☆======☆======☆

کالج کے کاؤنٹر پر طلبہ و طالبات کا ہجوم تھا۔ علی وہاں پہنچا تو فارم حاصل کرنے والوں کی لمبی قطاریں لگی ہوئی تھیں۔ اسے آنے میں دیر ہو گئی تھی۔ رات دیر سے سویا تھا۔ کروٹیں بدلتا رہا تھا۔ ہر کروٹ پر وہ آ کر ٹکرا جاتی تھی۔ آنکھ لگتے لگتے اس نے پہلی ہی نظر میں کھینچ لیا تھا۔ اسیر کر لیا تھا۔ اسے رات دیر تک رہائی نہیں ملی۔ جب آنکھ لگی دیر سے پھر آنکھ کھلی دیر سے۔ وہ فوراً ہی تیار ہو کر ناشتا کیے بغیر کالج پہنچا۔ خاصی دیر ہو چکی تھی۔ وہ پریشان ہو کر لمبی قطاروں کو دیکھنے لگا۔

طلبہ کی قطار میں تقریباً پچاس لڑکے کھڑے تھے۔ طالبات کی قطار میں بیس لڑکیاں تھیں۔ اس نے اندازہ کیا' طلبہ کی قطار میں کھڑا رہے گا تو صبح سے شام ہو جائے گی پھر بھی شاید کاؤنٹر تک نہیں پہنچ پائے گا۔ وہ پریشان ہو کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ سیکنڈ ایئر اور تھرڈ ایئر کے اسٹوڈنٹس کلاسوں سے باہر آ کر ہنس بول رہے تھے۔ کنٹین کی طرف جا رہے تھے۔ دو چار لڑکے اور لڑکیاں ایک کاؤنٹر کی طرف آ رہے تھے۔ ان میں سے ایک لڑکی تنہا تھی۔ اس نے قریب جا کر کہا۔ "ایکس کیوز می' آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔"

وہ بولی۔ "مجھ سے تو کوئی بات نہیں کرتا کیونکہ میں وقت ضائع نہیں کرتی۔ بات کرنے کے بھی پیسے لیتی ہوں۔ فی منٹ پانچ روپے۔ میری گھڑی میں ٹھیک گیارہ بجے ہیں۔ تم بات شروع کرو۔ میں منٹ گن رہی ہوں۔"

"کیا آپ میرے لئے ایڈمیشن فارم حاصل کر سکتی ہیں؟"

"میرے پاس قطار میں کھڑے رہنے کا وقت نہیں ہے۔ ابھی میں دوسری کلاس اٹینڈ کرنے جاؤں گی۔"

"کیا ایسا کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ قطار میں وقت ضائع نہ ہو اور فارم مل جائے۔"

"ایک منٹ گزر گیا۔ پانچ روپے دو۔"

وہ دس روپے دیتے ہوئے بولا۔ "پلیز کوئی تدبیر کرو۔ ایسا نہ ہو' فارم ختم ہو جائیں۔"

"ایک ذریعہ ہے۔ تمہارا کام ہو جائے گا۔ کنٹین میں ایک بوتل دس روپے کی ہے اور اسنیکس بیس روپے کے ہوتے ہیں۔ کل تیس روپے دو گے تو تمہارا کام ہو سکے گا۔"

اس نے فوراً ہی تیس روپے گن کر دیئے۔ وہ رقم لے کر بولی۔ "میرے پیچھے

آؤ۔"

وہ اس کے پیچھے چلنے لگا۔ وہ بولتی جا رہی تھی۔ "زندگی طرح طرح سے چوٹ لگاتی ہے۔ اگر نوٹ ہوں تو چوٹ نہیں لگتی۔ ضرورتیں پوری ہو جاتی ہیں۔ اس وقت بھی میں تمہاری ضرورت کے وقت کام آ رہی ہوں۔ میری بھی کچھ ضرورتیں ہیں' جو تمہاری دی ہوئی رقم سے پوری ہوں گی۔ میں بڑی دیر سے سوچ رہی تھی' آج کنٹین کے اخراجات کون پورے کرے گا۔ آخر تم آ گئے۔ آئندہ بھی کوئی پرابلم ہو تو مجھے یاد رکھنا۔ ویسے تو میرا نام مرینہ جمال ہے لیکن یہاں نجات دہندہ بھی کہلاتی ہوں اور چالباز بھی۔ اسٹوڈنٹس اپنے اپنے مزاج کے مطابق کوئی نہ کوئی نام دیتے رہتے ہیں۔"

مرینہ جمال نے اچانک رک کر ایک طرف دیکھتے ہوئے آواز دی۔ "ہائے سبیکا! جسٹ اے منٹ' میں تمہیں تلاش کر رہی ہوں۔"

سبیکا چلتے چلتے رک گئی پھر پلٹ کر مرینہ کی طرف آتی ہوئی بولی۔ "کیا بات ہے؟ کلاس اٹینڈ نہیں کرو گی؟"

علی دوسری طرف منہ کئے نوٹس بورڈ کا ایک نوٹس پڑھ رہا تھا۔ مرینہ نے کہا۔ "ابھی کلاس میں جا رہی ہوں۔ میرا ایک چھوٹا سا کام کر دو۔ تمہارا ایک جاننے والا کاؤنٹر کلرک ہے۔ اس سے ایک ایڈمیشن فارم لے آؤ۔"

"تمہیں ایڈمیشن فارم کی ضرورت کیوں آ پڑی؟ کسی کے لئے نجات دہندہ بن رہی ہو؟"

"ہاں۔ یہ ہیں مسٹر.........."

وہ اسے مخاطب کر کے بولی۔ "اے مسٹر! کیا نام ہے تمہارا؟"

وہ جواب دینے کے لئے پلٹا تو نظریں چار ہوئیں۔ دونوں کے دل دھک سے رہ گئے پھر دھڑکنیں پاگل ہونے لگیں۔ ان کے ذہنوں میں یہ بات ضرور تھی کہ آج کالج میں کہیں آمنا سامنا ہو گا۔ اب سامنا ہوا تو وہ جھجکنے لگا۔ یہ شرمانے لگی۔ لیڈی ڈاکٹر کی دوا نے کام دکھایا تھا۔ تکلیف نہیں رہی تھی لیکن اسے سامنے پاتے ہی ٹھیک اسی جگہ درد سرگوشیاں کرنے لگا۔

مرینہ نے پوچھا۔ "اے! سر جھکائے کیا کھڑے ہو۔ اپنا نام بتاؤ؟"

وہ ایک دم سے بوکھلا کر بولا۔ "جی۔ سبیکا..........."

سبیکا نے چونک کر اسے دیکھا۔ ابھی اس نے مرینہ کی زبان سے اس کا نام سنا تھا۔ تب سے وہ نام اس کے وجود کی پوری کائنات میں گونج رہا تھا۔ وہی نام بے اختیار زبان پر بھی آ گیا۔ مرینہ ہنستے ہوئے بولی۔ "سبیکا؟ تمہارا نام بھی سبیکا ہے؟ تم لڑکی ہو یا لڑکا؟"

وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "وہ.......... وہ بات یہ ہے کہ سبیکا ایک آئیڈیل نیم ہے۔ اس لئے آپ ہی آپ زبان پر آ گیا۔ میرا نام علی ہے۔ علی رمزی۔ میں فرسٹ ایئر میں داخلے کے لئے آیا ہوں۔"

وہ مرینہ کا ہاتھ پکڑ کر بولی۔ "میرے ساتھ آؤ۔ میں ابھی فارم لے آؤں گی۔"

وہ اپنا ہاتھ چھڑا کر بولی۔ "یہ کلاس میرے لئے ضروری ہے۔ تم فارم لے کر اسے دے دو۔"

سبیکا سہارے کے لئے اسے روکنا چاہتی تھی لیکن وہ مزید کچھ کہے سنے بغیر چلی گئی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے سامنے رہ گئے۔ علی کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ سبیکا نے چور نظروں سے دیکھا پھر ایک طرف جانے لگی۔ وہ اس کے پیچھے چلتے ہوئے اسے دیکھنے لگا۔ وہ پشت کی طرف سے سراپا دکھائی دے رہی تھی۔ بدن بھرا ہوا تھا۔ چال ایسی تھی جیسے بہاریں لٹاتی جا رہی ہو۔ دیکھنے والے لوٹ نہیں سکتے تھے۔ لٹ کر رہ جاتے ہوں گے۔

وہ ایک آفس کے دروازے پر رک کر بولی۔ "میں ابھی آتی ہوں۔"

وہ دروازہ کھول کر اندر چلی گئی۔ وہ سوچنے لگا۔ "یہ ابھی آئے گی۔ مجھے فارم دے کر چلی جائے گی۔ فقط اتنی سی ملاقات رہے گی پھر نہ جانے کب ملنے اور باتیں کرنے کا موقع ملے گا؟"

وہ فارم لے کر آ گئی۔ اس فارم کو اس کی طرف بڑھایا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر نہیں لیا۔ دل کہہ رہا تھا' وہ یہاں فارم کے لئے نہیں' اس لڑکی کے لئے آیا ہے۔ یہ فارم کیوں دے رہی ہے؟ دل کیوں نہیں دے رہی؟

سبیکا نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا پھر کہا۔ "اسے لو اور پُر کرو۔"

"وہ.......... میں ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں۔"

وہ سر جھکائے خاموش رہی۔ دل نے دھڑک دھڑک کر کہا۔ "پتہ نہیں' یہ کیا پوچھنا

چاہتا ہے؟ پاگل جذبوں کا کوئی مہکتا ہوا' بھٹکتا ہوا سوال نہ ہو۔"

اس نے پوچھا۔ "کیا میری ایک مدد کرو گی؟"

"کیسی مدد چاہتے ہو؟"

"اسے پُر کرتے وقت مجھے گائیڈ کرو۔"

وہ کہنا چاہتی تھی' فارم پیچیدہ نہیں ہے۔ اسے آسانی سے پُر کیا جا سکتا ہے۔ دل کہہ رہا تھا' انکار نہ کرے۔ اسی بہانے تھوڑی دیر کا ساتھ رہے گا۔ اس نے پوچھا۔ "کنٹین میں چلیں؟"

وہ بولی۔ "وہاں بہت شور ہوتا ہے۔ لائبریری میں چلو۔"

وہ لائبریری کے خاموش اور پُرسکون ماحول میں آ کر بیٹھ گئے۔ اس نے فارم پر اپنا نام اور پتا لکھ کر کہا۔ "یہ پتہ پڑھ کر جان سکتی ہو کہ میرا تعلق مڈل کلاس سے ہے۔ میرے والد کا انتقال ہو چکا ہے۔ صرف والدہ ہیں۔ ہمارے چند مکانات اور چند دکانیں ہیں۔ ان سے جو کرایہ حاصل ہوتا ہے' اسی سے ہم گزارہ کرتے ہیں۔ کچھ اپنے متعلق بتانا چاہو گی؟"

وہ دھیمی آواز میں بولی۔ "میرا نام تو جانتے ہو۔ میرے والد کا نام عبدالقادر سومرو ہے۔ والدہ کا انتقال ہو چکا ہے۔ کوئی اور بہن بھائی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں بہت کچھ دیا ہے اور جو کچھ دیا ہے' اس کی والی وارث صرف میں ہوں۔"

وہ سبیکا کے رکھ رکھاؤ سے اندازہ کر چکا تھا کہ وہ ایک بڑے باپ کی بیٹی ہو گی' آسمان کا ستارہ ہو گی۔ محبت کرنے والے دعویٰ کرتے ہیں کہ آسمان سے تارے توڑ لائیں گے۔ کیا اس کے ہاتھ آسمان تک پہنچ سکیں گے؟

سبیکا نے کہا۔ "فارم پُر کرو۔ کیا سوچ رہے ہو؟"

"تم آسمان ہو۔"

وہ آگے کچھ نہ کہہ سکا' سر جھکا کر اپنے پسندیدہ مضامین پر نشان لگانے لگا۔ سبیکا نے پوچھا۔ "مجھے آسمان کیوں کہہ رہے ہو؟ کیا اس کی وجہ میری دولتمندی ہے؟"

"بے شک۔ بلندیاں دولت سے ہی حاصل ہوتی ہیں۔"

وہ کہہ سکتی تھی' مگر کہہ نہ سکی۔ دل کی دولت ایسی ہوتی ہے جس سے سچی مسرتیں

حاصل ہوتی ہیں لیکن ابھی دل کے معاملات میں سنجیدگی نہیں آئی تھی۔ اس لئے وہ چپ رہی۔

اس نے فارم پُر کرنے کے بعد اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اسے چیک کرو۔ مجھ سے کوئی غلطی ہو سکتی ہے۔"

وہ فارم لے کر پڑھنے لگی۔ اس کی رائٹنگ بہت اچھی تھی۔ انسان اپنی تحریر سے بھی پہچانا جاتا ہے کہ وہ کتنے صاف ستھرے ذہن کا مالک ہے۔ وہ تحریر شناس نہیں تھی پھر بھی اس کی تحریر کو دیکھ کر ایک خوشگوار سا احساس ہو رہا تھا۔ وہ پڑھتے پڑھتے ایک دم سے چونک گئی۔ فارم پر اس کی تاریخ پیدائش لکھی ہوئی تھی۔ اسے حیرانی سے دیکھ کر بولی۔

"تم صرف انیس برس کے ہو؟ تمہاری تاریخ پیدائش یہی بتا رہی ہے۔"

"ہاں۔ میری تعلیم دیر سے شروع ہوئی تھی۔ اسی لئے انیس برس کی عمر میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔"

"تعجب ہے؟ تم تو پچیس برس کے گبھرو جوان لگتے ہو۔"

وہ مسکرا کر بولا۔ "سب یہی سمجھتے ہیں۔ میرا قد اور میری جسامت ایسی ہے۔ میں باڈی بلڈنگ بھی کرتا ہوں۔ مجھے بڑا شوق تھا کہ میری شیو نکل آئے۔ میں شوقیہ چہرے پر بلیڈ پھیرنے لگا۔ اس طرح یہ داڑھی مونچھیں نکل آئی ہیں۔"

وہ ہنستے ہوئے کہہ رہا تھا لیکن سبیکا کے چہرے سے تازگی اڑ گئی تھی۔ وہ مایوسی سے اپنی عمر کا حساب کر رہی تھی۔ وہ اپنی تاریخ پیدائش کے مطابق پورے بائیس برس کی تھی۔ اس سے عمر میں پورے تین برس بڑی تھی۔

وہ سنجیدگی سے سوچ رہی تھی پھر ایک دم سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ علی نے حیرانی سے پوچھا۔ "کیا ہوا؟"

"میری کلاس کا وقت ہو گیا ہے۔ فارم جمع کروانے کا وقت تو گزر چکا۔ تم کل آ کر اسے جمع کرا سکو گے۔"

وہ اس سے کترا کر جانا چاہتی تھی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔ "کیا آج میری خاطر ایک کلاس مس نہیں کر سکتیں؟"

اس نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ گڑبڑا کر بولا۔ "میرا مطلب ہے۔ مجھے

اپنے کالج کے بارے میں بتاؤ۔ یہاں کا تعلیمی معیار کیسا ہے؟ اسپورٹس وغیرہ کا انتظام ہے یا نہیں..........؟"

وہ آگے بڑھتے ہوئے بولی۔ "یہ تمام تفصیلات تمہیں پراسپکٹس کے ذریعے حاصل ہو سکتی ہیں۔"

یہ کہہ کر وہ بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ وہ بے بسی سے اسے جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ ان کے درمیان کوئی ایسا تعلق نہیں تھا جس کے باعث وہ اسے روک سکتا' اس پر اپنا حق جتا سکتا مگر اس کے یوں اچانک اٹھ کر چلے جانے پر حیران ہو رہا تھا۔ اس نے تو کوئی ایسی بات نہیں کہی تھی جو اسے ناگوار گزرتی۔

وہ اپنے اندر ہونے والی تبدیلیوں کو سمجھ رہا تھا۔ یہ نازک سی لڑکی اس کے اندر ہلچل مچا رہی تھی۔ وہ آج تک کسی طرف مائل نہ ہو سکا تھا مگر اس سے ہونے والے ایک معمولی سے ٹکراؤ نے اس کی راتوں کی نیند اڑا دی تھی۔ اسے بے چین کر دیا تھا۔ کیا وہ اس کی بے چینی دور کر سکتی تھی؟ کیا کبھی زمین بھی آسمان کو چھو سکی؟ نہیں کبھی نہیں.......... یہ ناممکن ہے۔

ذہن اسے سمجھا رہا تھا کہ اس رئیس زادی کا خیال دل سے نکال دے۔ وہ کوئی معمولی لڑکی نہیں ہے۔ کراچی کے بزنس ٹائیکون سیٹھ عبدالقادر سومرو کی بیٹی ہے۔

مگر دل مجبور کر رہا تھا۔ وہ لاکھ کوشش کے باوجود اس خیال کو دل سے نکال نہیں پا رہا تھا۔ اس نے لائبریری سے باہر آ کر سرسری سی ایک نظر کالج کی عمارت پر ڈالی' پھر مین گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ ایک امید تھی جو اسے حوصلہ دے رہی تھی کہ کل فارم جمع کرانے آئے گا تو پھر کسی نہ کسی بہانے سبیکا سے بات کرنے کا موقع نکالے گا اور جب ایڈمیشن ہو جائے گا تو روز ملاقاتیں ہوں گی۔ چاہے بات نہ ہو لیکن آنکھوں کو اس کا دیدار تو نصیب ہو گا۔

دوسری طرف سبیکا کلاس روم میں کتاب پر نظریں جمائے بیٹھی تھی۔ اس کے ذہن میں بار بار اسی مضبوط جسامت والے کا خیال ابھر رہا تھا۔ پروفیسر لیکچر دے رہا تھا۔ وہ سن رہی تھی مگر الفاظ سمجھ نہیں رہی تھی اس کی نظریں کھلی کتاب کے صفحے پر جمی ہوئی تھیں مگر اسے پڑھ نہیں رہی تھیں۔

اچانک صفحے کی تحریر غائب ہو گئی۔ اس نے چونک کر دیکھا' وہاں کچھ دھندلے سے ہندسے لکھے ہوئے تھے۔ کچھ دیر بعد وہ واضح ہوتے چلے گئے۔ علی کی تاریخ پیدائش ایک بار پھر اس کی نظروں کے سامنے آگئی۔ اس نے تیزی سے کتاب کو بند کر دیا۔ کتاب بند کر دینا اس کے اختیار میں تھا' مگر وہ حقیقت سے نظریں نہیں چرا سکتی تھی۔ وہ سوچنے لگی۔

"عجیب لڑکا ہے۔ پہلی بار ملا تو سینے میں درد دے گیا' جب دوبارہ ملا تو سینے کے اندر دھڑکتے ہوئے دل میں درد جگا کر چلا گیا۔ میں اسے بھلانا بھی چاہوں' تب بھی یہ میٹھا میٹھا درد میرے ذہن میں اس کی یاد کو تازہ کرتا رہے گا۔ کل تکلیف نے جگایا۔ آج یہ درد تڑپاتا رہے گا۔"

وہ مایوس مایوس سی گھر پہنچی۔ رات بھر کروٹیں بدلتی رہی۔ کبھی وہ گبھرو جوان آنکھوں کے سامنے آکر مسکرانے لگتا اور کبھی اس کی تاریخ پیدائش منہ چڑانے لگتی۔ تمام رات آنکھوں میں گزری تھی۔ وہ صبح کالج نہیں جانا چاہتی تھی مگر ایک کشش تھی جو اسے اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ ایک لگن تھی جس نے نہ چاہتے ہوئے بھی اسے کالج پہنچا دیا۔

وہ مسلسل کلاسز اٹینڈ کرتی رہی' تاکہ علی سے سامنا نہ ہو سکے مگر جو ہونا ہوتا ہے وہ ہو کر رہتا ہے۔ وہ ایک کلاس سے نکل کر دوسری کلاس میں جانے کے لئے کوریڈور سے گزر رہی تھی۔ ایسے وقت کسی نے اسے پکارا' وہ چونک گئی۔ وہی آواز' وہی لہجہ تھا جس سے وہ کترا رہی تھی۔

اس نے پلٹ کر دیکھا۔ علی اس کے قریب آتے ہوئے بولا۔ "میں نے فارم جمع کرا دیا ہے۔ اس کے بعد سے تمہیں ڈھونڈ رہا ہوں۔ اب نظر آئی ہو۔"

وہ اسے دیکھ رہی تھی' دل چاہتا تھا کہ اس سے باتیں کرتی رہے۔ وہ بولتا رہے اور وہ سنتی رہے لیکن ایسا دل چاہتا تھا' وہ نہیں چاہتی تھی۔ وہ اس سے کترا کر جانے لگی۔ وہ اس کے ساتھ چلتے ہوئے بولنے لگا۔ "ایڈمیشن ہو جائے تو روز ہماری ملاقات ہوتی رہے گی۔"

وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔ "روز ملاقات ضروری تو نہیں ہے۔"

"آں.........؟" وہ ذرا گڑبڑا گیا پھر سنبھل کر بولا۔ "بات یہ ہے کہ یہاں آتے ہی صرف تم سے جان پہچان ہوئی ہے۔ تم نے میرے ساتھ بہت تعاون کیا ہے۔ تم تھرڈ ایئر

میں ہو۔ مجھ سے سینئر ہو۔ یہاں اسٹڈی کے دوران میں تم سے مدد ملتی رہے گی۔"

وہ ٹھٹک گئی۔ لفظ "سینئر" اس کے دماغ میں گونجنے لگا۔ وہ سنجیدگی سے بولی۔ "مجھے لیکچر لینا ہے' دیر ہو رہی ہے۔ میں اس وقت تم سے زیادہ باتیں نہیں کر سکتی۔"

وہ اس کے رویئے کو سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ اس کا انداز اسے مایوس کر رہا تھا پھر بھی وہ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر بولا۔ "میں پیریڈ آف ہونے کا انتظار کروں گا۔"

وہ خاموش رہی' ایک نظر اس پر ڈالتی ہوئی آگے بڑھتی چلی گئی۔ وہ سوچنے لگا۔

"خاموشی رضامندی کا دوسرا نام ہے۔ اگر مجھ سے بات کرنا اسے پسند نہیں' تو وہ انکار بھی کر سکتی تھی۔"

اس خیال نے اسے حوصلہ دیا۔ وہ کنٹین میں جا کر بیٹھ گیا۔ انتظار کے تیس منٹ' تیس صدیاں دکھائی دے رہے تھے۔ وہ ایک کولڈ ڈرنک منگوا کر پینے لگا۔ مجبوری تھی' کنٹین میں یونہی بے وجہ بیٹھنا بھی مناسب نہیں تھا۔ وہ دنیا داری نباہ رہا تھا مگر ساری توجہ اس گھنٹی کی آواز پر مرکوز تھی جو پیریڈ آف ہونے پر سنائی دینے والی تھی۔

اس نے گھنٹی کا انتظار بھی نہیں کیا۔ بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ وہاں سے اٹھ کر اس کی کلاس کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ اس نے کلائی پر بندھی گھڑی پر نظر ڈالی۔ کلاس ختم ہونے میں پانچ منٹ باقی تھے۔

کچھ دیر بعد گھنٹی کی آواز سنائی دی۔ وہ بے چینی سے کلاس سے باہر آنے والے اسٹوڈنٹس کو دیکھنے لگا۔ تقریباً تمام ہی اسٹوڈنٹس باہر آچکے تھے مگر اب تک سبیکا نظر نہیں آئی تھی۔ اس کی بے قراری بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ آگے بڑھ کر کلاس روم میں جانا چاہتا تھا' ایسے ہی وقت وہ دروازے سے باہر آتی ہوئی دکھائی دی۔

سبیکا کی نظر اس پر پڑی تو ٹھٹک گئی۔ اس نے سوچا تھا کہ وہ اس کے رویئے سے مایوس ہو کر اب تک جا چکا ہو گا مگر اس کا اندازہ غلط نکلا۔

وہ اس سے منہ پھیر کر دوسری طرف بڑھ گئی۔ علی نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "سبیکا! مجھے تم سے کچھ پوچھنا ہے۔"

وہ چلتے چلتے رک گئی۔ اس نے ذرا توقف کے بعد کہا۔ "تمہارے اس رویئے اور اس انداز کو میں سمجھ نہیں پایا ہوں۔ فارم پُر کرنے کے بعد سے اب تک میرے ساتھ

تمہارا رویہ عجیب سا ہے۔ لہجے میں اپنائیت نہیں ہے۔"

وہ پلٹ کر خشک لہجے میں بولی۔ "تم شکایت کر رہے ہو۔ جبکہ میں سمجھتی ہوں کہ دو اجنبیوں کے درمیان شکوے شکایات کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ پلیز میرا پیچھا نہ کرو۔ اس وقت بہت سی نگاہیں مجھے دیکھ رہی ہیں۔ میں اسکینڈل نہیں بننا چاہتی۔"

وہ آگے بڑھنے لگی' وہ اس کے ساتھ چلتے ہوئے بولا۔ "تو پھر کہیں بیٹھ کر بات کر لیتے ہیں۔"

"میں لائبریری جا رہی ہوں۔ وہاں بہت خاموشی ہوتی ہے۔ بات نہیں ہو سکتی۔"

وہ چلتے چلتے رک گئی پھر گردن گھما کر اسے دیکھتے ہوئے بولی۔ "ویسے بھی.......... میں تنہائی چاہتی ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گئی۔ علی خود کو روکنا چاہتا تھا' وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ اس کے لئے اس قدر دیوانہ کیوں ہو رہا ہے؟ وہ اب تک خود کو روک نہیں سکا تھا' مگر سبیکا کے ایک جملے نے کہ وہ تنہائی چاہتی ہے اس کے پیروں میں زنجیر ڈال دی تھی۔

سبیکا لائبریری میں آ کر بیٹھ گئی۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس سے پیچھا چھڑا کر یہاں آ گئی تھی۔ وہ آنکھوں کے سامنے سے دور ہو گیا تھا مگر تنہائی میسر آتے ہی خیالوں میں چلا آیا تھا۔ وہ کیا کرے؟ اس سے کیسے پیچھا چھڑائے؟ اس کے ذہن میں ایک آئیڈیل تھا۔ ہر لڑکی کے ذہن میں ایک بھاری بھرکم شخص ہوتا ہے جو اس کے حواس پر چھایا رہتا ہے۔ علی صرف قد اور جسامت کے لحاظ سے بھاری بھرکم تھا لیکن اندر سے مختصر تھا۔ عمر میں چھوٹا تھا۔ چھوٹے بھائی ہوا کرتے ہیں۔ یار اور دلدار نہیں ہوا کرتے۔

وہ اپنے پیروں میں چھ نمبر کے سینڈل پہنا کرتی تھی۔ پانچ نمبر کے سینڈل نہیں پہن سکتی تھی۔ جبراً پہن کر چلتی تو لڑکھڑا کر گر پڑتی۔ ذہن میں یہ بات سمائی ہوئی تھی کہ وہ تین برس بڑی ہے۔ جبکہ ہر عورت کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنے مرد کے بازوؤں میں کم سن اور کمتر بن کر رہے۔ اگر مرد کم سن اور کمتر ہو گا تو ذہن اسے تسلیم نہیں کرے گا۔

اس کا ذہن بھی علی کو تسلیم نہیں کر رہا تھا۔ اس کے بارے میں سوچتے ہوئے وہ خود کو بڑا محسوس کر رہی تھی۔ اگر اس کی آغوش میں سما جاتی' تب بھی اس سے بڑی لگتی۔ وہ صرف عمر میں ہی نہیں' تعلیم میں بھی اس سے بہت آگے تھی۔ آگے بڑھتے رہنے والوں

کی شخصیت بھاری بھرکم ہوا کرتی ہے۔ اس اعتبار سے وہ مقابلتاً بھاری بھرکم تھی۔ اپنے وجود کو اس پر حاوی دیکھ رہی تھی۔

اسے اپنے کانوں میں سرگوشیاں سنائی دیں۔ "مرد کبھی چھوٹا نہیں ہوتا۔ شیر کی عمر نہیں دیکھی جاتی' اس کی طاقت دیکھی جاتی ہے۔ اگر وہ پوری قوت سے دبوچ لے اور شکار اس کی گرفت سے نکل نہ سکے تو پھر وہ کم عمر اور کمزور نہیں ہے۔"

وہ کھلی ہوئی کتاب کے صفحے پر نظر آ رہا تھا۔ وہ بولی۔ "یوں باتیں بنانے سے حقیقت نہیں بدلے گی۔ اگر یہ کوئی چوری چھپے کا کھیل ہوتا تو میں چپ چاپ تمہیں اپنا لیتی لیکن یہ ساری زندگی کا مسئلہ ہے۔ میرے ڈیڈی کبھی تمہیں داماد نہیں بنائیں گے۔ خاندان والے مذاق اڑائیں گے۔"

وہ ایک سرد آہ بھر کر بولی۔ "عورت کی جوانی اور شادابی یوں بھی مختصر ہوتی ہے۔ میں چند برسوں میں ڈھلک جاؤں گی۔ آگے جا کر تم جوان رہو گے.......... میں بوڑھی دکھائی دوں گی۔"

سرگوشی سنائی دی۔ "رنگ لاتی ہے حنا' پتھر پہ پس جانے کے بعد۔ عورت کا مقدر بھی یہی ہے۔ مرد کے بازوؤں میں پسنے کے بعد ہی وہ باوقار خاتون کہلاتی ہے۔"

سبیکا نے ایک گہری سانس لی۔ جواباً کچھ نہ کہہ سکی۔ وہ کتاب کے صفحے پر مسکرا رہا تھا پھر اس نے نام لے کر پکارا۔ "سبیکا..........!" اسے پکارتے ہی وہ کتاب کے صفحے میں گم ہو گیا پھر بھی کانوں کے قریب سرگوشی سنائی دی۔ "سبیکا!"

وہ چونک گئی۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہ موجود تھا۔ اس کے قریب کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "میں تمہارا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ تمہارے رویئے سے کچھ بیزاری ظاہر ہو رہی ہے۔ مجھے صرف بیزاری کی وجہ بتا دو۔ میں چلا جاؤں گا۔"

اس نے کہا۔ "چلا جاؤں گا۔" سبیکا کو یوں لگا' ہمیشہ کے لئے چلا جائے گا۔ اس کا آنا اسے اچھا لگ رہا تھا۔ اس کا جانا بھی اچھا نہ لگتا۔ بس وہ یونہی اپنے بڑے پن کی وجہ سے کترا رہی تھی۔

اس نے پوچھا۔ "خاموش کیوں ہو؟ کچھ تو بولو۔ کیا مجھ سے بات کرنا بھی گوارا نہیں ہے؟"

وہ اس سے نظریں نہیں ملا پا رہی تھی۔ جھکی جھکی نظروں سے بولی۔ "میں ضروری باتیں کر سکتی ہوں اور میں سمجھتی ہوں' ہمارے درمیان کوئی ضروری بات نہیں ہے۔"

"جب انسان ایک دوسرے کے لئے ضروری ہو جاتا ہے تو ضروری باتیں بھی پیدا ہو جاتی ہیں۔"

وہ بے چینی سے پہلو بدلنے لگی۔ دل نے دھڑک دھڑک کر پوچھا۔ "پتہ نہیں وہ آگے کیا کہنے والا ہے؟"

اس نے کہا۔ "میں تمہارے لئے نہ سہی' تم میرے لئے ضروری ہو۔"

اس نے چونک کر علی کو دیکھا پھر نظریں جھکا کر جھجکتے ہوئے بولی۔ "تم......... تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

وہ بہت کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن سامنے والی کے تیور سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔ وہ سنبھل کر بولا۔ "تمہارے پاس فرسٹ ایئر' سیکنڈ ایئر کے نوٹس ہوں گے۔ وہ میرے لئے بہت ہیلپ فل ثابت ہوں گے۔ اس طرح تم میرے لئے ضروری ہو جاؤ گی۔ کبھی ایسا بھی وقت آ سکتا ہے کہ میں تمہارے لئے ضروری بن جاؤں۔"

وہ تو ضروری بن گیا لیکن وہ نہیں مان رہی تھی۔ اپنے آپ سے لڑ رہی تھی۔ اس نے کہا۔ "میرے لئے کوئی ضروری نہیں ہوتا۔ ڈیڈی میری ہر ضرورت پوری کر دیتے ہیں۔"

"ماں باپ ایک حد تک ضرورتیں پوری کرتے ہیں۔ اس کے بعد بھی ضرورتوں اور خواہشوں کا میلہ لگا رہتا ہے۔ میں دعا کروں گا کہ تم اس میلے میں گم ہو جاؤ۔"

اتنا کہہ کر وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا پھر کوئی جواب سنے بغیر وہاں سے چلا گیا۔ اس نے سر گھما کر نہیں دیکھا۔ صرف تیزی سے دور جاتے ہوئے قدموں کی چاپ سنتی رہی۔ وہ آوازیں دور ہوتے ہوتے اس کی سماعتوں سے گم ہو گئیں۔ اس کے جانے کے بعد تو اسے سکون کی سانس لینی چاہئے تھی مگر وہ اور بے چین ہو گئی تھی۔ عجیب الجھن کا شکار تھی۔ وہ قریب ہو یا دور ہو' دونوں ہی صورتوں میں بے چین رکھتا ہے۔

وہ سوچنے لگی۔ "نئی کلاسز کا آغاز بیس پچیس دن بعد ہو گا۔ اس دوران میں اسے بھلانے کی کوشش کروں گی۔ مسلسل ملاقاتیں دل میں جذبات جگانے لگتی ہیں۔ یہ بیس

دنوں کی دوری اس کے ذہن سے بھی میرے خیال کو محو کر دے گی۔"

وہ ذرا مطمئن ہو کر گھر آ گئی۔ بستر پر لیٹتے ہی اس کی یہ قیاس آرائی کہ وہ اسے بھلانے میں کامیاب ہو جائے گی' ایک دم سے ہوا ہو گئی۔ وہ تو اس کے حواسوں پر چھایا ہوا تھا۔ کم عمر ہونے کے باوجود اس پر حاوی ہو رہا تھا۔ اسے بے چین کر رہا تھا۔ وہ سراب تھا' جو ہمیشہ دھوکا دیتا ہے۔ وہ کسی سراب کے پیچھے بھاگنا نہیں چاہتی تھی' اس لئے منہ پر تکیہ رکھ کر زبردستی سونے کی کوشش کرنے لگی۔

دوسرے دن وہ کالج پہنچی تو کار سے اترتے ہوئے ایک دم چونک گئی۔ رات بھر جس کا تصور اسے جگاتا رہا تھا' جس کے خیال کو ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کرتی رہی تھی۔ اب وہ حقیقت کی صورت میں نگاہوں کے سامنے کھڑا تھا۔ اسے دیکھ رہا تھا۔ نظریں چار ہوتے ہی سبیکا نے اپنی نگاہیں جھکا لیں۔ وہ کالج کے مین گیٹ پر کھڑا تھا۔ وہ پریشان ہو کر سوچنے لگی۔ "وہاں سے گزروں گی تو یہ ضرور مجھے مخاطب کرے گا۔ بات نہیں کروں گی یا بے اعتنائی ظاہر کروں گی تو میرے پیچھے پیچھے کالج کے اندر آ جائے گا۔ یا خدا! میں کیا کروں؟"

وہ پریشانی سے سوچ رہی تھی پھر ایک دم سے مطمئن ہو گئی۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ اگر وہ اسے مخاطب کرے گا تو وہ اسے ڈانٹ دے گی۔ شاید میرا یہ انداز اس کے حوصلے پست کر دے؟

وہ کار کا دروازہ بند کر کے کالج گیٹ کی طرف بڑھنے لگی۔ قدم ڈگمگا رہے تھے۔ دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ پیروں سے جان نکل رہی تھی۔ تیز تیز چلتی تو شاید لڑکھڑا کر گر پڑتی اسی لئے دھیرے دھیرے قدم اٹھا رہی تھی۔ ذہن سوال کر رہا تھا۔ "کیا اسے ڈانٹ سکو گی؟ وہ وجہ پوچھنا چاہے گا' کیا وجہ بتاؤ گی؟ یہی کہ تم عمر میں اس سے تین برس بڑی ہو؟ بات نہ کرنے کا تمہارا یہ بہانہ کمزور ہے۔ تم اس سے بڑی ہو مگر احساسِ کمتری میں مبتلا ہو۔"

وہ سوچوں کے گرداب میں پھنسی آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ ذہن میں ابھرنے والے سوالوں کے جواب دینے کی کوشش کرتے کرتے وہ ایک دم سے ٹھٹک گئی' آگے بڑھتے بڑھتے رک گئی۔ اس نے چونک کر ارد گرد دیکھا تو خود کو کالج کے اندر پایا۔ اسے خبر ہی نہ

ہوئی کہ کب وہ اس کے قریب سے گزر کر کالج گیٹ سے اندر داخل ہو گئی؟

اس نے پلٹ کر دیکھا تو وہ گیٹ کے باہر کھڑا مسکرا رہا تھا۔ وہ منہ پھیر کر آگے بڑھنے لگی۔ پشت پر اس کی نگاہوں کی تپش محسوس ہو رہی تھی۔ وہ تیزی سے چلتی ہوئی کوریڈور سے گزر کر کلاس روم میں داخل ہو گئی۔ اس کی نظروں سے بچنے کے لئے کلاس روم ایک پناہ گاہ ثابت ہوا۔ وہ تمام وقت کبھی پڑھتی رہی، کبھی سوچوں میں الجھتی رہی، کالج کا وقت ختم ہو گیا، وہ باہر آئی تو ڈرائیور گاڑی کا دروازہ کھولے اس کا منتظر کھڑا تھا۔ کار میں بیٹھتے ہوئے اس کی نظریں یونہی بے سبب کالج گیٹ کی طرف اٹھ گئیں۔ وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ علی اب بھی گیٹ کے پاس کھڑا مسکرا رہا تھا۔

وہ پریشانی سے سوچنے لگی۔ "شاید یہ میری نظروں کا دھوکا ہے؟ وہ میرے دل و دماغ پر سوار ہے، اسی لئے مجھے دکھائی دے رہا ہے۔ اگر وہ حقیقت میں یہاں ہوتا تو ضرور مجھ سے بات کرتا۔"

وہ اسے فریبِ نظر سمجھ رہی تھی مگر جلد ہی یہ غلط فہمی دور ہو گئی۔ کالج سے نکلنے والا ایک لڑکا علی سے ٹکرایا پھر سنبھل کر اس سے ایکس کیوز کرتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

ڈرائیور نے گاڑی سٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔ وہ کھڑکی کے ذریعے تعجب سے علی کو دیکھ رہی تھی۔ کار اس کے قریب سے گزرتے ہوئے آگے بڑھ گئی۔ دیوانے کی دیوانگی ظاہر ہونے لگی تھی۔ وہ روزانہ کالج گیٹ پر موجود رہتا مگر اس نے کبھی سبیکا کو مخاطب کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ بس خاموش نظروں سے اسے دیکھتا رہتا تھا۔ اس کی یہ خاموشی سبیکا کو الجھا رہی تھی۔ دن گزرتے جا رہے تھے۔ اس کی الجھن بڑھتی جا رہی تھی۔

چند روز بعد سبیکا کالج پہنچی تو معمول کے مطابق علی کو وہاں نہ پا کر پریشان ہو گئی۔ پچھلے بیس اکیس دنوں سے وہ روزانہ یہاں موجود ہوتا تھا۔ اس کی الجھن میں اضافہ کرتا رہتا تھا۔ آج غیر حاضر رہ کر بھی اسے الجھا رہا تھا۔ دل انجانے اندیشوں میں گھرنے لگا۔ وہ متلاشی نظروں سے چاروں طرف دیکھتی ہوئی کالج کے اندر داخل ہو گئی۔

لیکچر کے دوران بھی دل میں طرح طرح کے وسوسے جنم لیتے رہے۔ دماغ میں ایک ہی سوال ابھر رہا تھا کہ وہ آج کیوں نہیں آیا؟ وہ پریشان ہو کر سوچنے لگی۔ "جب میں اس سے بات کرنا نہیں چاہتی تو اس کے نہ آنے پر اس قدر پریشان کیوں ہو رہی ہوں؟ مجھے تو

سکون کی سانس لینی چاہئے۔"

پیریڈ آف ہو گیا۔ تمام اسٹوڈنٹس کلاس روم سے باہر جانے لگے۔ وہ سر جھکائے بیٹھی رہی۔ کچھ دیر بعد اسے احساس ہوا کہ وہ کلاس روم میں تنہا رہ گئی ہے۔ اس نے سر اٹھا کر اِدھر اُدھر دیکھا پھر اٹھ کر تھکے ہوئے قدموں سے باہر کوریڈور میں آ گئی۔ وہ دوسری کلاس اٹینڈ نہیں کرنا چاہتی تھی اس لئے لائبریری کی طرف بڑھنے لگی۔

وہ چند قدم آگے بڑھتے ہی ٹھٹک گئی۔ اٹھنے والے قدم ایک دم سے رک گئے۔ جس کی غیر حاضری پر وہ صبح سے پریشان تھی، الجھی ہوئی تھی۔ اب اسے اچانک اپنے سامنے دیکھ کر حیران رہ گئی۔

وہ یونیفارم میں ملبوس اس کی نظروں کے سامنے کھڑا تھا۔ سبیکا کو یوں لگا، جیسے تیر ترکش سے نکل کر کمان میں آ گیا ہے اور وہ بہت جلد اس کا نشانہ بننے والی ہے۔ وہ گہری نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے گھبرا کر نظریں جھکا لیں۔ دل میں خیال گدگدانے لگا کہ نہ جانے وہ اس سے کیا کہنے والا ہے؟ ضرور کوئی دل لگی کی بات کرے گا۔

وہ خود کو ذہنی طور پر تیار کرنے لگی۔ دل چاہ رہا تھا کہ وہ کچھ کہے، کچھ پوچھے مگر ان دونوں کے درمیان خاموشی چھائی رہی۔ سماعت اس کی آواز سے محروم رہی۔ وہ اس سے کترا کر آگے بڑھنے لگی، دل کے کسی گوشے میں یہ چور حسرت چھپی ہوئی تھی کہ وہ اسے روکے، اس سے بات کرے مگر یہ حسرت، حسرت ہی رہی۔

وہ اس کے قریب سے گزرتی چلی گئی مگر وہ خاموش رہا، اسے دیکھتا رہا، مسکراتا رہا، وہ وہاں سے چلتی ہوئی لائبریری میں آ گئی۔ علی کا رویہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ پھر ایسا ہی ہونے لگا۔ وہ روز کالج آتا تھا، اسے دیکھتا تھا، مسکراتا تھا........... مگر خاموش رہتا تھا۔ اس کا یہ انداز سبیکا کے ذہن کو منتشر کرنے لگا۔

ایک روز وہ لائبریری میں بیٹھی پڑھ رہی تھی، کتاب کیا پڑھ رہی تھی؟ کتابِ زندگی کا مطالعہ کر رہی تھی۔ خود کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ جب وہ مہنگی کار سے اترتی ہے تو کتنی ہی حسرت بھری نگاہیں اس کا تعاقب کرتی ہیں۔ اسے پا لینے کی جستجو میں رہتی ہیں۔ ایسی تمنا بھری نظروں سے اسے کوفت ہونے لگتی تھی مگر علی کی نگاہوں سے بیزاری نہیں ہو رہی تھی۔ اس کا دیکھنا اچھا لگتا تھا۔ صرف اس کی خاموشی الجھا رہی تھی۔

سبیکا لائبریری کے پُرسکون ماحول میں سر جھکائے اپنا احتساب کر رہی تھی۔ کتنے ہی لڑکے اس کے لئے آہیں بھرتے تھے۔ وہ آج تک ان کی طرف مائل نہیں ہو سکی تھی مگر علی نے کوئی آہ نہیں بھری تھی' پھر بھی وہ بڑی خاموشی سے دل میں اترتا جا رہا تھا۔ اسے یاد آیا علی نے ایک بار کہا تھا' میں دعا کروں گا کہ تمہارے دل میں خواہشوں کا میلہ لگ جائے۔ آج اس آہ نہ بھرنے والے نے اس کے اندر خواہشوں کا میلہ لگا دیا تھا۔

اس نے ایک گہری سانس لے کر کتاب بند کر دی پھر لائبریری کے ماحول پر سرسری سی نظر ڈالی۔ ایک جگہ اس کی نگاہیں تھم گئیں' جم گئیں۔ وہ آہوں کے طلسم کدے سے نکل کر ایک میز کے پاس بیٹھا ہوا تھا اور بڑی خاموشی سے اسے دیکھے جا رہا تھا۔ وہی ظالمانہ انداز تھا' نہ کچھ بول رہا تھا' نہ تول رہا تھا۔ خاموش نگاہوں سے اس کے اندر سرنگ بناتا جا رہا تھا۔

وہ جلدی سے کتاب کھول کر پڑھنے لگی۔ پڑھنا کیا تھا؟ اپنے آپ کو سنبھالنا تھا۔ وہ کتاب کو بیساکھی بنا رہی تھی' اب ادھر دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ نہ دیکھنے سے کیا ہوتا ہے؟ اس کی نگاہیں تو چبھ رہی تھیں۔ کبھی وہ چبھن محسوس کر کے چہرے کا زاویہ بدل رہی تھی' کبھی ایسی جگہ چبھن ہو رہی تھی کہ وہ دوپٹہ سنبھالنے لگتی تھی۔ کسی کل چین نہیں آ رہا تھا۔ اس نے پریشان ہو کر دروازے کی طرف دیکھا' مرینہ جمال ہال میں داخل ہو رہی تھی۔ اسے اطمینان ہوا وہ اس سے کترانے کے لئے مرینہ کا سہارا لے سکتی تھی۔ اس نے اسے بلانے کے لئے اپنی طرف اشارہ کیا لیکن وہ دوسری طرف دیکھ رہی تھی پھر وہ علی کو دیکھ کر مسکرانے لگی۔ وہ تیزی سے چلتی ہوئی اس کی طرف جانے لگی۔

اسے عجیب سا لگا۔ یہ کیوں علی کے پاس جا رہی ہے؟ کیا علی سے اس کی بے تکلفی ہے؟

پہلے وہ علی کی طرف دیکھنے سے کترا رہی تھی لیکن اب تجسس سے دیکھ رہی تھی۔ مرینہ نے اس کے پاس آ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "ہائے۔ لونلی بوائے! یہاں تنہا بیٹھے ہو؟ میں بات کرنے کے فی منٹ پانچ روپے لیتی ہوں۔ تم تو جانتے ہی ہو؟"

وہ کلائی پر بندھی گھڑی کو دیکھتے ہوئے بولا۔ "ہاں جانتا ہوں۔ ایک منٹ گزرنے والا ہے۔ یعنی تمہارے پانچ روپے بننے والے ہیں۔"

یہ کہہ کر اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ مرینہ نے اسے روکتے ہوئے کہا۔ "چونکہ میں تمہارے پاس ازخود آئی ہوں' اس لئے بات کرنے کے کوئی چارجز نہیں لوں گی۔ تم پہلے اسٹوڈنٹ ہو جسے یہ رعایت نصیب ہو رہی ہے۔"

سبیکا چور نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ وہ دھیمی آواز میں گفتگو کر رہے تھے مگر الفاظ سمجھ میں آ رہے تھے۔ وہ پہلو بدل کر سوچنے لگی۔ "یہ تو کسی سے بغیر رقم لئے بات نہیں کرتی ہے' پھر علی پر ایسی مہربانی کیوں کر رہی ہے؟"

مرینہ نے علی سے پوچھا۔ "اب تک تنہا ہو' کوئی فرینڈ نہیں بنایا؟"

وہ اسے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھ کر بولا۔ "تم مدد کرو تو میری دوستی ہو سکتی ہے۔"

"حیرت ہے! تم جیسا نوجوان فرینڈ شپ میں میری مدد مانگ رہا ہے۔ بہت سی لڑکیاں تمہاری راہ میں "ہیلو" کہنے کے لئے بیٹھی ہیں۔ تم "ہائے" کر کے تو دیکھو۔ شاید تم اپنی پرسنالٹی سے واقف نہیں ہو۔"

وہ ترچھی نظروں سے بے چینی سے پہلو بدلنے والی سبیکا کو دیکھ کر بولا۔ "وہ ان میں سے نہیں ہے۔ تم میری مدد کرنے کی ہامی بھرو' میرا وعدہ ہے' میں تمہاری مدد کرنے میں کوئی کمی نہیں کروں گا۔"

اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر رقم نکال کر کہا۔ "تم چاہو تو ابھی ایڈوانس لے سکتی ہو۔"

سبیکا ناگواری سے زیرلب بڑبڑائی۔ "اس کا تو کام ہی یہی ہے۔ لوگوں کو باتوں میں الجھا کر رقم بٹور لیتی ہے۔ ارب پتی باپ کی بیٹی ہونے کے باوجود ایسی اوچھی حرکتیں کرتی رہتی ہے۔"

مرینہ نے کہا۔ "میرا خیال ہے' میں اس کالج کی پہلی لڑکی ہوں جس سے تمہاری ہیلو ہائے ہوئی ہے۔ اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے میں سمجھتی ہوں کہ تمہارے کام کے سلسلے میں مجھے پوری رقم وصول نہیں کرنی چاہئے۔"

پھر وہ ذرا توقف کے بعد بولی۔ "مگر یاد رکھو۔ یہ ڈسکاؤنٹ پہلی بار تمہیں حاصل ہو رہا ہے۔ اگر دوبارہ کسی سے دوستی کرنے میں میری مدد حاصل کرو گے' تو پوری پوری رقم

وصول کروں گی۔"

وہ سبیکا کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "مجھے صرف اسی سے دوستی کرنی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ میرے لئے پیدا ہوئی ہے اور اگر ایسا نہیں ہے تو کوئی میرے لئے پیدا نہیں ہوئی۔"

سبیکا اس کی باتیں سن رہی تھی اور جذبوں سے نہال ہو رہی تھی۔ مرینہ ان دونوں کی نگاہوں کے تصادم کو دیکھ رہی تھی۔ مسکرا کر بولی۔ "مائی گاڈ! اس کے بعد کوئی دوسری نہیں آئے گی' یعنی کہ بہت خطرناک عشق کر رہے ہو۔"

وہ سبیکا کو گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "یہ تو ابتدائے عشق ہے۔ اس کی انتہا کیا ہوگی؟ یہ وہی جانتی ہے جس کا دل میرے نام سے دھڑک رہا ہے۔"

سبیکا فوراً ہی وہاں سے اٹھ کر جانے لگی۔ وہ بڑے اعتماد سے اسے جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اس کی نگاہیں کہہ رہی تھیں کہ جانے والی کچے دھاگے سے بندھ چکی ہے اور عشق میں کچا دھاگا زنجیروں سے بھی زیادہ مضبوط ہوتا ہے۔ وہ جہاں جائے گی اس کے نام سے بندھی رہے گی۔

مرینہ' علی کو دیکھ رہی تھی اور وہ اس جانے والی کو پلک جھپکائے بغیر دیکھ رہا تھا۔ تب وہ مسکرا کر بولی۔ "اوہ۔ تم تو بہت اونچی جگہ ہاتھ مار رہے ہو۔ وہ ارب پتی باپ کی اکلوتی بیٹی ہے۔ میں بھی اس سے کم نہیں ہوں۔ میرے ڈیڈی بھی اربوں کی جائیداد کے مالک ہیں۔ اس شہر کے بڑے بڑے بزنس مین میں سے ایک ہیں۔ مجھ میں اور سبیکا میں صرف اتنا فرق ہے کہ وہ اپنے ڈیڈی کی اربوں مالیت کی جائیداد کی تنہا وارث ہے جبکہ میں دو بڑے بھائیوں کی بہن ہوں۔"

وہ بہت بولتی تھی۔ جب کوئی بولنے کے لئے کہے تو اس سے فی منٹ پانچ روپے وصول کرتی تھی اور جب اپنی مرضی سے بولنا چاہے تو رکتی نہیں تھی۔ علی کو اس کی ذات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی پھر بھی وہ بولتی جا رہی تھی۔ "ڈیڈی کے کاروبار میں میرا بیس پرسنٹ کا شیئر ہے۔ میں کم سے کم دو سو کروڑ روپے اپنے ڈیڈی کے کاروبار سے کسی وقت بھی حاصل کر سکتی ہوں لیکن میں ایک ایک پیسہ دانتوں سے پکڑتی ہوں۔ آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں چھوڑتی۔ ہاں تو بتاؤ۔ کتنی رقم دے رہے ہو؟ میں اسے تمہاری طرف کھینچ

لاؤں گی۔ تم جو بھی رقم دو گے اس میں ڈسکاؤنٹ ہوگا۔"

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ بھی اٹھ کر بولی۔ "کیا ہوا؟"

وہ اس کی طرف پچاس کا نوٹ بڑھاتے ہوئے بولا۔ "میرا دل کہتا ہے' وہ خود ہی کھنچی چلی آئے گی۔ میں تمہیں زحمت نہیں دوں گا۔"

"تمہیں خوش فہمی ہے۔ وہ عشق محبت کے چکر میں پڑنے والی لڑکی نہیں ہے۔ اگر تم کہتے ہو کہ وہ تمہاری طرف کھنچی چلی آئے گی تو میں اپنے طور پر ضرور معلوم کروں گی کہ یہ آگ ایک طرف ہے یا دونوں طرف برابر لگی ہوئی ہے۔"

وہ کوئی جواب دیئے بغیر وہاں سے جانے لگا۔ وہ اسے جاتے ہوئے دیکھنے لگی' سوچنے لگی۔ "یہ اچانک ہی مجھے اچھا لگنے لگا ہے۔ پتہ نہیں ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ سونے کی طرح چمک رہا ہے لیکن میں ہر چمکتی ہوئی چیز کو سونا نہیں سمجھتی اور نہ ہی اسے سمجھوں گی۔ اونہہ۔"

وہ اہمیت حاصل کرنے والے کو ایک "اونہہ" سے ٹال کر وہاں سے جانے لگی۔

☆------☆------☆

پچھلے کئی دنوں سے اسٹوڈنٹس یونین کے ممبروں کے درمیان کشیدگی جاری تھی۔ پرنسپل اور کالج کے تمام پروفیسرز ان اسٹوڈنٹس کو سمجھا رہے تھے کہ وہ سب یہاں تعلیم حاصل کرنے آئے ہیں۔ انہیں دنگے فساد سے باز رہنا چاہئے۔ سیاست سے دور رہنا چاہئے' تعلیم پر توجہ دینی چاہئے۔

ان کے سمجھانے بجھانے سے جوش میں آنے والے طلبہ عارضی طور پر ٹھنڈے پڑ جاتے تھے لیکن پھر کسی نہ کسی بات پر ایک دوسرے کے خلاف مشتعل ہو جاتے تھے۔ پُرامن رہنے والے اور تعلیم سے دل لگانے والے طلبہ و طالبات سہمے رہتے تھے۔ کتنی ہی طالبات نے خوفزدہ ہو کر کالج آنا چھوڑ دیا تھا۔ ان حالات میں ایک یونین کے کارکن نے مرینہ جمال کو چھیڑ دیا۔ مرینہ کا ایک کزن دوسری یونین کا کارکن تھا۔ اس نے جوش میں آ کر ایک ہاکی لے کر اس پر حملہ کیا۔ وہ زخمی ہو کر بھاگتا ہوا اپنی یونین کے کارکنوں کے پاس آیا۔ یہ ان کے لئے چیلنج تھا' ان کے کارکن کو زخمی کیا گیا تھا۔

وہ سب ہاکیاں اور ڈنڈے لے کر نکل آئے۔ دوسری طرف سے بھی پوری تیاریاں

تھیں۔ ان کے لیڈروں کے پاس ریوالور تھے۔ دونوں طرف سے دھمکیاں دینے کے لئے ہوائی فائرنگ ہوئی۔ پورے کالج میں بھگدڑ مچ گئی۔ اجتماعی حملے شروع ہو گئے۔ کنٹین کو فوراً ہی بند کر دیا گیا۔ کلاس رومز' کوریڈورز' لیبارٹری اور لائبریری جہاں بھی دونوں یونین کے افراد ٹکرا رہے تھے' وہاں سے مرینہ جان بچا کر بھاگ رہی تھی۔ مخالف پارٹی کے اسٹوڈنٹس چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے کہ ایک لڑکی کی وجہ سے ان کے ساتھی کو بری طرح زخمی کیا گیا ہے۔ ہم اس لڑکی کو اغوا کر کے اس کی عزت کی دھجیاں بکھیر دیں گے۔

وہ پناہ کے لئے بھاگتی ہوئی پرنسل کے کمرے کی طرف جا رہی تھی۔ وہاں ایک کوریڈور میں دو اسٹوڈنٹس کے درمیان ہاکی بازی ہو رہی تھی۔ وہ وہاں سے کترا کر ایک کلاس روم میں آئی۔ وہاں چند لڑکیاں چھپی ہوئی تھیں۔ اس کے اندر آتے ہی دوسرے دروازے سے دو لڑکے ہاکی اور ڈنڈا لے کر آ گئے۔ لڑکیاں چیخنے لگیں' وہاں سے بھاگنے لگیں۔ انہوں نے مرینہ کو پکڑ لیا۔ وہ خود کو چھڑانے کی کوشش کرنے لگی۔

علی دوسرے کلاس روم میں تھا۔ لڑکیوں کی چیخ و پکار سن کر دوڑتا ہوا آیا۔ مرینہ کو ان کی گرفت میں دیکھ کر چیختا ہوا بولا۔ "اے! یہ کیا کر رہے ہو؟ چھوڑو اسے۔"

ایک نے غصے سے کہا۔ "کون ہے بے تو؟ کیا ہماری پارٹی کا نہیں ہے؟"

دوسرے نے کہا۔ "یہ نیا اسٹوڈنٹ ہے۔ ابے! ہمارے معاملے میں نہ پڑو۔ جاؤ یہاں سے۔"

علی ایک کے ہاتھ سے مرینہ کی کلائی چھڑانے لگا۔ دوسرے نے ہاکی سے اس کے سر پر حملہ کیا۔ وہ فوراً ہی نیچے جھک گیا۔ ہاکی دوسرے ساتھی کے منہ پر جا کر لگی۔ وہ چیخ مار کر پیچھے چلا گیا۔ علی نے پلٹ کر ہاکی والے کے منہ پر گھونسا مارا۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتا وہ دوسرا تیسرا گھونسا اس کے منہ پر' پیٹ پر اور سینے پر مارتا چلا گیا۔ اس کے ہاتھ سے ہاکی چھوٹ گئی۔

علی نے اچھل کر اسے ایک لات ماری پھر فرش پر پڑی ہوئی ہاکی اٹھالی۔ دوسرا اپنی چوٹیں سہلاتا ہوا اس کی طرف آ رہا تھا۔ علی نے گھوم کر ایک بار اس کے منہ پر ہاکی ماری۔ وہ چیخیں مارتا ہوا دور جا کر گر پڑا۔

مرینہ دیدے پھاڑ پھاڑ کر علی کو دیکھ رہی تھی۔ اسے نجات مل گئی تھی' وہاں سے

بھاگ جانا چاہئے تھا لیکن علی کی جواں مردی نے اسے روک لیا تھا۔ وہ حیرانی سے متاثر ہو کر اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ تنہا تھا اور ان دونوں پر بھاری پڑ رہا تھا۔ اب ان دونوں میں اٹھنے کی سکت نہیں تھی۔ فرش پر پڑے کراہ رہے تھے۔

باہر سے دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ مرینہ کا ہاتھ پکڑ کر اسے کھینچتا ہوا دروازے تک آیا۔ دوسرے دروازے سے کئی لڑکے ہاکیاں اور ڈنڈے لے کر آ گئے۔ ایک لڑکے نے چیخ کر کہا۔ "یہی مرینہ ہے۔ پکڑو اسے۔"

وہ سب ان کی طرف لپکے۔ علی نے باہر آتے ہی دروازے کو بند کر کے کنڈی لگا دی۔ وہاں سے دوڑتے ہوئے بولا۔ "تمہیں اپنی گاڑی میں یہاں سے چلے جانا چاہئے۔"

وہ دوڑتے دوڑتے رک گئی۔ ہانپتے ہوئے بولی۔ "میں ادھر گئی تھی۔ انہوں نے کار کے شیشے توڑ دیئے ہیں۔ ڈرائیور بھاگ گیا ہے۔ لیبارٹری کی طرف چلو۔"

وہ دوڑتے ہوئے لیبارٹری کی طرف جانے لگے۔ اس نے باہر سے کنڈی لگائی تھی۔ اس لئے حملہ کرنے والے فوراً ہی اس کی طرف نہ آ سکے۔ وہ اس کلاس روم سے نکل کر کوریڈور میں آئے پھر دوسرے کوریڈور میں مڑ کر عمارت کے باہر آئے اور چاروں طرف دیکھنے لگے۔ اسی وقت دوسری پارٹی کے لڑکے ان پر حملہ کرنے آ گئے پھر ان دونوں پارٹیوں کے درمیان ٹھن گئی۔ وہ ایک دوسرے پر حملے کرنے لگے۔ مرینہ' علی کے ساتھ لیبارٹری میں آ گئی تھی۔ وہاں بھی امن و امان نہیں تھا۔ چار اسٹوڈنٹس چھپ چھپ کر ایک دوسرے پر حملے کر رہے تھے۔

انہوں نے مرینہ کو دیکھا۔ وہ اسے پکڑنے کے لئے دوڑے لیکن ان سے مقابلہ کرنے والوں نے راستہ روک لیا۔ علی اسے کھینچتا ہوا' دوڑتا ہوا لیبارٹری کے دوسرے حصے میں آیا۔ وہاں ایک اسٹور روم تھا۔ وہ دروازہ کھول کر اندر آئے۔ وہ اسٹور روم چھوٹا سا تھا۔ سامان اس قدر بھرا ہوا تھا کہ دروازہ بند کرتے ہی گھٹن سی ہونے لگی۔ وہ پریشان ہو کر بولی۔ "یہاں تو بہت گھٹن ہے۔ میرا دل گھبرا رہا ہے۔"

وہ دروازہ کھول کر باہر آ گئے۔ گہری گہری سانسیں لینے لگے۔ لیبارٹری کے ایک حصے سے آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ ایک کہہ رہا تھا۔ "وہ مرینہ کو لے کر ادھر گیا ہے۔"

ان کے لیڈر کی آواز سنائی دی۔ "تم ان لوگوں سے نمٹو۔ میں اس لڑکے کو دیکھتا

ہوں۔"

وہ دوڑتا ہوا ان کی طرف آیا پھر ان دونوں کو دیکھ کر رک گیا۔ انہیں ریوالور کے نشانے پر رکھتا ہوا بولا۔ "اپنی زندگی چاہتے ہو تو مرینہ کو میرے حوالے کردو۔"

وہ مرینہ کے سامنے ڈھال بن کر آگے بڑھتے ہوئے بولا۔ "مجھ سے سودا کرو۔ مرینہ بہت دولت مند ہے۔ یہ تمہاری یونین کو ہزاروں روپے چندے کے طور پر دے گی۔ اسے نقصان نہ پہنچاؤ۔"

"کیا مجھے احمق سمجھتے ہو؟ یہاں سے بچ کر جانے کے بعد یہ ہمیں ٹھینگا دکھائے گی۔"

"کیا اسے گولی مار کر پھانسی چڑھنا چاہتے ہو؟"

"میں گولی نہیں ماروں گا۔ یہاں لیبارٹری میں تیزاب ہے۔ میں اس کا چہرہ بگاڑ دوں گا۔"

وہ باتوں کے دوران میں بالکل قریب آگیا تھا۔ علی نے اچانک ہی ریوالور کو پکڑ کر اوپر اٹھایا۔ ٹھائیں کی آواز کے ساتھ گولی چل گئی۔ اس نے بہت بڑا خطرہ مول لیا تھا۔ وہ گولی اس کے سینے میں بھی پیوست ہو سکتی تھی لیکن ٹریگر کے دبتے دبتے وہ گولی بازو میں لگی پھر بھی اس نے ریوالور کو نہیں چھوڑا۔ دوسرے ہاتھ سے اس کا گلا دبایا۔ وہ خود کو چھڑانے کی کوششیں کرنے لگا لیکن ایک باڈی بلڈر کی گرفت میں اس کی سانسیں رکنے لگیں۔ اس کے ہاتھ سے ریوالور چھوٹ کر گر پڑا۔ علی نے اسے دھکا دے کر ریوالور کو اٹھالیا۔ اسی وقت پولیس کی گاڑیوں کا سائرن سنائی دینے لگا۔

علی نے اس کا نشانہ لے کر کہا۔ "دونوں ہاتھ گردن پر رکھ کر دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو جاؤ۔"

وہ سہما ہوا تھا۔ اس کے حکم کی تعمیل کرنے لگا۔ مرینہ آ کر علی سے لپٹ گئی۔ کہنے لگی۔ "تمہارے بازو سے خون بہہ رہا ہے۔ تمہیں فرسٹ ایڈ کی ضرورت ہے۔"

وہ اپنا دوپٹا پھاڑ کر اس کے بازو سے باندھنے لگی۔ ایک پولیس انسپکٹر سپاہیوں کے ساتھ آیا۔ اس نے للکارتے ہوئے کہا۔ "خبردار! ریوالور پھینک دو۔"

علی نے اس کی طرف ریوالور پھینکتے ہوئے کہا۔ "یہ یونین لیڈر ہے۔ اس نے مجھ پر گولی چلائی ہے۔ میں نے صرف اپنا بچاؤ کیا ہے۔"

اس یونین لیڈر کو گرفتار کر لیا گیا۔ علی کو فوری طبی امداد پہنچائی گئی۔ بازو کے زخم کی مرہم پٹی ہونے لگی۔ مرینہ اس کے قریب کھڑی رہی۔ کبھی اس کے شانے پر ہاتھ رکھتی رہی۔ کبھی اسے کسی بہانے سے چھوتی رہی۔ اس نے بے شمار دشمنوں سے لڑتے ہوئے اس کی جان بچائی تھی۔ اس کے بدن پر ہلکی سی خراش بھی نہیں آنے دی۔ ایسے جواں مرد پر دل و جان سے قربان ہونے کا جذبہ پیدا ہو رہا تھا۔

اس کے ڈیڈی کو اطلاع ملی تھی کہ مرینہ کے باعث کالج میں فساد برپا ہوا ہے۔ وہ خطرات میں گھری ہوئی ہے۔ اس کے ڈیڈی اور دونوں بھائی اپنے طور پر علیحدہ پولیس افسر اور سپاہیوں کے ساتھ پہنچ گئے۔ انہیں دیکھتے ہی مرینہ دوڑتی ہوئی آ کر اپنے ڈیڈی سے لپٹ گئی۔ کالج کے پرنسپل اور دو تین پروفیسرز بھی وہاں آ گئے تھے۔

مرینہ انہیں علی کی بہادری کے بارے میں بتانے لگی کہ کیسے کیسے اس نے اپنی جان پر کھیل کر اسے بچایا ہے۔ وہ سب اس کی باتیں سن رہے تھے اور حیرانی سے علی کو دیکھ رہے تھے۔ اس کے ایک بھائی نے آگے بڑھ کر علی سے کہا۔ "مجھے تو یقین نہیں آ رہا ہے۔ ایسا سب کچھ فلموں اور ڈراموں میں نظر آتا ہے۔ تم نے بہت دلیری کا مظاہرہ کیا ہے۔"

اس کے ڈیڈی نے کہا۔ "آج کل کوئی کسی کے لئے اپنی زندگی داؤ پر نہیں لگاتا۔ تم نے تو واقعی بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔"

پرنسپل نے کہا۔ "میں فی الحال دونوں یونین کے تمام لڑکوں کے کالج آنے پر پابندی لگاتا ہوں۔ جب تک ان کا کوئی فیصلہ نہیں ہو جاتا تب تک یہ یہاں قدم نہیں رکھ سکیں گے۔"

وہ سب آپس میں گفتگو کر رہے تھے مگر مرینہ کو ان سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ اپنے اردگرد کے ماحول سے بے نیاز ایک ٹک علی کو تک رہی تھی۔ گزرے ہوئے لمحات ایک ایک کر کے ذہن کے پردۂ سکرین پر ابھر رہے تھے۔ جسے وہ اہمیت نہیں دینا چاہتی تھی' ایک اونہہ سے ٹال دینا چاہتی تھی آج وہی دل میں اترتا جا رہا تھا۔ حواسوں پر چھا رہا تھا۔ وہ حیرت سے سوچنے لگی۔ "جب اس سے پہلی بار ملاقات ہوئی تھی تب میں اس کی طرف متوجہ نہیں ہوئی تھی۔ اس وقت بھی یہ چٹان جیسا مرد تھا پھر آج کیوں میرا دل اس

کی طرف مائل ہو رہا ہے؟ کیوں میں اس کے بارے میں اپنائیت سے سوچ رہی ہوں؟"

ذہن سوال کر رہا تھا' دل جواب دے رہا تھا۔ "ہر لڑکی کو محافظ کی ضرورت ہوتی ہے۔ مضبوط پناہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ جہاں وہ خود کو محفوظ سمجھتی ہے۔ مرد کے بازو ہی لڑکی کی اصل پناہ گاہ ہوتے ہیں جن کا گھیرا اسے دشمنوں سے اور مصائب سے دور رکھتا ہے۔ علی نے بھی اسے دشمنوں سے بچایا ہے۔ اپنی جان کی پروا کئے بغیر اس کی حفاظت کی ہے۔ اسی لئے مرینہ اس کی طرف مائل ہو رہی ہے۔"

علی کو طبی امداد دی جا چکی تھی۔ مرینہ کے ڈیڈی بولے۔ "تم نے ہم پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ انعام کے طور پر کیا چاہتے ہو؟ جو مانگو گے وہ ملے گا۔"

وہ بیٹی کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بول رہے تھے۔ مرینہ خیالات سے نکل آئی تھی۔ علی اس کے ڈیڈی کی پیشکش سن کر سر جھکائے سنجیدگی سے کچھ سوچ رہا تھا۔ وہ بغور اسے دیکھ رہی تھی۔ دل دھڑک دھڑک کر خواہش کر رہا تھا کہ وہ میرے گھر والوں سے مجھے مانگ لے۔ جن بازوؤں نے آج میری حفاظت کی ہے' انہیں ہمیشہ کے لئے میرا محافظ بنا دے۔ پلیز علی! مجھے مانگ لو۔ میں انکار نہیں کروں گی۔

اس نے سر اٹھا کر اس کے دونوں بھائیوں کی طرف دیکھا پھر اس کے ڈیڈی سے بولا۔ "آپ نے کہا ہے کہ جو مانگو گے وہ ملے گا۔ یہ بہت بڑی آفر ہے۔ سوچ لیں' میں جو مانگوں گا وہ آپ کو دینا ہوگا۔"

مرینہ کو ایسا لگا' جیسے اس کا دل مٹھی میں بند ہو گیا ہے۔ اسے یقین سا ہونے لگا تھا کہ وہ اس کا ہاتھ مانگنے والا ہے۔ اسی لئے تمہید باندھ رہا ہے۔ یہ خیال آتے ہی اس نے نظریں جھکا لیں۔

اس کے ڈیڈی نے کہا۔ "ہمارے پاس کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔ اللہ کا دیا بہت کچھ ہے۔ تمہیں مایوسی نہیں ہوگی۔"

وہ ٹھہر ٹھہر کر بولنے لگا۔ "آپ کی بیٹی بات کرنے یا کسی کا مسئلہ حل کرنے پر فی منٹ پانچ روپے لیتی ہیں۔ میرا بھی ایک مسئلہ تھا جس کے سلسلے میں انہوں نے مجھ سے پچاس روپے بطور ایڈوانس لئے تھے۔ اب میں نے ان کی جان بچائی ہے۔ ان سے کہیں کہ میرے وہ پچاس روپے لوٹا دیں۔"

وہ بڑی معصومیت سے بول رہا تھا۔ وہ تینوں ہنسنے لگے۔ مرینہ بھی کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔ اسے دیکھنے لگی۔ اس نے از راہ مذاق یہ بات کہی تھی اور اس کا یہ مذاق مرینہ کے دل کو گدگدا رہا تھا۔

بارش کی رم جھم ہو' کالی بدلیاں چھائی ہوں تو جنگل کی ہریالی میں مورنی جھوم جھوم کر ناچنے لگتی ہے۔ یہی اس کی بھی حالت تھی۔ اس کے اندر بھی ساون بھادوں کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔ وہ خیالوں کے ہرے بھرے جنگل میں ناچ رہی تھی' مستی میں جھوم رہی تھی اور ایسا تو ہوتا ہے۔ مستی میں ناچتی ہوئی مورنی جب اپنے بھدے پیروں کو دیکھتی ہے تو ایک دم سے ٹھٹک جاتی ہے۔

وہ بھی اچانک ٹھٹک گئی۔ یاد آیا کہ جس کے لئے مستی میں جھوم رہی ہے' وہ اس کا نہیں سبیکا کا دیوانہ ہے۔ اس روز اس نے لائبریری میں کہا تھا۔ "مجھے صرف اسی سے دوستی کرنی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ میرے لئے پیدا ہوئی ہے اور اگر ایسا نہیں ہے تو کوئی میرے لئے پیدا نہیں ہو سکتی۔"

وہ کشمکش میں مبتلا ہو گئی۔ پریشانی سے سوچنے لگی۔ "وہ تو سبیکا سے دوستی کا خواہاں ہے۔ اس کے لہجے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ بات دوستی سے بڑھ کر عشق و محبت تک پہنچ رہی ہے۔ اگر ایسا ہی ہے تو اس نے محافظ بن کر مجھے دشمنوں سے کیوں بچایا؟ کوئی کسی کے جھگڑے میں بے وجہ نہیں الجھتا۔ اس کے پیچھے کوئی نہ کوئی جذبہ ضرور چھپا ہوتا ہے۔ کیا علی کے دل میں میرے لئے ایسا ہی کوئی چور جذبہ تھا جس کے تحت اس نے میری عزت بچائی؟ ہو سکتا ہے ایسا ہی ہو؟ میں سبیکا سے کم تو نہیں ہوں۔ وہ قبول صورت ہے' میں خوبصورت ہوں۔ اس کی طرح دولت و جائیداد کی تنہا وارث نہ سہی مگر دولت مند تو ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ علی اس کی خاموشی سے بیزار ہو کر میری طرف مائل ہو جائے۔"

اس نے ایسے ہی خیالوں میں الجھتے سلجھتے رات گزاری۔ دوسرے دن کالج کی فضا میں سکون چھایا ہوا تھا۔ اسٹوڈنٹس کی حاضری میں اضافہ ہو گیا تھا۔ جب سے یونین کے جھگڑے شروع ہوئے تھے تب سے سبیکا غیر حاضر رہی تھی۔ وہ کالج پہنچی تو ہر دوسرا اسٹوڈنٹ علی کی تعریفیں کر رہا تھا۔

وہ حیرت سے سوچنے لگی۔ "ان تین چار دنوں میں ایسا کیا ہو گیا ہے کہ ہر ایک کی

زبان پر علی کا تذکرہ ہے۔ کیا وجہ ہے کہ وہ سب کا موضوعِ گفتگو بنا ہوا ہے؟"

وہ اپنی کلاس فیلوز کے پاس آئی۔ انہوں نے گذشتہ روز ہونے والے جھگڑے اور علی کے کارنامے کے بارے میں تفصیل سے بتایا۔ وہ بڑی حیرت اور خوشی کے جذبے سے سرشار ہو کر سن رہی تھی۔ ایسے ہی وقت اسے لگا کہ وہ اس پر انجانا سا فخر محسوس کر رہی ہے۔ ایسا جذبہ تو کسی اپنے کے لئے پیدا ہوتا ہے۔

مرینہ تو اس سے زیادہ فخر محسوس کر رہی تھی کیونکہ علی کی جواں مردی کو اس سے منسوب کیا جا رہا تھا۔ جہاں علی کا ذکر ہوتا تھا' وہاں اس کا بھی نام آتا تھا۔ وہ اسے ڈھونڈتی پھر رہی تھی۔ اب تو اس نے اتنی شہرت حاصل کر لی تھی کہ کہیں تنہا نہیں رہ سکتا تھا۔ لڑکیاں اور لڑکے سب اس سے ملنے اور باتیں کرنے کے خواہشمند تھے۔

مرینہ چلتے چلتے ایک جگہ رک گئی۔ وہ طلبہ اور طالبات کے ہجوم میں گھرا ہوا تھا۔ وہ مسکرانے لگی۔ ایک لڑکی نے کہا۔ "یہ آگئی مرینہ.........."

سب ہی اس کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ علی کی طرف آنے سے شرمانے اور جھجکنے لگی۔ دو لڑکیوں نے آکر اسے دونوں طرف سے پکڑا اور اسے کھینچ کر علی کے پاس لانے لگیں۔ ایک لڑکی نے کہا۔ "ہائے میری بنو! اب کیا شرمانا؟ تم دونوں کا عشق تو بڑے دھاکے کر رہا ہے۔ اب یہ چھپائے نہیں چھپے گا۔"

مرینہ نے مسکرا کر چور نظروں سے علی کو دیکھا۔ وہ پریشان ہو کر بولا۔ "ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ آپ لوگ غلط سوچ رہے ہیں۔ مرینہ کی جگہ کوئی بھی لڑکی یا لڑکا ایسی مصیبت میں مبتلا ہوتا تو میں اس کے لئے بھی جان کی بازی لگا دیتا۔"

مرینہ بجھ سی گئی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ بھرے مجمع میں وہ عشق کی نفی کرے گا۔ یہ دل دکھانے والی بات تھی۔ اس نے عشق کے تقاضے پورے نہیں کئے تھے۔ ایک بڑا فرض ادا کیا تھا۔ بس۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں تھا۔

ایک لڑکی نے اس سے پوچھا۔ "ہائے مرینہ! یہ علی کیا کہہ رہا ہے؟"

اس نے سوال کرنے والی لڑکی کی طرف دیکھا۔ اس کا سوال ایک طنز کی طرح آکر لگا تھا جیسے کہہ رہی ہو کہ یہ ہیرو صرف تمہاری نہیں کسی کی بھی جان بچا سکتا تھا۔ اس چبھتے ہوئے سوال نے اس کی اہمیت ختم کر دی۔ اس نے ایک نظر علی پر ڈالی پھر لڑکی کی طرف

جھک کر بولی۔ "کچھ باتیں پردے میں رکھ کر بھی کی جاتی ہیں۔"

علی نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ ڈھٹائی سے مسکرا رہی تھی۔ ایک اور لڑکی نے کہا۔ "اگر علی یہ جذبہ دوسروں کے لئے بھی رکھتا ہے تو انسانیت کے ناتے میں سمجھتی ہوں کہ غلط نہیں ہے۔ ہمیں اس کے جذبے کی قدر کرنی چاہئے۔"

مرینہ نے چبھتی ہوئی نظروں سے اس لڑکی کو دیکھا پھر ذرا لاپرواہی سے بولی۔ "میں کسی کے جذبوں کا حساب نہیں رکھتی۔ صرف اپنے احساسات کو سمجھتی ہوں۔"

وہ لڑکی طنزیہ انداز میں مسکرا کر بولی۔ "درست کہہ رہی ہو۔ تمہیں رقم کے حساب سے فرصت نہیں ملتی اسی لئے دوسروں کے جذبات کا حساب نہیں رکھ پاتیں۔"

ایک دم اسے سبیکا کا خیال آیا۔ اس کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات ابھرنے لگے۔ وہ زیرِ لب بڑبڑائی۔ "حساب تو مجھے سبیکا سے لینا ہے۔"

اس نے سوچا' اگر یہاں باتوں میں الجھتی رہی تو دیر ہو جائے گی۔ کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے یہاں سے نکلنا چاہئے۔ وہ وہاں سے جاتے ہوئے بولی۔ "مجھے پرنسپل سے ملنا ہے تم لوگ انجوائے کرو۔ پھر تمہیں جوائن کروں گی۔"

وہ وہاں سے چلتی ہوئی کوریڈور میں آئی۔ اس کی نظریں سبیکا کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ یہ خیال بھی آ رہا تھا کہ کالج میں ہونے والے واقعے کا تعلق علی سے ہے۔ سب ہی اس کی تعریفیں کر رہے ہیں۔ اس سے باتیں کر رہے ہیں۔ کیا سبیکا نے بھی اس سے بات کی ہوگی؟

وہ کلاس رومز میں جھانکتی ہوئی دوسرے کوریڈور میں آئی تو وہاں سبیکا کتابیں سنبھالے اپنی کلاس فیلوز سے باتوں میں مصروف نظر آئی۔ وہ سوچنے لگی کہ سب کے سامنے بات کرنا مناسب نہیں ہے۔ اسے کسی بہانے سے بلانا ہوگا۔

اس نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "سبیکا! تمہیں سر حمید بلا رہے ہیں۔"

اس نے پلٹ کر دیکھا پھر چلتی ہوئی اس کے قریب آکر بولی۔ "نئی زندگی مبارک ہو۔ میں کافی دیر سے تمہیں تلاش کر رہی تھی۔ کہاں تھیں تم؟"

وہ اس کے ساتھ چلتی ہوئی مسکرا کر بولی۔ "جسے اللہ رکھے' اسے کون چکھے۔ وہ میری زندگی برباد کر دینا چاہتے تھے لیکن علی نے بچا لیا۔ سب ہی اس کے کارنامے کے

گن گا رہے ہیں۔ میں اس کے پاس تھی۔"

"ہاں۔ یہ تو ہے۔ اسی کی وجہ سے آج یونین لیڈر اور اس کے چند آلہ کار سٹوڈنٹ حوالات میں بند ہیں اور کالج کی فضا میں امن ہے۔ یہ علی کے لئے بڑے اعزاز کی بات ہے۔"

اس نے گہری نظروں سے اسے دیکھا پھر کہا۔ "وہ مبارک باد کا حقدار ہے۔ کیا تم نے اس سے ملاقات کی؟"

وہ اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولی۔ "ابھی تک وہ مجھے کہیں دکھائی نہیں دیا ہے۔ ملے گا تو ضرور مبارک باد دوں گی۔ ایسے اسٹوڈنٹ کی حوصلہ افزائی کرنی چاہئے۔"

"لیکن تم تو اس سے کتراتی ہو۔ بات کرتے ہوئے الجھتی ہو۔"

وہ چلتے چلتے ٹھٹک گئی پھر بولی۔ "میں سمجھتی ہوں' یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔"

وہ اس کے چہرے کے تاثرات پڑھنے کی کوشش کر رہی تھی پھر بولی۔ "میں تمہاری طرح خوش نصیب نہیں ہوں۔ تم اپنے معاملے میں کسی کو شیئر نہیں کرنا چاہتیں' اور ایسا ہی کر رہی ہو مگر میرا معاملہ تو میری ذات سے نکل کر اسٹوڈنٹس کی زبان تک جا پہنچا ہے۔ علی کو مجھ سے منسوب کر کے اسکینڈل بنایا جا رہا ہے۔"

اس نے گہری سنجیدگی سے اسے دیکھا۔ وہ علی سے کتراتی تھی لیکن مرینہ کی بات سن کر اس کے دل میں کہیں حسد کی چنگاری سلگ اٹھی۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی علی کی طرف جھکنے لگی ہے' اسے چوری چھپے چاہنے لگی ہے۔

سبیکا نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ "تم بتاؤ۔ کیا تمہیں اسکینڈل بننا اچھا لگ رہا ہے؟"

وہ بغور اسے دیکھ رہی تھی پھر سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔ "سچ پوچھو تو بہت اچھا لگ رہا ہے۔ اس چٹان جیسے مرد سے منسوب ہو کر کوئی بھی لڑکی فخر حاصل کر سکتی ہے لیکن یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ تم کیوں اس سے کتراتی ہو؟ کیا اس لئے کہ وہ مڈل کلاس سے تعلق رکھتا ہے؟"

"نہیں۔"

"پھر کیا وجہ ہے کہ وہ تم سے بات کرنا چاہتا ہے اور تم اس سے دور بھاگتی ہو؟"

وہ ایک جگہ رک گئی۔ حسرت سے سوچنے لگی۔

مرینہ نے اسے سوچوں میں گم دیکھ کر چٹکی بجاتے ہوئے پوچھا۔ "کہاں گم ہو گئیں؟"

وہ چونکتے ہوئے بولی۔ "آں۔ کہیں نہیں۔ وہ دراصل بات یہ ہے کہ علی مجھ سے جونیئر ہے۔"

"یہ تو کوئی وجہ نہیں ہوئی۔ میں سیکنڈ ایئر میں ہوں۔ وہ مجھ سے ایک سال جونیئر ہے لیکن میں تو اس سے بات کرتی ہوں۔ وہ کلاس میں ہم سے جونیئر ہے لیکن عمر میں تو سینئر ہے۔"

وہ گہری سانس لے کر بولی۔ "اس کا قد' اس کی جسامت نظروں کا دھوکا ہے۔ جانتی ہو؟ وہ مجھ سے عمر میں تین برس چھوٹا ہے۔"

حیرت کے مارے اس کا منہ کھلا رہ گیا۔ اس نے بے یقینی سے پوچھا۔ "آئی ڈونٹ بی لیو دس۔ یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ وہ تو پچیس چھبیس سال کا بھرپور جوان دکھائی دیتا ہے۔ تمہیں کیسے اندازہ ہوا کہ وہ تم سے تین برس چھوٹا ہے؟"

"اس کی تاریخ پیدائش سے۔ اس کے مطابق وہ انیس برس کا ہے۔"

مرینہ کے چہرے پر ایک دم اطمینان کے تاثرات ابھر آئے۔ وہ مسکرانے لگی۔ مسکراہٹ میں فاتحانہ انداز تھا جیسے کہہ رہی ہو کہ اب سبیکا' علی کو مجھ سے نہیں چھین سکتی۔ وہ اپنی بے انتہا دولت اور جائیداد کے بل پر بھی اس فرق کو نہیں مٹا سکتی۔ ایسا اسکینڈل جس میں لڑکا لڑکی کے مقابلے میں کم عمر ہو مذاق بن جاتا ہے اور سبیکا شاید ایسا کبھی نہیں چاہے گی۔ مگر میں علی کی ہم عمر ہوں۔ ایک دن کے واقعے نے ہمارا افیئر عروج پر پہنچا دیا ہے۔ ابھی وہ مجھ سے کترا رہا ہے لیکن جب اس مجنوں کو علم ہو گا کہ لیلیٰ عمر میں بڑی ہے تو وہ خود بخود میری طرف مائل ہونے لگے گا۔ عروج پر پہنچا ہوا افیئر اسے حوصلہ دے گا۔

سبیکا کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ "سر حمید کہاں ہیں؟"

وہ عجیب سی سرشاری محسوس کر رہی تھی۔ خود کلامی کے انداز میں بولی۔ "تمہارے دل سے نکل کر میرے دل میں۔"

اس نے تعجب سے پوچھا۔ "کیا کہہ رہی ہو؟"
وہ ایک دم سے چونک کر بولی۔ "آں۔ تم کیا پوچھ رہی ہو؟"
"تم نے کہا تھا' سرحمید نے مجھے بلایا ہے۔ وہ کہاں ہیں؟"
"تم نے دیر کر دی۔ وہ ابھی آفس سے نکل کر کار میں بیٹھ کر چلے گئے ہیں۔"
"تمہیں کیسے پتہ چلا؟"
وہ کالج گیٹ کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "میں نے ابھی انہیں جاتے ہوئے دیکھا ہے۔"

اتنا کہہ کر وہ آگے بڑھ گئی۔ سبیکا کچھ نہ سمجھتے ہوئے کندھے اچکا کر اسے جاتے ہوئے دیکھنے لگی پھر لان میں آ گئی۔ ایک جگہ اسٹوڈنٹس کا ہجوم نظر آیا۔ علی ان کے درمیان گھرا ہوا تھا۔ اسے بڑی پذیرائی مل رہی تھی۔ وہ اس کے بارے میں اپنائیت سے سوچ رہی تھی۔ اس کا اہمیت حاصل کرنا اور موضوعِ گفتگو بننا اسے اچھا لگ رہا تھا۔ بس۔ ایک کسک سی تھی کہ اس کے نام کے ساتھ مرینہ کا نام لیا جا رہا تھا۔

اسے ایک دم سے خیال آیا کہ اسے علی کے پاس جانا چاہئے۔ اس کی بہادری پر اسے داد دینی چاہئے۔ یہ سوچ کر وہ آگے بڑھی ہی تھی کہ علی کو اپنی طرف آتا دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ وہ دھیرے دھیرے چلتا ہوا اس کے قریب آ کر رک گیا۔ نظریں ملیں پھر جھک گئیں۔ وہ ٹھہر ٹھہر کر بولنے لگی۔ "مبارک ہو۔ تم نے ایک ہی دن میں اپنی بہادری کا مظاہرہ کر کے اس کالج میں منفرد مقام حاصل کر لیا ہے۔"

وہ اسے ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھ کر بولا۔ "یہ مقام تو اچانک ہی حاصل ہو گیا ہے لیکن جس مقام پر میں پہنچنے کی کوشش کر رہا ہوں' پتہ نہیں وہاں تک رسائی کب حاصل ہو گی؟"

وہ اس کی بات سمجھ رہی تھی' اور سوچ رہی تھی' اسے نہیں معلوم کہ جس مقام تک یہ رسائی حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس کے بہت قریب پہنچ چکا ہے لیکن وہ یہ بات ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس لئے اس کے سوال کو سمجھنے کے باوجود دوسرے انداز میں جواب دینے لگی۔ "تم جیسے بہادر تو ستاروں پر کمند ڈال سکتے ہیں اور میں سمجھتی ہوں' اگر ہم سب اسٹوڈنٹس تم پر فخر کریں تو کچھ غلط نہ ہو گا۔"

"تم سب کی بات کر رہی ہو۔ جبکہ میں صرف تمہارے جذبات جاننا چاہتا ہوں۔ کیا تم مجھ پر فخر کر رہی ہو؟"
وہ اس کے سوال پر گڑبڑا کر بولی۔ "ظاہر ہے' تمام اسٹوڈنٹس تمہاری تعریفیں کر رہے ہیں۔ خوش ہو رہے ہیں' میری بھی یہی فیلنگز ہیں۔ ہمیں خوشی ہے کہ تم ہمارے کالج کے اسٹوڈنٹ ہو۔"
وہ گہری نظروں سے اسے دیکھ کر بولا۔ "کیا میرے اور تمہارے درمیان صرف یہی تعلق ہے کہ ہم اس کالج کے اسٹوڈنٹ ہیں؟ اس کے علاوہ اور کوئی تعلق نہیں ہے؟ کوئی دلی جذبہ نہیں ہے؟"
"مجھ سے ایسی باتیں نہ کرو۔"
"کیوں نہ کروں۔ آج ہر طرف میری واہ واہ ہو رہی ہے۔ سب ہی سے محبتیں مل رہی ہیں لیکن تم سے محبت نہ ملی تو میں اپنی نظروں میں گر جاؤں گا۔"
"تم جیسی محبت چاہتے ہو' ویسی میں نہیں دے سکتی۔"
"کیوں نہیں دے سکتیں؟ کیا اس لئے کہ میں مڈل کلاس سے تعلق رکھتا ہوں؟"
"یہ بات نہیں ہے۔ میں امیری اور غریبی کے فرق کو نہیں مانتی۔"
"پھر مجھ میں کیا کمی ہے؟ مجھ میں کوئی خرابی ہے تو بتاؤ۔ میں اسے دور کرنے کی کوشش کروں گا۔ تمہارے انکار کی کوئی تو وجہ ہو گی؟"
"میں کیا بتاؤں؟ کیا تم نہیں جانتے؟"
"میں کیا جانتا ہوں؟ تم کہنا کیا چاہتی ہو؟ کیا میرے تمہارے درمیان جاننے کے لئے کچھ رہ گیا ہے؟"
"ہاں۔ ہمارے درمیان عمر کا بہت بڑا فرق ہے۔ میں تم سے تین برس بڑی ہوں۔"
وہ باتیں کرتے ہوئے ایک کلاس روم میں آ گئے تھے۔ وہ کلاس خالی تھی۔ وہاں کوئی اسٹوڈنٹ نہیں تھا۔ وہ ایک دم سے اس کے قریب آ گیا۔ سبیکا کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ بولا۔ "دیکھو۔ تم مجھ سے اتنی چھوٹی ہو کہ مجھے دیکھنے کے لئے تمہیں سر اٹھانا پڑتا ہے۔ تم پیار سے کہہ رہی ہو کہ اس سے تین برس اونچی ہو۔"

وہ اس کی قربت سے گھبرا کر پیچھے ہٹتے ہوئے دیوار سے لگ گئی۔ وہ اس سے لگ گیا۔ پیچھے دیوار، آگے چٹان۔ وہ جیسے پس کر رہ گئی۔ دھڑکنوں پر ایسا دباؤ پڑا کہ وہ رک رک کر سانسیں لینے لگی۔ بات اٹک اٹک کر منہ سے نکلنے لگی۔ "ک..........
کوئی.......... دیکھ لے گا۔ چھو.......... چھوڑو.......... پلیز.......... چھوڑ دو مجھے۔"

وہ بولا۔ "ابھی بازوؤں میں دبوچ لوں گا تو ایک چیونٹی کی طرح نظر بھی نہیں آؤ گی لیکن میں جبر نہیں کرتا۔ صبر کرتا ہوں۔"

وہ ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر گہری گہری سانسیں لینے لگی۔ گری ہوئی کتابوں کو جھک کر اٹھاتے ہوئے اس سے نظریں چرانے لگی۔ وہ کتابیں اٹھا کر اس سے نظریں ملائے بغیر جانا چاہتی تھی لیکن اٹھ کر کھڑی ہوئی تو پتہ چلا، کلاس روم اس کے وجود سے خالی ہے۔ وہ جا چکا تھا۔

پھر وہ سحرزدہ سی رہی۔ ساری دنیا کو بھول گئی پھر ایک بار اسی دیوار سے لگ کر اس بوجھ کو تازہ دم کرتی رہی۔ کلاس اٹینڈ کرنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ ان لمحات میں وہ عمر کا حساب بھول گئی تھی۔ وہاں سے آہستہ آہستہ چلتی ہوئی کوریڈور میں آئی۔ اس کا انداز ایسا تھا، جیسے خوابیدہ ہو، نیند میں چل رہی ہو۔

دوسری طرف سے مرینہ آ رہی تھی۔ اسے دیکھ کر رک گئی لیکن سبیکا کو اپنے آس پاس کا کوئی ہوش نہیں تھا۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں، مگر اس نے مرینہ کو نہیں دیکھا۔ وہ اسے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ جب وہ پلکیں جھپکائے بغیر سامنے دیکھتی ہوئی گزرنے لگی تو اس نے آواز دی۔ "اے!"

اس نے آواز نہیں سنی، پہاڑ سے ٹکرانے کا انجام یہی ہوتا ہے، کان بہرے ہو جاتے ہیں، دنیا کی کوئی آواز سنائی نہیں دیتی۔ اس نے پھر اسے آواز دی۔ وہ چلی جا رہی تھی۔ مرینہ نے آگے بڑھ کر اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اسے ہولے سے جھنجھوڑا۔ اسے آواز دی۔ "سبیکا!"

وہ جیسے نیند سے چونک گئی۔ چلتے چلتے رک گئی۔ آس پاس دیکھنے لگی کہ کس نے آواز دی ہے؟ مرینہ نے اس کے شانے کو تھپک کر کہا۔ "کہاں ہو تم؟"

سبیکا نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ اسے دیکھ کر یاد آیا کہ وہ علی کے ساتھ ہونے والے

اسکینڈل سے بہت خوش ہو رہی تھی، علی کو اپنا ہیرو سمجھ رہی تھی۔ یہ سوچتے ہی وہ مسکرانے لگی۔ مرینہ نے اسے تعجب سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "ابھی تو اپنے ہوش و حواس میں نہیں تھیں، اور اب مجھے دیکھ کر مسکرا رہی ہو؟ کیا بات ہے؟"

وہ ہنسنے لگی۔ بڑے اعتماد سے ہنسنے لگی۔ اعتماد یہ تھا کہ وہ میرا ہے، صرف میرا ہے۔ وہ فرائض ادا کرنے کے لئے کسی کا بھی ہیرو بن سکتا ہے لیکن دیوانہ صرف میرا ہے۔

وہ حیرانی سے سبیکا کو دیکھ رہی تھی پھر اس نے پوچھا۔ "تم نارمل تو ہو نا؟ پہلے مسکرا رہی تھیں۔ اب ہنس رہی ہو۔ کیا میں تمہیں کارٹون لگ رہی ہوں؟"

وہ ہنستے ہوئے بولی۔ "ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ فار یور انفارمیشن۔ میں ایب نارمل تھی، اب نہیں ہوں۔"

"پہلے کب ایب نارمل تھیں؟"

اس کی ہنسی نہیں رک رہی تھی۔ حالانکہ کوئی ہنسنے کی بات نہیں تھی لیکن وہ چھیلا اندر سے اسے گدگدا رہا تھا۔ وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنسی کو روکتے ہوئے بولی۔ "میں خواہ مخواہ عمر کا حساب کر رہی تھی۔ بھلا مرد کبھی عورت سے چھوٹا ہوتا ہے؟ وہ تو پہاڑ ہوتا ہے۔ اس کے سامنے آنے والی اونٹنی سکڑ کر، سمٹ کر چٹکی بھر رہ جاتی ہے۔"

مرینہ کو شاک پہنچا۔ خود کو تین برس بڑی سمجھنے والی اب اپنے آپ کو چٹکی بھر کہہ رہی تھی، اس کا دل جلا رہی تھی، اس کی آرزوؤں اور ارمانوں کے خلاف بول رہی تھی اور اس کے ارادوں کو ملیا میٹ کر رہی تھی۔

وہ ناگواری سے بولی۔ "یہ کیا کہہ رہی ہو؟ کیا پہاڑ کے سامنے اپنا وجود ہی ختم ہو جاتا ہے؟ خود پر پہاڑ کی ہیبت طاری کر لینے سے اپنی عمر کم نہیں ہو جاتی۔"

وہ پھر ہنسنے لگی۔ ہنستے ہوئے پلٹ کر جانے لگی۔ مرینہ نے کہا۔ "تم ہوا میں اڑ رہی ہو۔ آج تم میرے ایک مشورے پر ضرور عمل کرو، گھر جا کر آئینہ ضرور دیکھو۔ تمہارے چہرے سے عمر کا پکا پن نظر آئے گا۔"

پھر وہ "اونہہ" کہہ کر جواب سنے بغیر وہاں سے چلی گئی۔ سبیکا کو اس کی اونہہ کی پروا تھی نہ آہ کی۔ اس کے اندر تو مسرت بھری ہائے ہائے ہو رہی تھی۔ بقول مرینہ، وہ ہواؤں میں اڑ رہی تھی۔ پتہ ہی نہیں چل رہا تھا کہ قدم زمین پر پڑ رہے ہیں یا نہیں؟ وہ کیسے اپنی

کار کی پچھلی سیٹ پر آکر بیٹھی اور کتنی جلدی اپنی شاندار کوٹھی میں پہنچ گئی؟ کچھ پتہ ہی نہ چلا۔

وہ ڈرائنگ روم میں آئی تو اس کے ڈیڈی ایک صوفے پر بیٹھے کسی سے بات کر رہے تھے۔ وہ دوڑتی ہوئی آکر ان کے پاس بیٹھ گئی۔ ان کے ہاتھ سے ریسیور چھین کر اسے کریڈل پر رکھ دیا۔ انہوں نے کہا۔ ”ارے کیا کرتی ہو؟ میں بہت ضروری بات کر رہا ہوں۔“

وہ اچھل کر صوفے پر دو زانو ہو کر بولی۔ ”کیا آپ کی باتیں مجھ سے زیادہ ضروری ہیں؟“

انہوں نے مسکرا کر کہا۔ ”تم تو میری جان ہو اور جان سے زیادہ کوئی ضروری نہیں ہوتا۔“

”ڈیڈی! آج میں بہت خوش ہوں۔ جی چاہتا ہے‘ دور دور تک اڑتی پھروں۔“

”پھر تو ہم ساری دنیا کو بھول کر اپنی بیٹی کی خوشیوں میں خوش رہیں گے۔ بولو۔ میں تمہاری خوشیوں میں کس طرح شیئر کروں؟“

”ڈیڈی! آپ پورے خاندان میں اور دوست احباب میں میرے لئے رشتہ ڈھونڈتے رہتے ہیں اور آپ کو کبھی کوئی لڑکا پسند نہیں آتا۔“

”تمہیں بھی تو پسند نہیں آتا۔ تم ہر ایک میں کوئی نہ کوئی خامی نکالتی رہتی ہو۔ میری تو ایک ہی بنیادی سوچ ہے کہ لڑکا اونچے خاندان کا ہو اور وہ میرا گھر داماد بن کر رہے۔ تم میری تمام دولت اور جائیداد کی وارث ہو۔ میں نہیں چاہتا کہ یہ سب کچھ یہاں سے باہر جائے۔“

وہ صوفے پر پہلو بدلتی ہوئی بولی۔ ”ڈیڈی! وہ ایسے ہی ہیں۔ آپ انہیں گھر داماد بننے پر مائل کر سکیں گے۔“

”کس کی بات کر رہی ہو؟“

”وہ ہمارے کالج میں پڑھتا ہے۔ اس کا نام علی رمزی ہے۔ کالج کے ایک اسٹوڈنٹ سے لے کر پروفیسرز اور پرنسپل تک اس کی واہ واہ کر رہے ہیں۔ سب ہی اس کے گُن گا رہے ہیں۔“

انہوں نے خوش ہو کر پوچھا۔ ”وہ لڑکا کرتا کیا ہے؟ میرا مطلب ہے‘ کرتا تو کچھ بھی نہیں ہوگا۔ ابھی تو پڑھ رہا ہے۔ اس کے باپ کا کوئی کاروبار ضرور ہوگا۔ اس کا فیملی بیک گراؤنڈ بتاؤ؟“

”میں اس کے فیملی بیک گراؤنڈ کے بارے میں زیادہ کچھ نہیں جانتی۔ اس کا تعلق مڈل کلاس سے ہے۔ آپ اسے دیکھتے ہی پسند کرلیں گے۔“

عبدالقادر سومرو کے چہرے پر ایک رنگ آیا اور گزر گیا۔ اس نے جبراً مسکرا کر کہا۔

”اس میں ایسی کیا بات ہے جو میں اسے دیکھتے ہی پسند کرلوں گا؟“

”وہ ذہین بھی ہے اور دلیر بھی۔ اس نے ایک سیاسی پارٹی کی اسٹوڈنٹس یونین کو کالج سے اکھاڑ پھینکا ہے۔“

باپ نے اسے چونک کر دیکھا۔ اسے کل شام ہی یہ رپورٹ مل چکی تھی کہ ان کا ایک سیاسی اسٹوڈنٹ لیڈر اور کئی کارکن گرفتار ہو چکے ہیں اور اس کالج سے نکال دیئے گئے ہیں اور بیٹی اس اسٹوڈنٹ کی تعریف کر رہی تھی جس کی وجہ سے ان کا ایک سیاسی لیڈر اور کئی کارکن گرفتار ہو گئے تھے۔

انہوں نے پوچھا۔ ”تم نے کیا نام بتایا ہے اس کا؟“

”علی رمزی۔ ڈیڈ! میں کیا بتاؤں؟ اس نے تنہا کئی لڑکوں سے مقابلہ کیا تھا۔ ان کے لیڈر سے ریوالور چھین لیا۔ وہ بہت ہی شہ زور ہے۔“

”بیٹی! ایسی شہ زوری صرف کتابوں کی دنیا تک رہتی ہے۔ لڑکے کو کسی کاروباری خاندان سے تعلق رکھنا چاہئے تاکہ وہ ہمارا کاروبار سنبھال سکے۔“

”وہ بہت ذہین ہے۔ اگر آپ اسے ٹریننگ دیں گے اور وہ تعلیم بھی حاصل کرتا رہے گا تو آپ کا تمام کاروبار سنبھالنے کے قابل ہو جائے گا۔“

وہ پریشان ہو کر سوچتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے پوچھا۔ ”تم کس حد تک اس سے متاثر ہو؟ کیا اسے نظرانداز کر سکتی ہو؟“

”او نو۔ ڈیڈ! کیا آپ نے مجھے کبھی اتنا خوش دیکھا؟ کیا آپ میری خوشیوں سے اندازہ نہیں لگا سکتے کہ میں اسے کس قدر چاہتی ہوں؟“

وہ فکرمندی سے سر جھکا کر بولا۔ ”پھر تو مجھے کچھ کرنا ہی ہوگا۔“

"کرنا کیا ہے ڈیڈی؟ پہلے تو ایک بار آپ اس سے مل لیں۔ آپ نے تو دنیا دیکھی ہے۔ اسے دیکھتے ہی اپنی بیٹی کے انتخاب پر فخر کریں گے۔"

وہ معنی خیز انداز میں بولا۔ "ہاں۔ اس سے تو ملنا ہی ہوگا۔"

"کیا میں کل اسے یہاں لے آؤں؟"

"ہاں۔ ضرور لے آؤ۔ کل کس وقت لاؤ گی؟"

"کل کالج سے واپسی پر ساتھ لے آؤں گی۔"

"میں نہیں چاہتا کہ تم اس کے ساتھ دیکھی جاؤ۔ پہلے میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔ میرے فیصلے سے پہلے تمہارا کسی کے ساتھ آنا جانا مناسب نہیں ہے۔"

"آل رائٹ ڈیڈی! میں اس سے کہوں گی کہ وہ کل شام پانچ بجے یہاں آ جائے۔ آپ اسے پسند کریں گے نا؟"

"ہم باپ بیٹی کی پسند ہمیشہ ایک رہی ہے۔ کل کی ملاقات ایسی نتیجہ خیز رہے گی جسے وہ ساری زندگی یاد رکھے گا۔"

اس نے خوش ہو کر باپ کو کِس کیا پھر وہاں سے اٹھ کر دوڑتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ وہ اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی تو اس نے بڑی حقارت سے منہ بنایا۔ سامنے دیوار کی طرف دیکھ کر تھوڑی دیر تک سوچتا رہا پھر ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کرنے لگا۔ جلد ہی رابطہ قائم ہو گیا۔ اس نے کہا۔ "ہیلو۔ میں عبدالقادر سومرو بول رہا ہوں۔"

دوسری طرف سے پارٹی لیڈر کی آواز سنائی دی۔ "ہیلو مسٹر سومرو! میں ابھی آپ کو فون کرنے ہی والا تھا۔ کل رات آٹھ بجے ہماری ایک اہم میٹنگ ہے۔ اس میں آپ کی موجودگی بہت ضروری ہے۔"

"میں آ جاؤں گا۔ کل ہماری کالج یونین کا ایک لیڈر گرفتار ہوا تھا۔ اس نے آپ سے کہا تھا کہ کسی ایک لڑکے کی وجہ سے اس کی گرفتاری عمل میں آئی ہے۔"

"جی ہاں۔ اس ایک لڑکے کی وجہ سے اس کالج میں ہماری یونین کی پوزیشن بہت کمزور ہو گئی ہے۔ ہم نے بڑی مشکلوں سے اس خبر کو اخبارات میں آنے سے روکا ہے۔"

"آپ کو اس لڑکے کا نام یاد ہے؟"

"اس کا نام کیسے بھول سکتا ہوں؟ اس کالج میں اپنی یونین کی پوزیشن کو پہلے کی طرح بحال کرنا ہے۔ ایسا کرنے سے پہلے اس لڑکے کو وہاں سے نکالنا ہوگا یا پھر اسے بڑی رقم کا لالچ دے کر اپنی یونین میں شامل کرنا ہوگا۔"

"آپ نے اس کا نام نہیں بتایا؟"

"اس کا نام علی رمزی ہے۔ ایسے دلیر اور ضدی لڑکے کو ہمارا حمایتی ہونا چاہئے۔"

"میں معلوم کروں گا کہ وہ لڑکا بک سکتا ہے یا نہیں۔ اچھی بات ہے' کل میٹنگ کے وقت ملاقات ہوگی۔"

اس نے فون بند کر دیا۔ پیشانی پر بل ڈال کر گہری سنجیدگی سے سوچنے لگا۔ پیشانی کی لکیریں ایسی الجھی ہوئی تھیں جیسے مکڑی جالا بن رہی ہو۔

☆======☆======☆

علی کالج کے گیٹ سے داخل ہوتے وقت ٹھٹک گیا۔ گیٹ کے کھلے ہوئے دونوں پٹوں پر پوسٹر نما کاغذات چپکے ہوئے تھے۔ ان پر لکھا ہوا تھا۔

"تین برس کی بڑھیا زیرو میٹر کے لڑکے سے عشق کر رہی ہے۔"

یہ تحریر ایسی الجھی ہوئی تھی کہ کوئی بھی اسے پڑھنے اور سوچنے پر مجبور ہو جاتا اور تحریر کا مطلب سمجھنے کی کوشش کرتا۔ پہلے تو علی کی سمجھ میں نہیں آیا پھر یوں لگا جیسے اس تحریر کا تعلق اس سے ہے۔ تین کے عدد سے یاد آیا۔ سبیکا نے اس سے کہا تھا کہ وہ اس سے تین برس بڑی ہے اور سامنے پوسٹر پر لکھا تھا۔ تین برس کی بڑھیا۔

اس نے سوچا۔ "کیا یہ سبیکا کے بارے میں لکھا گیا ہے؟"

زیرو میٹر کے لڑکے کا مفہوم یہ سمجھ میں آیا کہ کورا اور کنوارا لڑکا۔ اس نے سوچا۔ "کیا یہ میرے بارے میں لکھا گیا ہے؟"

یہی بات سمجھ میں آ رہی تھی۔ وہ پریشان ہو کر آگے بڑھتے ہوئے سوچنے لگا۔ "اگر واقعی یہ میرے اور سبیکا کے بارے میں لکھا گیا ہے تو کس نے لکھا ہے؟ ابھی یہ معاملہ میرے اور اس کے درمیان ہے پھر کسی تیسرے کو کیسے معلوم ہو گیا؟"

آگے بڑھتے وقت وہ کالج کی دیواروں پر جگہ جگہ ایسے پوسٹرز دیکھ رہا تھا۔ ان میں یہی لکھا تھا۔

"تین برس کی بڑھیا زیرو میٹر کے لڑکے سے عشق کر رہی ہے۔"

کالج کے باہر باغیچے میں، اندر کوریڈورز اور کلاسوں میں لڑکے لڑکیاں ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے، اس تحریر کا مطلب کیا ہے؟ یہ تین برس کی بڑھیا کیا ہوتی ہے؟ اور یہ زیرو میٹر سے تو صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ لڑکا کم عمر ہے۔ بڑھیا کے حوالے سے زیرو میٹر کا مطلب یہی سمجھ میں آ رہا تھا۔

کتنی ہی لڑکیوں اور لڑکوں نے علی سے سوال کیا۔ "تم نے وہ پوسٹر پڑھا؟ کیا تم اس تحریر کا مطلب سمجھ رہے ہو؟ یہ ہمارے کالج کے کسی لڑکے کی شرارت ہے۔ وہ ہمارے بوجھنے کے لئے کوئی پہیلی پیش کر رہا ہے۔"

علی نے انجان بنتے ہوئے کہا۔ "پتہ نہیں یہ کیسی پہیلی ہے۔ تین برس کی بڑھیا اور زیرو میٹر کا لڑکا۔ سب علامتی باتیں ہیں۔ یہ میری سمجھ سے باہر ہیں۔"

وہ ان سب سے پیچھا چھڑا کر اپنی کلاس میں چلا گیا۔ گھنٹی بج رہی تھی۔ سبیکا اپنی کلاس میں بیٹھی سوچ رہی تھی، ایسا کس نے لکھا ہے؟ صاف سمجھ میں آ رہا تھا کہ کسی نے جل بھن کر طنزیہ انداز میں اس طرح لکھا ہے کہ تین برس بڑی لڑکی اور ایک کم عمر لڑکے کی سمجھ میں آ جائے۔ باقی تمام طلبہ و طالبات کے دلوں میں تجسس پیدا ہو جائے۔

وہ یقین کے ساتھ سمجھ رہی تھی کہ یہ مرینہ کی حاسدانہ کارروائی ہے۔ وہ پورے کالج میں اسے بوڑھی لیلیٰ بنا کر اس کا مذاق بھی اڑانا چاہتی ہے اور اسے بدنام بھی کرنا چاہتی ہے۔ سبیکا نے سوچا تھا کہ پہلی کلاس ختم ہوتے ہی وہ مرینہ کو تلاش کرے گی پھر اس سے پوچھے گی کہ وہ ایسی حرکت کیوں کر رہی ہے؟

وہ تو کالج آتے ہی علی کو تلاش کر رہی تھی۔ اس سے کہنا چاہتی تھی کہ وہ عمر کے فرق کو بھول گئی ہے۔ اسے گھر آ کر ڈیڈی سے ملاقات کرنا چاہئے۔ اس کے ڈیڈی کو متاثر کر کے اپنی سبیکا کو جیت لینا چاہئے لیکن کالج میں قدم رکھتے ہی وہ علی کے ساتھ اپنا اسکینڈل دیکھ رہی تھی۔ اس پوسٹر کی مختصر سی تحریر یہ دھمکی دے رہی تھی کہ آئندہ اس سے بھی آگے بات بڑھے گی اور کھل کر اس کے اور علی کے اَن مل بے جوڑ رومانس کے چرچے کئے جائیں گے۔

کلاس ختم ہونے کے بعد مرینہ نے علی سے کہا۔ "آؤ کینٹین چلیں۔ مجھے چائے پلاؤ یا پھر میں تمہیں پلاؤں گی۔"

وہ سبیکا سے ملنا چاہتا تھا۔ اس نے کہا۔ "نہ پینے کا موڈ ہے نہ پلانے کا۔ تم خود جا کر پی لو۔"

وہ قریب ہو کر بولی۔ "دیکھ رہے ہو، کالج میں کیا ہو رہا ہے؟"

اس نے انجان بن کر پوچھا۔ "کیا ہو رہا ہے؟"

"تم نے دیواروں پر لگے ہوئے پوسٹرز نہیں پڑھے؟"

"پڑھ چکا ہوں۔ ایسی بے تکی بات لکھی ہوئی ہے جو کسی کی سمجھ میں نہیں آئے گی۔"

"تمہاری سمجھ میں تو آچکی ہوگی۔"

وہ چونک کر بولا۔ "کیا کہنا چاہتی ہو؟"

وہ مسکرا کر بولی۔ "انجان نہ بنو۔ کیا سبیکا تم سے تین برس بڑی نہیں ہے؟"

اس نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔ "یہ......... تم......... تم کیسے جانتی ہو؟"

"سبیکا نے مجھے بتایا ہے۔ وہ تم سے تین برس بڑی ہے۔ تم سے کتراتی ہے۔ تم سے پیچھا چھڑانا چاہتی ہے اور تم خواہ مخواہ اس کے پیچھے پڑے ہو۔"

وہ اس سے منہ پھیر کر جانے لگا۔ وہ اس کے پیچھے چلتے ہوئے بولی۔ "کیوں سچائی سے منہ پھیر رہے ہو۔ کیوں حماقت کر رہے ہو؟ جب یہ بات سب پر کھلے گی تو ایک بوڑھی سے عشق کرنے کے باعث تماشا نہیں بنو گے؟"

"بکواس مت کرو۔ تین برس کے فرق سے کوئی بوڑھی نہیں ہوتی۔ اب میں سمجھ رہا ہوں۔ یہ تمام پوسٹرز تم نے ہی لگوائے ہیں۔ بولو' اعتراف کرو۔ کیا یہ سچ ہے؟"

"سچ ہے۔ میں تمہاری بہتری کے لئے سبیکا کو بڑھاپے کا احساس دلا رہی ہوں۔"

وہ چلتے چلتے رک کر بولا۔ "اگر تم نے اسے بوڑھی کہا تو میں تمہارا منہ توڑ دوں گا۔ میں نے تمہاری عزت بچائی' جان بچائی تو تم نے مجھے اپنی زندگی کا ہیرو سمجھ لیا ہے۔ یہ خیال دل سے نکال دو۔ میں تمہاری عزت کرتا ہوں۔ کوشش کرو کہ آئندہ بھی عزت کرتا رہوں۔ میری نظروں سے گرنے والا کوئی کام نہ کرو اور یہیں رک جاؤ۔ میرے پیچھے نہ آؤ۔"

وہ آگے بڑھ کر جانے لگا۔ وہ جہاں تھی' وہیں کھڑی رہ گئی۔ اس کے دل کو ٹھیس پہنچ رہی تھی۔ وہ اندر سے ٹکڑے ٹکڑے ہو رہی تھی۔ اس نے اپنی دانست میں علی سے کوئی دشمنی نہیں کی تھی۔ وہ دنیاوی دستور کے مطابق درست سمجھ رہی تھی کہ کسی بڑی عمر والی سے نہ محبت کی جاتی ہے' نہ شادی کی جاتی ہے۔ وہ اس کی دیوانگی سے اسے باز رکھنا چاہتی تھی۔ اسے صرف سبیکا سے عداوت تھی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ رئیس زادی ایک کم

عمر لڑکے سے محبت کے نام پر محض دل بہلا رہی ہے۔

پچھلے روز سبیکا کو اس نے احساس دلایا تھا کہ وہ گھر جا کر آئینہ دیکھے اور اپنی عمر کا حساب کرے۔ سبیکا اس کی باتوں کو ہنسی میں اڑا کر چلی گئی تھی۔ اس نے انتقاماً پوسٹر والی کارروائی کی تھی۔ کالج کے ایک چپڑاسی کو پانچ ہزار روپے دے کر کہا تھا کہ وہ اس کے تیار کردہ پوسٹرز جگہ جگہ چسپاں کر دے۔ سبیکا اپنی بڑی عمر کا خیال کرتے ہوئے علی کے حصول سے باز نہ آتی تو وہ آگے بھی اس کے خلاف بہت کچھ کرنے والی تھی۔

علی لائبریری میں آیا۔ اس کا خیال تھا کہ سبیکا وہاں ہوگی۔ سبیکا بھی اس کی تلاش میں بھٹکتی ہوئی وہاں پہنچ گئی۔ دونوں کا سامنا ہوا تو ایک دوسرے کو دیکھتے ہی چپ سی لگ گئی۔ وہ اس سے مل کر کہنا چاہتا تھا۔ "دیکھو تم مجھ سے کترا رہی ہو۔ اس کے باوجود ہمارا پیار کالج میں گونجنے لگا۔"

وہ فوراً ہی کچھ نہ کہہ سکا۔ وہ کہنا چاہتی تھی۔ "علی! میں تم سے ہار گئی ہوں۔ تمہیں مستقبل کا ساتھی چن لیا ہے۔ آج میرے گھر آؤ اور وہاں پیار کے محل کا پہلا بنیادی پتھر رکھو۔"

وہ ایک دوسرے کے سامنے تھوڑی دیر تک چپ کھڑے رہے پھر علی نے کہا۔ "آؤ۔ وہاں چل کر بیٹھیں۔"

وہ سر جھکا کر اس کے ساتھ چلتی ہوئی ایک میز کے پاس آئی پھر ایک کرسی پر بیٹھ کر بولی۔ "میں......... میں ایک ضروری بات کرنا چاہتی ہوں۔"

"تم ایک بات نہ کرو ہزار باتیں کرو' تمہاری ہر بات میرے لئے ضروری ہے۔"

"یہ سن کر اچھا لگ رہا ہے کہ میری ہر بات تمہارے لئے ضروری ہے۔ میں ایک بات پوچھنا چاہتی ہوں۔"

"کوئی بات پوچھنے سے پہلے پوچھنا ضروری نہیں ہے۔ تم بولتی چلی جاؤ۔"

"تم میرے لئے جس دیوانگی کا مظاہرہ کر رہے ہو کیا پوری سنجیدگی اور سچائی سے کر رہے ہو؟ کیا میرے ساتھ تمام زندگی گزار سکو گے؟"

وہ خوش ہو کر بولا۔ "میں تمہیں کیسے یقین دلاؤں کہ تمہارے لئے جو دیوانگی ہے وہ مرتے دم تک نہیں جائے گی۔ تم ایک بار میری زندگی میں آ کر تو دیکھو۔ میں تمہیں بھی

واپس نہیں جانے دوں گا۔"

"میں کبھی محبت کرنے کی قائل نہیں تھی لیکن تمہارے پیار کا یہ انداز بہت اچھا لگ رہا ہے۔ میں کل تک تم سے فرار حاصل کر رہی تھی' اب نہیں کروں گی۔ کیا میری ایک بات مانو گے؟"

"تم میری زندگی میں آ رہی ہو۔ اب تمہاری ہر بات میرے لئے قابلِ قبول ہوگی۔ میں کوئی بات نہ مانوں تو تم زبردستی منوا سکتی ہو' یہ تمہارا حق ہے۔"

وہ میز پر ہاتھ ٹیک کر ذرا جھک کر بولی۔ "میں چاہتی ہوں' آج شام پانچ بجے میرے گھر آؤ۔ میرے ڈیڈی سے ملو اور ان سے باتیں کرو۔"

وہ پریشان ہو کر بولا۔ "میں.........؟ میں تمہارے ڈیڈی سے ملوں؟ ان سے کیا بات کروں گا؟"

"وہ تم سے بات کریں گے۔ تمہارے بارے میں بہت کچھ معلوم کرنا چاہیں گے۔ میں ڈیڈی سے بات کر چکی ہوں۔ میں نے انہیں دعوے سے کہا ہے کہ وہ تمہیں ضرور پسند کریں گے۔"

اس نے حیرانی سے پوچھا۔ "کیا تم اپنے ڈیڈی کو میرے بارے میں بتا چکی ہو! یعنی.........یعنی یہاں تک کہہ چکی ہو کہ وہ مجھے تمہارے لئے پسند کر سکتے ہیں؟"

"میں ڈیڈی سے اپنے معاملات نہیں چھپاتی پھر یہ تو زندگی کا سب سے اہم معاملہ ہے۔"

"کیا تم نے یہ بتایا ہے کہ میرا تعلق مڈل کلاس سے ہے؟"

"میں بتا چکی ہوں۔ تم فکر نہ کرو۔ وہ تمہیں اپنی کاروباری دنیا میں لانے کے لئے باقاعدہ ٹریننگ دیں گے۔ مجھ سے وعدہ کرو' وہ تم سے جو بھی باتیں منوائیں گے تم انہیں مان لو گے۔"

وہ ذرا ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "سبیکا! وہ کوئی ایسی بات تو نہیں منوائیں گے جو میرے مزاج اور میری خودداری کے خلاف ہو؟"

اس نے نظریں اٹھا کر علی کو دیکھا۔ اس کی خاموش نظریں کہہ رہی تھیں۔ "میری خاطر اپنے مزاج کے خلاف جھک جاؤ۔ محبت میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ پیار کرنے والے محض

خودی کو نہیں' خود کو بھی ہار جاتے ہیں۔"

علی نے اسے نظر بھر کر دیکھا تو وہ نظریں جھکا کر بولی۔ "آج وہ کچھ بھی بولیں' تم کوئی اعتراض نہیں کرو گے' مان لو گے۔ تمہارے لئے جو باتیں قابلِ اعتراض ہوں گی ہم ان کے متعلق بعد میں بات کریں گے۔"

"تم چاہتی ہو آج میں ان کی مرضی کے مطابق باتیں مان لوں' بعد میں ہم اپنی مرضی کے مطابق زندگی گزاریں گے؟ یہی چاہتی ہو نا؟"

"ہیئر یو آر! میں یہی چاہتی ہوں۔"

وہ اسے بڑے پیار سے دیکھتا ہوا بولا۔ "کل اس وقت تک تم مجھ سے بیزار تھیں۔ میرے سائے سے بھی دور بھاگ رہی تھیں اور آج یہاں ملتے ہی اپنے پیار کی دولت مجھے دے رہی ہو۔ میری زندگی کی سب سے پہلی' سب سے اہم آرزو پوری کر رہی ہو۔ مجھے بتاؤ' اچانک تمہارا دل میری طرف کیسے مائل ہو گیا؟"

وہ اس سے نظریں چراتے ہوئے بولی۔ "ایسا اچانک نہیں ہوا۔ تم پہلے ہی دن سے مجھے متاثر کرتے آ رہے ہو۔ میرے اندر ایک جنگ جاری تھی۔ بس ایک ہی بات مجھے ستاتی تھی کہ میں تم سے سینئر ہوں۔ کل میں نے سختی سے اس بات کو کچل دیا ہے۔ میں تم سے جونیئر ہوں' اتنی چھوٹی ہوں کہ تمہاری ایک چٹکی میں آ سکتی ہوں۔"

"تعجب ہے؟ کل تم نے یہاں سے جاتے ہی میرے حق میں فیصلہ کیا اور یہ فیصلہ اپنے ڈیڈی تک بھی پہنچا دیا۔ میں حیران ہوں کہ وہ مجھ سے ملنے کے لئے راضی ہو گئے اور وہ بھی آج ہی! یہ سب کچھ ایسے ڈرامائی انداز میں ہو رہا ہے کہ مجھے اپنی خوش قسمتی پر یقین نہیں آ رہا ہے۔"

وہ بولی۔ "اچانک تو بہت کچھ ہو رہا ہے۔ تم نے وہ پوسٹرز پڑھے ہوں گے جو یہاں کی دیواروں پر چپکے ہوئے ہیں؟"

"ہاں۔ میں پڑھ چکا ہوں۔ یہ مرینہ کی شرارت ہے۔"

"مجھ سے بہت بڑی بھول ہو گئی۔ میں نے اس سے کہہ دیا تھا کہ تم سے تین برس بڑی ہوں۔ بس وہ اس بات کو بارود کی طرح پھیلا رہی ہے اور دھماکے کر رہی ہے۔ میں اسے یہ بات نہ بتاتی تو اچھا ہوتا۔"

"یہ بات چھپانے کی نہیں ہے۔ ہم نے ایک دوسرے کو دل سے قبول کیا ہے تو اس سچائی کو بھی قبول کریں گے۔ عمر کے ذرا سے فرق سے کوئی قیامت نہیں آ جائے گی۔"

"وہ حسد اور جلن کے باعث میرا مذاق اڑا رہی ہے۔ تم محبت سے کہہ رہے ہو کہ عمر کا ذرا سا فرق ہے لیکن وہ مجھے تین برس کی بڑھیا کہہ رہی ہے۔ میں یہ انسلٹ برداشت نہیں کروں گی۔ کل ہی اسے منہ توڑ جواب دوں گی۔"

"تم آج بھی اسے منہ توڑ جواب دے سکتی ہو۔ میں تمہارا ساتھ دوں گا۔"

"ابھی نہیں۔ آج ہم ڈیڈی کو راضی کریں گے۔ وہ تمہیں پسند کرلیں گے اور مجھے تم سے منسوب کرنے کے لئے راضی ہو جائیں گے تو کل ہم یہاں تمام طلبہ اور طالبات کے سامنے کہیں گے کہ وہ تین برس کی بڑھیا میں ہوں اور وہ زیرو میٹر تم ہو۔ مرینہ ہمارا مذاق اڑانا چاہتی تھی لیکن یہ مذاق نہیں ہے۔ ہم ازدواجی رشتے میں منسلک ہونے والے ہیں۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو۔ اسے آج نہیں کل منہ توڑ جواب دیا جا سکے گا۔"

وہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولی۔ "آج میں جلدی گھر جاؤں گی۔ گھر پہنچتے پہنچتے دو بج جاتے ہیں پھر دیکھتے دیکھتے پانچ بجیں گے اور تم آ جاؤ گے۔ میں وہاں تمہارا انتظار کروں گی۔ یہ مجھے اچھا لگے گا۔"

وہ بھی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ دونوں لائبریری سے نکل کر کالج کے دوسرے حصوں سے گزرتے ہوئے باہر آئے۔ مرینہ لیبارٹری سے آ رہی تھی۔ ان دونوں کو ساتھ جاتے ہوئے دیکھ کر رک گئی۔ دل کو ٹھیس پہنچنے لگی۔ علی کے ساتھ اس کا نام لیا جا رہا تھا لیکن آج طلبہ اور طالبات اسے سبیکا کے ساتھ دیکھ رہے تھے۔ مرینہ اپنی توہین محسوس کر رہی تھی۔

چند طلبہ اور طالبات ان دونوں سے باتیں کر رہے تھے۔ سبیکا مسکراتے ہوئے علی کا بازو تھام کر ان اسٹوڈنٹس سے کچھ کہہ رہی تھی۔ اس کا یہ انداز بتا رہا تھا کہ مرینہ کے مقابلے میں اس نے علی کو مضبوط زنجیر پہنا دی ہے اور وہ یہ زنجیر توڑ نہیں سکے گی۔ وہ پریشان ہو کر سوچنے لگی۔ "اگر سبیکا اسی طرح علی کے ساتھ پھرتی رہے گی تو پورے کالج میں یہی تاثر پیدا ہو گا کہ علی میرا نہیں اس کا ہے۔ میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔ وہ میرا

ہے۔ اس کالج میں ہم دونوں ایک دوسرے کے نام سے پہچانے جائیں گے۔ صرف کالج ہی نہیں دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک میرا نام اس کے نام کے ساتھ لیا جائے گا۔"

سبیکا اپنی کار کے پاس پہنچ گئی تھی۔ یہ بات بھی مرینہ سے برداشت نہیں ہو رہی تھی کہ علی نے پچھلی سیٹ کا دروازہ اس کے لئے کھولا تھا اور وہ مسکرا کر بیٹھ رہی تھی پھر وہ کار وہاں سے چلی گئی۔ علی تنہا رہ گیا۔

وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اس کی طرف جانے لگی۔ وہ دو لڑکوں سے باتیں کرتا ہوا برآمدے کی سمت آ رہا تھا۔ وہ سامنے آئی تو ایک اسٹوڈنٹ نے کہا۔ "علی! تم بہت لکی ہو۔ ایک گئی تو دوسری آ گئی۔"

دوسرے اسٹوڈنٹ نے کہا۔ "سمجھ میں نہیں آتا' تمہارا افیئر کس کے ساتھ ہے۔"

وہ جانتی تھی' علی کیا جواب دینے والا ہے۔ اس سے پہلے ہی وہ بولی۔ "ایسی باتیں پوچھی نہیں جاتیں۔ دیکھی اور سمجھی جاتی ہیں۔ صبر و تحمل سے سمجھنے کی کوششیں کرتے رہو۔"

پھر وہ علی کا ہاتھ پکڑ کر چیخ کر بولی۔ "ادھر آؤ۔ میں ایک ایسی بات کہنے والی ہوں' جسے سن کر تم حیران رہ جاؤ گے۔ تمہیں یقین نہیں آئے گا۔"

وہ اسے کھینچتی ہوئی ان لڑکوں سے دور لے آئی۔ اس نے پوچھا۔ "تم ایسی کیا بات کہنے والی ہو؟"

"پہلے وعدہ کرو۔ تم میرے خلوص پر شبہ نہیں کرو گے۔ یہ نہیں سمجھو گے کہ میں سبیکا سے جلنے کڑھنے لگی ہوں۔ تم سنجیدگی سے جو باتیں سنو گے ان کی تصدیق کرو گے۔ پھر سچ اور جھوٹ کا فیصلہ کرو گے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں یہی کروں گا۔ بات کیا ہے' یہ بتاؤ؟"

"تم سبیکا کو مجھ پر ترجیح دے رہے ہو۔ میں تمہاری خوشی پر خوش رہ سکتی ہوں لیکن تمہیں فریب کھاتے نہیں دیکھ سکتی۔ ایک بار میری بات مان کر اس کی پچھلی ہسٹری معلوم کرو۔"

اس نے گھبرا کر پوچھا۔ "کیا ہے اس کی پچھلی ہسٹری؟"

"پہلے ایک بار اس کی شادی ہو چکی ہے۔ اس کا باپ کاروباری ذہنیت رکھتا ہے۔ اس نے ایک بہت دولت مند وڈیرے سے اس کی شادی کرائی تھی۔ وہ بہت ہی بوڑھا تھا۔ شادی کے چھ ماہ بعد ہی وہ کروڑوں روپے کی دولت اور جائیداد سبیکا کے لئے چھوڑ کر مرگیا۔ اس کا باپ عبدالقادر سومرو پہلے اتنا دولت مند نہیں تھا جتنا کہ بیٹی کے بیوہ ہونے کے بعد ہو گیا ہے۔"

"تم یہ سب کیسے جانتی ہو؟"

"میرے ڈیڈی بہت بڑے بزنس مین ہیں۔ وہ عبدالقادر سومرو جیسے کاروباریوں کی اصلیت کو خوب جانتے ہیں۔ وہ کاروباری انداز میں آئندہ بھی اپنی بیٹی کی شادی کرنا چاہتا ہے۔ تمہیں اس شاطر بزنس مین کے فریب میں آنے سے پہلے سبیکا کی پچھلی ہسٹری ضرور معلوم کرنی چاہئے۔"

وہ مرینہ کو سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا پھر اس نے کہا۔ "تم نہیں جانتیں، محبت کیا ہوتی ہے؟ محبوب کی خامیوں سے، اس کی کوتاہیوں سے اور اس کے عیبوں سے پیار کرنے کو محبت کہتے ہیں۔ اگر ایک بار اس کی شادی ہو چکی ہے اور وہ بیوہ ہے تو اس میں برائی کیا ہے؟"

اس نے پہلے حیرانی سے علی کو دیکھا پھر کہا۔ "محبت کرنے والے اپنی خامیوں اور برائیوں کو ایک دوسرے سے نہیں چھپاتے۔ پورے اعتماد اور صاف دلی سے محبت کرتے ہیں۔ وہ تم سے جھوٹ بولتی رہے گی، خود کو اَن چھوئی اور معصوم کہتی رہے گی تو کیا تم جان بوجھ کر دھوکا کھاتے رہو گے؟ محبت کرنے کے لئے بھی عقل کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر تم عقل سے خالی ہو کر اندھی محبت کرنا چاہو گے تو تمہیں ایسی حماقت کرنے سے نہ میں روک سکوں گی نہ تمہارے پیدا کرنے والے والدین روک سکیں گے۔"

"تم زیادہ نہ بولو۔ میں کسی نہ کسی طریقے سے سچائی معلوم کروں گا۔"

وہ فوراً ہی پلٹ کر اس کا جواب سنے بغیر چلا گیا۔ وہ یک گونہ مطمئن ہو کر مسکرانے لگی۔ اس نے سبیکا پر شادی شدہ ہونے اور بیوہ ہونے کا ایسا الزام لگایا تھا جس سے سبیکا انکار کر دیتی، کبھی تسلیم نہ کرتی کہ اس کی زندگی میں کوئی مرد آیا تھا خواہ وہ بوڑھا ہی کیوں نہ ہو اور علی جیسے مرد اپنی محبوبہ کے خواہ کتنے ہی دیوانے ہوں، شکی مزاج ضرور ہوتے ہیں

اور مرینہ نے اس کے اندر شک کا بیج بو دیا تھا۔

علی اگر ایسی بات سبیکا سے پوچھتا تو ان کے درمیان بے اعتمادی پیدا ہوتی۔ شک و شبہات جنم لیتے رہتے۔ محبت چٹان کی طرح مضبوط ہوتی ہے لیکن ایک ذرا سی بے اعتمادی اس چٹان کو شیشے کی طرح چکنا چُور کر دیتی ہے۔

وہ شام کو ٹھیک پانچ بجے سبیکا کی کوٹھی میں آیا۔ وہ تیزی سے چلتی ہوئی کوٹھی کے باہر آئی۔ مسکرا کر اسے دیکھا پھر اسے اندر ڈرائنگ روم میں لے آئی۔ وہاں اس کا باپ عبدالقادر سومرو ایک صوفے پر سینہ تانے اکڑا بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے سامنے سنٹر ٹیبل پر ایک بریف کیس رکھا ہوا تھا۔

علی اس کوٹھی کے قیمتی ساز و سامان اور وہاں کی شان و شوکت دیکھ رہا تھا۔ اس کے اندر کہیں یہ احساسِ کمتری تھا کہ وہ اپنی اوقات سے زیادہ مانگنے کے لئے آیا ہے۔

عبدالقادر سومرو شانِ بے نیازی سے بیٹھا فون پر باتیں کر رہا تھا۔ سبیکا نے کہا۔

"ڈیڈی! یہ علی رمزی ہیں۔"

علی نے سلام کیا۔ اس نے جواب میں صرف سر کو ہلایا پھر ایک ہاتھ سے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔ کوئی خوش آمدید کہنے والی پذیرائی نہیں تھی۔ وہ خاموشی سے ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس کی باتیں سننے لگا۔

وہ فون پر کہہ رہا تھا۔ "سائیں! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ہم زبان کے دھنی ہیں۔ جب وعدہ کیا ہے کہ دو لاکھ روپے سے تمہاری مدد کریں گے تو پھر ضرور کریں گے۔ ابھی یہ رقم میرے سامنے بریف کیس میں رکھی ہوئی ہے۔ میرا کوئی بھروسے والا آدمی تمہیں یہ بریف کیس دے جائے گا۔"

وہ دوسری طرف کی بات سننے کے بعد بولا۔ "ارے نہیں۔ یہ دو لاکھ روپے ہمارے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ ہمارے دروازے پر کتنے ہی مانگنے والے آتے رہتے ہیں۔ ان کی صورت سے ہی پتہ چلتا ہے کہ وہ پیدائشی مانگنے والے ہیں۔"

ایسا کہتے وقت وہ علی کی صورت دیکھ رہا تھا۔ اس کی گفتگو سے پتہ چل رہا تھا کہ وہ اپنی امارت، سخاوت اور شان و شوکت کے سلسلے میں ڈینگیں مار رہا ہے۔

سبیکا نے علی کی طرف جھک کر کہا۔ "تم یہاں بیٹھو۔ میں اپنے ہاتھوں سے تمہارے

لئے چائے بنا کر لاؤں گی۔"

وہ وہاں سے چلی گئی۔ اس کے جاتے ہی عبدالقادر سومرو نے ریسیور کو کریڈل پر رکھتے ہوئے پوچھا۔ "ہاں تو تم وہی ہو؟ کیا نام ہے تمہارا؟"

جس نوجوان سے اس کی سیاسی پارٹی کو نقصان پہنچا تھا اور جو اپنی اوقات سے باہر آ کر اس کی بیٹی کو اس سے چھین لینا چاہتا تھا' اس کا نام وہ کبھی بھول نہیں سکتا تھا۔ اس وقت وہ انجان بن کر یوں پوچھ رہا تھا جیسے وہ چھوٹے لوگوں کا نام بھول جایا کرتا ہو۔

اس نے کہا۔ "جی۔ میرا نام علی رمزی ہے۔ میں فرسٹ ایئر میں ہوں۔"

"گزارا کیسے ہوتا ہے؟"

"ہمارے چند مکانات اور دکانیں ہیں۔ ان کا کرایہ آتا ہے۔ اسی سے گزر ہو جاتی ہے۔"

"تمہارا باپ کوئی کاروبار نہیں کرتا؟"

"ان کا سایہ ہمارے سر سے اٹھ گیا ہے۔ صرف میری والدہ ہیں اور میں ہوں۔"

"سبیکا ایک دن میں ہزاروں لاکھوں روپے کی شاپنگ کرتی ہے۔ تمہاری ایک دن کی آمدنی کتنی ہے؟"

"ہم ایک دن کا نہیں' مہینے کا حساب رکھتے ہیں۔ میری ماہانہ آمدنی تیس ہزار روپے ہے۔"

"پھر تو تمہیں آمدنی بڑھانے کی فکر کرنی چاہئے تاکہ سبیکا تمہارے ساتھ شاپنگ کے لئے جائے تو تمہیں شرمندگی نہ ہو۔ وہ کسی تقریب میں جائے تو تمہارے پاس کم از کم تیس لاکھ کی کار ہونی چاہئے اور ایسی شاندار کوٹھی تو ضرور ہونی چاہئے جہاں تم بیٹھے ہوئے ہو۔"

"میں نہیں جانتا کہ کبھی یہ سب کچھ حاصل کر سکوں گا یا نہیں' لیکن کوشش ضرور کروں گا۔"

"دولت مند بننے کے کچھ آسان راستے بھی ہیں۔ ان میں سب سے آسان راستہ یہ ہے کہ تم گھر داماد بن سکتے ہو' یا پھر ایک سیاسی پارٹی کی اسٹوڈنٹس یونین کے لیڈر بن جاؤ۔ میں بتا دوں گا' ہزاروں لاکھوں کمایا کرو گے۔"

دونوں ہی راستے اس کے لئے ناقابلِ قبول تھے۔ وہ انکار میں کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن سبیکا نے کہا تھا کہ ڈیڈی کی ہر بات مان لینا۔ وہ بات تمہارے مزاج کے خلاف بھی ہو تب بھی مان لینا۔ بعد میں اس کا کوئی حل نکالا جائے گا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا' سر جھکائے خاموش بیٹھا رہا۔

ہونے والے سسر نے پوچھا۔ "بائی دا وے' تمہاری وہ چند دکانیں اور مکانات کس علاقے میں ہیں؟"

"صدر پریڈی اسٹریٹ میں اور اس کے آس پاس جو خالی پلاٹ ہیں وہ بھی ہمارے ہیں۔"

وہ فوراً ہی چونک کر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا پھر بولا۔ "مائی گاڈ! وہاں تو شاپنگ پلازا تعمیر کرایا جا سکتا ہے۔ تم تو کروڑوں میں کھیل سکتے ہو۔"

"جی ہاں.......... لیکن وہ.......... وہ امی راضی نہیں ہوتیں۔ وہاں کوئی فلاحی ادارہ قائم کرنا چاہتی ہیں۔"

وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اسے سمجھانے کے انداز میں بولا۔ "یہ سراسر حماقت ہو گی۔ وہ سونا اگلنے والے پلاٹس ہیں۔ فلاحی کام اور طریقوں سے بھی کئے جا سکتے ہیں۔ تم اپنی امی کو سمجھاؤ۔"

پھر وہ اس کے قریب ایک صوفے پر بیٹھ کر بولا۔ "اگر تم واقعی سبیکا کو چاہتے ہو تو ابھی مجھ سے معاملات طے کرو۔ سیدھی سی بات ہے۔ اِس ہاتھ سے دو گے تو اُس ہاتھ سے پاؤ گے۔ تم آج وہ پلاٹس سبیکا کے نام لکھ دو۔ کل میں تمہارا نکاح اس سے پڑھوا دوں گا۔ ابھی میرے وکیل کے ذریعے لین دین کے کاغذات تیار ہو جائیں گے۔"

علی کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ اسے مرینہ کی باتیں یاد آئیں۔ اس نے کہا۔ "اس کا باپ کاروباری ذہنیت رکھتا ہے۔ اس نے ایک بہت دولت مند بوڑھے وڈیرے سے سبیکا کی شادی کرائی تھی۔ وہ بوڑھا کروڑوں کی دولت اور جائیداد سبیکا کے لئے چھوڑ کر مر گیا۔ اس کا باپ آئندہ بھی کاروباری انداز میں بیٹی کی شادی کرنا چاہتا ہے۔"

وہ پلکیں جھپکائے بغیر عبدالقادر سومرو کو دیکھ رہا تھا۔ وہ بولا۔ "اس طرح کیا دیکھ رہے ہو؟ اس میں تمہارا فائدہ ہی فائدہ ہے۔ تم صرف وہ پلاٹس سبیکا کے نام کرو گے۔

اس کے عوض تمہیں میری بیٹی بھی ملے گی اور میری تمام دولت اور جائیداد بھی۔ اور جب سبیکا تمہاری ہو جائے گی تو اس کے نام لکھے ہوئے پلاٹس بھی تمہارے ہی ہوں گے۔ ایسے بھی تمہارے ہیں۔ ویسے بھی تمہارے ہوں گے۔"

وہ کوئی جواب نہ دے سکا۔ ایک ملازم بڑی سی ٹرالی میں چائے اور اسنیکس وغیرہ لے کر آ رہا تھا۔ اس کے ساتھ سبیکا بھی تھی۔ ملازم وہاں ٹرالی چھوڑ کر چلا گیا۔ باپ نے بیٹی سے کہا۔ "بیٹی! تمہارے لئے خوش خبری ہے۔ علی ہمارے معیار اور سٹیٹس کے مطابق ہے۔ میں اسے کاروباری لین دین سمجھا رہا ہوں۔ اگر یہ راضی ہو جائے گا تو میں بھی رشتے کے لئے راضی ہوں۔ میں چاہتا ہوں' تم بھی اسے سمجھاؤ۔"

وہ ایک صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ "ڈیڈی! میں آپ کی باتیں سن رہی تھی۔ آپ نے علی کو اچھی آفر دی ہے۔ اس دنیا میں بھائی بھائی ہوں یا باپ بیٹے ہوں ہر کسی سے کسی نہ کسی طرح کا لین دین ہوتا رہتا ہے۔ جب تک ہم کسی کو کچھ نہیں دیں گے تو پھر کسی سے کچھ پانے کی توقع بھی نہیں رہے گی۔"

پھر اس نے علی سے کہا۔ "اگر ڈیڈی ہماری شادی کے لئے راضی نہ ہوتے تو میں تم سے یہ کبھی نہ کہتی کہ اپنے وہ پلاٹس میرے نام لکھ دو لیکن اب ضرور کہوں گی۔ شادی کے بعد تو میں تمہاری ہو جاؤں گی میری ہر چیز تمہاری ہوگی۔ حتیٰ کہ تمہارے پلاٹس بھی تمہارے ہی رہیں گے۔"

اس نے اسنیکس کی ایک پلیٹ علی کی طرف بڑھائی۔ وہ بولا۔ "میں صرف چائے پیوں گا۔"

وہ بولی۔ "کچھ تو کھانا چاہئے۔ چلو۔ ایک پیس لے لو۔"

وہ ایک پیس لے کر کھانے لگا۔ سبیکا نے پیالیوں میں چائے ڈالتے ہوئے کہا۔ "کھاتے بھی رہو اور بولتے بھی رہو۔ ہم تمہارے جواب کے منتظر ہیں۔"

اس کے باپ نے کہا۔ "اور یہ اتنا صاف ستھرا لین دین ہے کہ تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہئے۔"

وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "وہ.......... وہ دراصل بات یہ ہے کہ تمام پلاٹس امی کے نام پر ہیں۔"

"تو کیا ہوا؟ تم اپنی امی کو راضی کرو۔ وہ انکار کریں تو ضد کرو۔ مائیں اپنی اولاد کی ہر ضد پوری کرتی ہیں پھر جو بات مان لینے سے بیٹے کا مستقبل شاندار ہو سکتا ہے' وہ اونچا اسٹیٹس حاصل کر سکتا ہے تو پھر ماں کو کسی بحث کے بغیر مان لینا چاہئے۔"

وہ بولا۔ "میں برسوں سے دیکھ رہا ہوں' امی شدت سے فلاحی ادارہ قائم کرنے کے سلسلے میں گفتگو کرتی رہتی ہیں۔ ہر ماہ کچھ نہ کچھ رقم جمع کرتی رہتی ہیں۔ اچھی خاصی رقم جمع کر کے وہ ادارہ قائم کرنا چاہتی ہیں۔ یہ ان کا برسوں کا خواب ہے۔ میں جوان بیٹا ہوں' ابھی کہیں سے کما کر نہیں لا سکتا۔ ان کے خواب پورے نہیں کر سکتا پھر مجھے یہ حق حاصل نہیں ہے کہ میں ان کے یہ خواب ان سے چھین لوں۔"

سبیکا نے بڑی میٹھی ناراضگی سے پوچھا۔ "کیا میرے خواب مجھ سے چھین لو گے؟ اگر ایسا ہے تو مجھے خواب کیوں دکھا رہے تھے؟"

وہ عاجزی سے بولا۔ "پلیز۔ میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں نے ایک بیٹے کی حیثیت سے آج تک اپنی امی کی کوئی خواہش پوری نہیں کی پھر ان پلاٹس پر میرا نہیں' امی کا حق ہے۔ کیا یہ اچھا لگے گا کہ اپنی ماں سے پلاٹس بھی چھین لوں اور ان کی خواہشات کو بھی کچل دوں؟"

عبدالقادر سومرو اسے تیز اور ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اپنی بیٹی سے بولا۔ "تم اپنے کمرے میں جاؤ۔ میں وہاں آ کر تم سے کچھ باتیں کروں گا۔ ابھی علی سے دو باتیں کر کے آ رہا ہوں۔"

سبیکا وہاں سے اٹھ کر چلی گئی۔ وہ بیٹی کے جانے کے بعد بولا۔ "میرا مشورہ ہے' گھر جا کر اپنی ماں سے بات کرو۔ انہیں بتاؤ کہ تم میری بیٹی کو ان کی بہو بنانا چاہتے ہو۔ وہ یہاں آئیں گی۔ بہو کو دیکھیں گی۔ اپنے بیٹے کے شاندار مستقبل کو سمجھیں گی تو ضرور تمہارے اور سبیکا کے حق میں فیصلہ کریں گی۔"

وہ کوئی جواب نہ دے سکا۔ خاموشی سے سر جھکائے بیٹھا رہا۔ عبدالقادر سومرو سمجھ رہا تھا کہ وہ ماں کی نیک خواہشات اور جذبات کو اہمیت دے رہا ہے۔ اسے جب تک مسائل میں نہیں الجھایا جائے گا تب تک یہ ان پلاٹس کو سبیکا کے نام نہیں کرے گا۔ اس نے کہا۔ "ٹھیک ہے' ابھی جواب نہ دو۔ اچھی طرح سوچو۔ فی الحال میرا ایک کام کرد

گے؟"

"آپ حکم دیں، ضرور کروں گا۔"

اس نے ایک پرچی پر کچھ لکھا پھر اسے وہ پرچی دیتے ہوئے بولا۔ "اس میں نام اور پتہ لکھا ہوا ہے۔ تم یہ بریف کیس اس ضرورت مند کے پاس پہنچا دو۔"

"جی بہت اچھا۔ میں ابھی پہنچا دوں گا۔"

عبدالقادر نے اپنی جگہ سے اٹھ کر وہ بریف کیس اسے دیتے ہوئے کہا۔ "تم جاؤ۔ کل ملاقات ہوگی۔ میں سبیکا سے ضروری باتیں کرنے جا رہا ہوں۔"

علی نے وہ بریف کیس لے کر اس سے مصافحہ کیا پھر وہاں سے چلتا ہوا کوٹھی کے باہر آ گیا۔ اس کوٹھی کے احاطے سے باہر آ کر تھوڑی دور چلنے کے بعد ایک ٹیکسی کو روک کر اس میں بیٹھ گیا۔ وہ ٹیکسی آگے چل پڑی لیکن زیادہ دور تک نہ جا سکی۔ ایک پولیس وین نے اس کا راستہ روک لیا۔ سپاہی ٹیکسی کو چیک کرنے لگے۔ انسپکٹر نے پوچھا۔ "اس بریف کیس میں کیا ہے؟"

علی نے کہا۔ "کچھ رقم ہے۔ کسی کی امانت ہے، میں اسے پہنچانے جا رہا ہوں۔"

"میں کیسے یقین کروں کہ یہ کسی کی امانت ہے اور یہ چرائی ہوئی رقم نہیں ہے؟"

وہ پرچی دکھاتے ہوئے بولا۔ "آپ یقین کریں۔ میں یہ رقم اس پتے پر پہنچانے جا رہا ہوں۔"

انسپکٹر نے پرچی پڑھتے ہی چونک کر کہا۔ "خالد شیخ؟ یہ تو ایک مفرور مجرم ہے اور پتہ بھی اسی کا ہے۔ تو تم اس مفرور کی مدد کرنے کے لئے یہ رقم لے جا رہے ہو؟"

وہ بری طرح پریشان ہو گیا۔ "جناب! آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔ میں تو اس شخص کو جانتا بھی نہیں ہوں۔ مجھے عبدالقادر سومرو نے کہا ہے کہ یہ دو لاکھ روپے اس کے پاس پہنچا دو۔"

"کون عبدالقادر سومرو؟ کیا وہی جو سبیکا ملز کے مالک ہیں اور سیاسی لیڈر بھی ہیں؟"

"جی ہاں۔ سبیکا ان کی بیٹی کا نام ہے۔ ہم ایک ہی کالج میں پڑھتے ہیں۔"

"کالج میں پڑھتے ہو اور روپوش مجرموں تک ان کی ضرورت کی چیزیں پہنچاتے ہو؟ اور سیٹھ عبدالقادر سومرو جیسے معزز شخص کو بدنام کر رہے ہو؟"

"میں سچ کہہ رہا ہوں۔ آپ سومرو صاحب سے فون پر تصدیق کر سکتے ہیں۔"

"تھانے چلو۔ وہاں سے فون پر تصدیق کروں گا۔"

وہ اسے ایک پولیس وین میں بٹھا کر وہاں سے لے گئے۔ سبیکا اپنے کمرے میں تھی۔ باپ اسے سمجھا رہا تھا۔ "بیٹی! تم نے بہت ہی غلط لڑکے کا انتخاب کیا ہے۔ میں نے پہلی ہی ملاقات میں اسے اچھی طرح سمجھ لیا ہے۔ وہ بہت لالچی اور خودغرض ہے۔ خودغرضی یہ ہے کہ وہ اپنے پلاٹس تمہارے نام نہیں کرنا چاہتا لیکن تم سے شادی کے بہانے تمہاری دولت اور جائیداد حاصل کرنے کے خواب دیکھ رہا ہے۔"

وہ اس کی حمایت میں بولی۔ "ڈیڈی! وہ ایسا نہیں ہے۔ بہت اچھا، سچا اور خوددار لڑکا ہے۔"

"وہ فرسٹ ایئر کا سٹوڈنٹ ہے۔ ابھی نیا نیا کالج میں آیا ہے۔ تم نے چند دنوں میں کیسے سمجھ لیا کہ وہ اندر سے بھی اچھا اور سچا ہے؟ تم نے اس میں کیسی خودداری دیکھی اور کب دیکھی ہے؟ کیا کوئی مثال پیش کر سکتی ہو؟"

وہ قریب آ کر بولا۔ "تمہیں اس کا محاسبہ کرنا چاہئے۔ اس سے وضاحت طلب کرنی چاہئے کہ وہ اپنے پلاٹس تمہارے نام کیوں نہیں کرنا چاہتا؟ شادی سے پہلے یہ فیصلہ ہونا چاہئے کہ اس کی نظروں میں ماں کی اہمیت زیادہ ہے یا تمہاری؟ میں اسے ڈرائنگ روم میں چھوڑ کر آیا ہوں۔ چلو اس سے دو ٹوک فیصلہ کرو۔"

وہ کمرے سے نکل کر باپ کے ساتھ چلتی ہوئی ڈرائنگ روم میں آئی۔ علی کو وہاں نہ پا کر بولی۔ "یہ کہاں چلا گیا؟"

"میں تو اسے یہیں چھوڑ کر تمہارے پاس آیا تھا۔ کیا وہ تم سے ملے بغیر یہاں سے چلا گیا ہے؟"

پھر اس نے سنٹر ٹیبل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "میرا بریف کیس کہاں ہے؟"

وہ سنٹر ٹیبل کے نیچے اور صوفوں کے آس پاس جا کر دیکھنے لگا۔ سبیکا نے کہا۔ "ابھی تو یہیں رکھا ہوا تھا۔"

ملازم کو بلا کر پوچھا گیا۔ اس نے کہا۔ "میں تو باہر گاڑی صاف کر رہا تھا۔ میں نے کوئی بریف کیس نہیں دیکھا۔ آپ چوکیدار اور سکیورٹی گارڈ کو بلا کر پوچھیں۔"

ان دونوں کو بلا کر پوچھا گیا۔ انہوں نے کہا۔ "یہاں جو مہمان آئے تھے ان کے ہاتھ میں ہم نے بریف کیس دیکھا تھا۔ ہم سمجھ رہے تھے کہ آپ نے وہ بریف کیس انہیں دیا ہے۔"

باپ بیٹی نے چونک کر ایک دوسرے کو دیکھا پھر وہ بولی۔ "وہ.......... بریف کیس کیوں لے گیا ہے؟"

باپ نے کہا۔ "کیا تم نادان بچی ہو؟ کیا تم نہیں جانتیں کہ اس میں دو لاکھ روپے رکھے ہوئے تھے؟ کبھی اس کے باپ نے بھی دو لاکھ روپے ایک ساتھ نہیں دیکھے ہوں گے۔ آج اس نے دیکھتے ہی ہاتھ کی صفائی دکھا دی۔ مجھے فوراً تھانے اطلاع دینی ہوگی۔"

اس نے چوکیدار اور سکیورٹی گارڈ کو باہر جانے کے لئے کہا پھر ٹیلی فون کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ وہ ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کرنا چاہتا تھا۔ سبیکا نے کہا۔ "جسٹ اے منٹ ڈیڈ! میرا دل نہیں مان رہا ہے۔ پلیز' مجھے سوچنے دیں' اس نے ایسا کیوں کیا ہے؟ وہ بریف کیس کیوں لے گیا ہے؟ میرا دل کہتا ہے کہ وہ لالچی نہیں ہے۔"

"تم آنکھوں دیکھی سچائی سے انکار کر رہی ہو۔ دربان اور سکیورٹی گارڈ' دونوں نے اپنی آنکھوں سے اسے بریف کیس لے جاتے دیکھا ہے اور تم ہو کہ اسے لالچی نہیں کہہ رہی ہو۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے ریسیور اٹھا کر ہیلو کہا۔ دوسری طرف کی باتیں سنیں پھر کہا۔ "ہاں میں عبدالقادر سومرو ہوں۔ آپ فرمائیں؟"

وہ پھر دوسری طرف کی باتیں سننے کے بعد بولا۔ "کیا؟ بریف کیس ہے؟ اس میں دو لاکھ روپے ہیں؟ پھر تو میرا ہی ہے۔ اس نوجوان کا نام کیا ہے؟ علی رمزی.......... او گاڈ! وہ ابھی مجھ سے ملنے آیا تھا۔ ابھی مجھے پتہ چلا کہ میرا بریف کیس غائب ہے۔ ہوں۔ ہوں۔ ٹھیک ہے۔ آپ اسے حراست میں رکھیں۔ میں آ رہا ہوں۔"

وہ ریسیور رکھ کر سبیکا سے بولا۔ "دیکھا' وہ ہماری آنکھوں میں دھول جھونک کر گیا لیکن پولیس والوں نے اسے پکڑ لیا۔ وہ چور بدمعاش ان سے کہہ رہا تھا کہ میں نے اسے وہ دو لاکھ روپے دیئے ہیں۔ اب تو اسے ایسے ڈنڈے پڑیں گے کہ ہیرو اور باڈی بلڈر بننا بھول جائے گا۔"

وہ جانے لگا۔ سبیکا نے کہا۔ "ڈیڈی! میں بھی ساتھ چلوں گی۔"

"کیا مجھے تماشا بناؤ گی۔ وہ تمہیں دیکھ کر عشق و محبت کا واسطہ دے گا۔ میری کیا عزت رہ جائے گی۔ میرا حکم ہے۔ میری واپسی تک گھر سے باہر نہیں جاؤ گی۔"

وہ تیزی سے قدم بڑھاتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ وہ اس دروازے کو دیکھتی رہی' جہاں سے باپ گزر کر گیا تھا۔ اس کے اندر ہلچل پیدا ہو گئی تھی۔ دل نہیں مان رہا تھا کہ علی چوری بھی کر سکتا ہے لیکن چشم دید گواہ موجود تھے اور وہ بریف کیس کے ساتھ پکڑا گیا تھا۔ دل مانے نہ مانے ذہن تسلیم کر رہا تھا کہ اس نے پچھلے چند دنوں میں علی کو صحیح طرح نہیں پہچانا ہے۔ اس نے دیوانہ وار محبت کا مظاہرہ کیا اور یہ پگھل گئی۔

اس کے ڈیڈی کہا کرتے تھے' چھوٹے لوگوں کو کبھی منہ نہیں لگانا چاہئے۔ ان کی سوچ چھوٹی ہوتی ہے' ان کی نیت بھی کھوٹی اور چھوٹی ہوتی ہے' کیا علی بھی ایسے ہی چھوٹے لوگوں میں سے ہے؟ اگر نہیں ہے تو اس نے ایسی حرکت کیوں کی ہے؟ کیا وہ دو لاکھ روپے مجھ سے زیادہ اہم تھے؟ وہ مجھے حاصل کرنے آیا تھا' لیکن دو لاکھ روپے دیکھ کر نیت بدل گئی' وہ اپنی اوقات دکھا کر چلا گیا۔

اور وہ اپنی اوقات میں رہنے والا اس وقت آہنی سلاخوں کے پیچھے تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ اور پاؤں رسیوں سے باندھے گئے تھے۔ تین ہٹے کٹے سپاہی اس کی پٹائی کر رہے تھے۔ کبھی جوتوں سے ٹھوکریں مار رہے تھے' کبھی اس پر ڈنڈے برسا رہے تھے۔ چہرے پر گھونسے بھی جماتے جا رہے تھے۔ سلاخوں کے باہر انسپکٹر کرسی پر بیٹھا کہہ رہا تھا۔ "کتے کا بچہ! ہیرو بنتا ہے۔ یہاں بن کر دکھا' یہ کالج نہیں ہے۔"

وہ گڑگڑاتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔ "کیوں مجھ پر ظلم کر رہے ہو؟ خدا گواہ ہے' میں نے کبھی چوری نہیں کی۔ آپ سومرو صاحب کو بلا کر پوچھ لیں۔ آپ انہیں کیوں نہیں بلاتے؟ سچ اور جھوٹ کو سمجھے بغیر کیوں مجھ پر ظلم کر رہے ہیں؟ خدا کے لئے مجھ پر رحم کریں۔"

وہ مار کھاتا رہا اور رحم کی بھیک مانگتا رہا پھر آہستہ آہستہ اس کی آواز ڈوبنے لگی۔ اس قدر تشدد کیا جا رہا تھا کہ وہ لہولہان ہو گیا تھا۔ چہرہ سوج گیا تھا۔ اس کا بدن ہولے ہولے لرز رہا تھا۔ انسپکٹر نے کہا۔ "بس کرو۔ نہیں تو یہ کتا مر جائے گا۔"

عبدالقادر سومرو' ان کی سیاسی پارٹی کے لیڈر اور اس پارٹی کے کچھ اہم افراد نے وہاں آکر علی کو آدھی موت مرتے دیکھا۔ پارٹی لیڈر نے انسپکٹر سے پوچھا۔ "یہ مر تو نہیں جائے گا؟"

"ہم اسے زندہ رکھیں گے۔ ہمیں اوپر والوں کو بھی جواب دینا پڑتا ہے۔"

سومرو نے کہا۔ "کیس اتنا مضبوط بناؤ کہ یہ چور کہلائے۔ کالج یونین کے حوالے سے اسے سیاسی مسئلہ نہیں بننا چاہئے۔ یہ کم بخت کالج میں ہیرو بنا ہوا ہے۔ وہاں سے اس کی حمایت میں آوازیں اٹھائی جائیں گی۔"

"آپ فکر نہ کریں۔ یہ چور ہے' چور ہی کہلاتا رہے گا۔ ہم پولیس والے جس پر چور کی مہر لگا دیں' وہ پھر ساری زندگی شریف آدمی نہیں کہلاتا۔"

وہ فرش پر نیم بے ہوشی کی حالت میں چاروں شانے چت پڑا ہوا تھا۔ انسپکٹر نے سپاہیوں سے کہا۔ "اس کے زخموں کی مرہم پٹی کرو۔ کچھ کھانے پینے کے لئے بھی دو۔ نہیں تو یہ مرجائے گا۔"

عبدالقادر سومرو نے قریب آکر اسے ایک ٹھوکر مار کر کہا۔ "کتے حویلی کی طرف منہ کرکے بھونکتے ہیں پھر تھک ہار کر چلے جاتے ہیں لیکن یہ کتا تو میری حویلی کے اندر گھس آیا تھا۔"

علی نے کراہتے ہوئے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔ وہ ہنستے ہوئے طنزیہ انداز میں بولا۔ "میری بیٹی سے شادی کرے گا؟ بول.......... کرے گا؟"

اس نے پھر ایک ٹھوکر ماری۔ "وہ میری بیٹی ہے۔ عبدالقادر سومرو کی بیٹی ہے۔ دیکھا تو نے۔ کیسے چارہ ڈال کر وہاں بلایا' اور یہاں پہنچا دیا؟"

اچھا تو یہ باپ بیٹی کی مشترکہ سازش تھی۔ علی باہر سے بھی ٹوٹ پھوٹ رہا تھا۔ اندر سے بھی ریزہ ریزہ ہو رہا تھا۔ مرینہ کی ایک ایک بات درست ہو رہی تھی۔ سبیکا کا جھوٹ اور فریب کھل کر سامنے آگیا تھا۔ اس نے یہ نہیں بتایا تھا کہ اس کے باپ کا تعلق اس سیاسی پارٹی سے ہے' جس کی اسٹوڈنٹس یونین کے لیڈر اور کارکنوں کو اس نے گرفتار کرایا تھا۔ اب اسے حوالات میں پہنچا کر اس سے سیاسی انتقام بھی لیا جا رہا تھا اور سبیکا سے عشق کرنے کی سزا بھی دی جا رہی تھی۔

اس کی آنکھیں آہستہ آہستہ بند ہو گئیں۔ وہ اپنے آپ سے غافل ہوتا چلا گیا۔ بے ہوشی غالب آگئی۔

☆------☆------☆

آدھی رات گزر گئی تو ہاجرہ بی کا دل بری طرح گھبرانے لگا۔ بیٹا دوپہر کو آیا تھا پھر غسل کرکے لباس وغیرہ تبدیل کرنے کے بعد کہیں چلا گیا تھا۔ جاتے وقت کہہ گیا تھا کہ واپس آکر ایک خوش خبری سنائے گا۔ وہ رات کے کھانے پر اس کا انتظار کرتی رہیں۔ وہ نہ آیا' تو انہوں نے رات کا کھانا کھایا۔ وہ کبھی راتوں کو گھر سے باہر نہیں رہتا تھا۔ پہلی بار اتنی رات گزر گئی تو دل بری طرح گھبرانے لگا۔

وہ گھر کا دروازہ بند کرکے محلے کے ایک پی سی او میں آئیں۔ اس پی سی او والے سے علی کی دوستی تھی۔ انہوں نے کہا۔ "بیٹے! رات کا ایک بجنے والا ہے اور علی اب تک واپس نہیں آیا ہے۔ وہ یہاں سے اپنے دوستوں کو فون کیا کرتا ہے۔ تمہارے پاس تو وہ نمبر لکھے ہوئے ہوں گے۔ ذرا معلوم کرو' وہ کس دوست کے گھر میں بیٹھا ہوا ہے؟"

وہ اپنا رجسٹر کھول کر علی کے دو چار دوستوں کے نمبر دیکھ کر ان سے رابطہ کرنے لگا۔ ان سب سے جواب ملتا رہا کہ علی ان کے پاس نہیں ہے۔ اس نے ہاجرہ بی سے کہا۔ "آنٹی! علی اپنے ان دوستوں میں سے کسی کے پاس نہیں ہے۔ آپ نے اور علی نے کبھی کسی رشتے دار کو یہاں سے فون نہیں کیا۔ ہو سکتا ہے' وہ کسی رشتے دار کے گھر میں ہو؟ آپ نمبر بتائیں۔"

"ہمارا یہاں کوئی قریبی رشتہ دار نہیں ہے۔ لاہور میں میرے ایک بھائی رہتے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا' وہ کہاں گیا ہے؟ اب تک واپس کیوں نہیں آیا ہے؟"

وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ "اس کے کالج کے ساتھیوں سے کچھ معلوم ہو سکتا ہے لیکن میں ان ساتھیوں کے نام اور فون نمبرز نہیں جانتا۔ صرف ایک ہی نام جانتا ہوں۔ وہ نام اس کی کاپیوں اور کتابوں میں لکھا دیکھا ہے۔"

"میں نے تو کبھی اس کی کاپیاں اور کتابیں کھول کر نہیں دیکھیں۔ کیا نام ہے اس کا؟"

وہ جھجکتے ہوئے بولا۔ "سبیکا۔ اس لڑکی کا نام سبیکا ہے۔ وہ اس کی بہت تعریفیں کیا

کرتا ہے۔"

"بیٹا! اس لڑکی کا کوئی پتہ ٹھکانا تو ہو گا؟"

"وہ خود نہیں جانتا۔ کہہ رہا تھا' بہت دولتمند لڑکی ہے۔ تیس چالیس لاکھ کی کار میں بیٹھ کر کالج آتی ہے' آج شام کو جاتے وقت کہہ رہا تھا کہ مقدر آزمانے جا رہا ہے۔ واپس آ کر خوشخبری سنائے گا۔"

"مجھے بھی خوشخبری سنانے والی بات کہہ کر گیا تھا۔ کیا تمہیں یہ نہیں بتایا کہ کہاں جا رہا ہے؟"

"آنٹی! وہ تو ہوا کے گھوڑے پر سوار تھا۔ میں پوچھتا رہ گیا اور وہ یہ جا وہ جا۔"

وہ دونوں سر جھکا کر سوچنے لگے۔ ہاجرہ بی نے کہا۔ "طرح طرح کے اندیشے پیدا ہوتے ہیں۔ اس شہر میں آئے دن کچھ نہ کچھ ہوتا رہتا ہے۔ کسی کو حادثہ پیش آتا ہے' کسی کو گولی مار دی جاتی ہے' کسی کو اغوا کر لیا جاتا ہے۔ میں اسے ہمیشہ سمجھاتی ہوں کہ وہ اپنا شناختی کارڈ جیب میں رکھا کرے۔"

"میں نے دیکھا ہے۔ اس کی جیب میں شناختی کارڈ رہتا ہے۔ خدانخواستہ ایسی کوئی بات ہوتی تو ہمیں اطلاع مل جاتی۔ فی الحال آپ اپنے دل کو سمجھائیں۔ کل صبح میں آپ کے ساتھ اس کے کالج جاؤں گا۔ اللہ کرے کہ وہ صبح سے پہلے ہی گھر آ جائے۔"

ہاجرہ بی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ آنسو پونچھتی ہوئی گھر آ گئیں۔ کسی کا انتظار ہو اور وہ نہ آئے تو انتظار کرنے والا کیا کر سکتا ہے؟ اسے صبر کرنا ہی پڑتا ہے۔ وہ رات انہوں نے کسی نہ کسی طرح گزار دی۔ دوسرے دن وہ علی کے دوست کے ساتھ کالج پہنچیں۔ ایک جگہ دو چار اسٹوڈنٹ کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ ہاجرہ بی نے ان سے کہا۔ "بیٹا! میں علی رمزی کی ماں ہوں۔ وہ کل سے گھر نہیں آیا ہے۔ کیا تم نے اسے دیکھا ہے؟"

ان سب نے حیرانی سے ایک دوسرے کو دیکھا پھر ایک نے کہا۔ "تعجب ہے۔ وہ گھر کیوں نہیں آیا؟ ہو سکتا ہے' کسی رشتے دار کے ہاں رہ گیا ہو۔"

"یہاں ہمارا کوئی رشتے دار نہیں ہے۔ خدا کے لئے پتہ کرو' وہ کہاں ہے؟"

وہ سب اپنے اپنے طور پر اندازہ کرنے لگے۔ کوئی بھی علی کی ذاتی مصروفیات کے

بارے میں نہیں جانتا تھا۔ ایک لڑکی نے کہا۔ "مرینہ اور سبیکا سے اس کی اچھی انڈر سٹینڈنگ ہے۔ وہ کچھ بتا سکتی ہیں۔"

وہ بولیں۔ "سبیکا کا نام علی کی کاپیوں اور کتابوں میں لکھا ہوا ہے۔ یہ سبیکا کہاں ہے؟"

"وہ ابھی تک نہیں آئی ہے۔ شاید لیٹ آئے گی۔"

اسی وقت مرینہ دکھائی دی۔ ایک لڑکی نے اس کی طرف تیزی سے جاتے ہوئے آواز دی۔ "مرینہ! یہاں آؤ۔ علی کی والدہ آئی ہیں۔"

وہ رک گئی۔ اس لڑکی سے باتیں کرتی ہوئی ہاجرہ بی کے پاس آئی۔ انہیں سلام کرتے ہوئے پوچھا۔ "کیا علی کل سے نہیں آئے ہیں؟"

ماں نے کہا۔ "پتہ نہیں' کہاں چلا گیا ہے۔ میرا دل بہت گھبرا رہا ہے۔"

وہ ان کے شانے کو تھپک کر بولی۔ "آپ فکر نہ کریں۔ ہم ابھی انہیں ڈھونڈ نکالیں گے۔ آپ یہ بتائیں کل وہ گھر سے کس وقت نکلے تھے؟ کہاں گئے تھے؟"

"بیٹی! وہ بہت خوش تھا۔ لباس بدل کر جاتے وقت کہہ رہا تھا' واپسی میں وہ کوئی خوش خبری سنائے گا۔"

"خوش خبری؟" مرینہ نے سوچتے ہوئے پوچھا۔ "کیسی خوش خبری؟"

"اس نے اور کچھ نہیں کہا تھا۔ بیٹی! اس کی کاپیوں اور کتابوں میں سبیکا کا نام لکھا ہوا ہے۔ شاید وہ کچھ جانتی ہوگی۔ وہ کہاں ہے؟ اس سے پوچھو۔"

اس سے فون پر رابطہ کیا۔ دوسری طرف سے عبدالقادر کی آواز سنائی دی۔ اس نے کہا۔ "ہم کالج سے بول رہے ہیں۔ سبیکا سے بات کرنا چاہتے ہیں۔"

تھوڑی دیر بعد سبیکا کی آواز سنائی دی۔ وہ بولا۔ "سبیکا میں جمشید بول رہا ہوں۔ علی کی والدہ یہاں آئی ہیں۔ وہ بیٹے کے لئے پریشان ہیں۔ وہ کل سے گھر نہیں آیا ہے۔"

سبیکا نے ریسیور کے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر باپ سے کہا۔ "ڈیڈ! وہاں کالج میں علی کی ماں اسے تلاش کرتی ہوئی پہنچی ہے۔ مجھ سے پوچھا جا رہا ہے۔ میں انہیں کیا جواب دوں؟"

"جواب کیا دینا ہے؟ وہ چور ہے۔ اس نے چوری کی ہے اور اب حوالات میں ہے۔"

یہ بات چھپی نہیں رہے گی۔ انہیں بتا دو۔ چور کوئی بھی ہوتا ہم اسے پولیس کے حوالے ضرور کرتے۔"

وہ فون پر بولی۔ "علی حوالات میں ہے۔ اس نے دو لاکھ روپے چرائے تھے۔ وہ پولیس کی حراست میں ہے۔"

"کیا بکواس کر رہی ہو؟ علی نے اور چوری کی؟ تم کیسے جانتی ہو؟"

"وہ یہ رقم میرے گھر سے چرا کر لے گیا تھا۔ اس چوری کے کتنے ہی چشم دید گواہ ہیں۔"

"تمہارے گواہوں کی ایسی کی تیسی۔ وہ کس تھانے میں ہے؟"

دوسری طرف سے تھانے کا نام بتا کر فون بند کر دیا گیا۔ جمشید نے تمام اسٹوڈنٹس کو بتایا کہ علی پر چوری کا الزام لگا کر اسے حوالات میں بند رکھا گیا ہے۔ یہ سنتے ہی طلبہ و طالبات مشتعل ہو گئے۔ مرینہ چیخ چیخ کر سبیکا کے خلاف بولنے لگی۔ دوسرے طلبہ و طالبات کلاسیں چھوڑ کر آ رہے تھے اور علی پر لگائے ہوئے الزام کے خلاف غم و غصے کا اظہار کر رہے تھے۔ سبیکا کے خلاف نعرے لگا رہے تھے اور اس تھانے پر حملہ کرنے کا فیصلہ کر رہے تھے۔

پرنسپل اور تمام پروفیسرز نے انہیں سمجھایا کہ قانون کو ہاتھ میں نہیں لینا چاہئے۔ پہلے علی کو ضمانت پر رہا کرایا جائے پھر جھوٹا الزام لگانے والوں کے خلاف قانونی کارروائی کی جائے۔

مرینہ نے فوراً ہی اپنے ڈیڈی اور بھائیوں سے کہا۔ "علی کے مجھ پر بڑے احسانات ہیں۔ آپ فوراً تھانے پہنچ کر اسے ضمانت پر رہا کرائیں۔ تمام اسٹوڈنٹس تھانے پہنچ رہے ہیں۔"

جمشید دوسری یونین کا لیڈر تھا۔ علی نے اس کی مخالف یونین کے لیڈر کو گرفتار کرایا تھا۔ اس یونین کو تقریباً ختم کر چکا تھا۔ وہ بھی علی کا احسان مند تھا۔ وہ اور اس جیسے کتنے ہی اسٹوڈنٹس بڑے بڑے سرمایہ داروں کی اولاد تھے۔ سب ہی علی کی ضمانت لینے کی خاطر اپنے بزرگوں کو تھانے پہنچنے کے لئے کہنے لگے۔

ایک گھنٹے بعد تقریباً ایک سو طلبہ و طالبات کا قافلہ دو پروفیسرز کے ساتھ تھانے پہنچ

گیا۔ اسٹوڈنٹس نے تھانے کا محاصرہ کر لیا۔ انسپکٹر نے اس صورتِ حال سے پریشان ہو کر ایک پروفیسر سے کہا۔ "آپ طلبہ و طالبات کا جلوس لے کر کیوں آئے ہیں؟ یہ علی کی حمایت میں اور ہمارے خلاف نعرے لگا رہے ہیں۔ آپ یہ اچھا نہیں کر رہے ہیں۔"

ایک پروفیسر نے کہا۔ "علی پر صرف چوری کا الزام ہے۔ آپ اسے ضمانت پر رہا کر دیں گے تو اسٹوڈنٹس مشتعل نہیں ہوں گے۔ خاموشی سے علی کو لے کر چلے جائیں گے۔"

انسپکٹر مشکل میں پڑ گیا۔ علی کی اس قدر پٹائی کی گئی تھی کہ وہ زخموں سے چُور ہو گیا تھا۔ اس کی حالت دیکھتے ہی اسٹوڈنٹس وہاں ہنگامے شروع کر دیتے۔ اس نے اپنے افسر سے فون پر رابطہ کر کے صورتِ حال بتائی۔ اس نے غصے سے پوچھا۔ "تم نے اس پر ٹارچر کیوں کیا تھا؟ صرف ایک چوری کے الزام پر اس کی ایسی حالت کر دی کہ اسے نہ عدالت میں پیش کیا جا سکتا ہے نہ عوام کے سامنے۔ جس یونین کے اسٹوڈنٹس اسے لینے آئے ہیں اس کی سیاسی پارٹی والے بھی وہاں آ کر ہنگامے کریں گے۔ میں دوسرے سینئر افسران اور مسلح سپاہیوں کو بھیج رہا ہوں۔ پروفیسرز وغیرہ کو سمجھا کر ان سے معافی مانگ کر اس معاملے کو کسی طرح رفع دفع کرو۔"

اس وقت تک مرینہ کے والد اور جمشید وغیرہ کے بزرگ بھی علی کی ضمانت لینے آ گئے تھے۔ دوسرے سینئر افسران بھی پہنچ گئے۔ انہوں نے بند کمرے میں عاجزی سے بتایا کہ انسپکٹر نے علی پر مظالم ڈھائے ہیں۔ اسٹوڈنٹس علی کا حلیہ دیکھیں گے تو بری طرح مشتعل ہو جائیں گے۔ پہلے وہ تمام بزرگ اور اساتذہ ان اسٹوڈنٹس کو کالج واپس جانے کی ہدایت کریں پھر علی کو رہا کر دیا جائے گا۔

ان سب نے حوالات میں جا کر علی کو دیکھا۔ وہ زخموں سے چُور تھا۔ اس میں اتنی جان نہیں رہی تھی کہ وہ اپنے پروفیسرز کو دیکھ کر فرش پر سے اٹھ کر بیٹھ سکتا۔ مرینہ کے باپ نے کہا۔ "مائی گاڈ! اسے فوراً ہسپتال پہنچانا چاہئے اور آپ لوگوں نے اسے یہاں چھپا کر رکھا ہے۔ کیا آپ اس کی جان لینا چاہتے ہیں؟"

ایک سینئر افسر نے فوراً ہسپتال فون کر کے ایمبولینس لانے کو کہا۔ جمشید کے باپ نے کہا۔ "آپ لوگوں نے اس ملک کو کیا بنا دیا ہے۔ پولیس اسٹیٹ.......... یہاں پولیس کا

یا پھر غنڈوں کا راج ہے۔ میں ابھی تمام پریس والوں کو کال کر سکتا ہوں لیکن اس جھمیلے میں علی کو فوراً ہسپتال نہیں پہنچایا جاسکے گا۔"

مرینہ کے بھائی نے کہا۔ "آپ اس شیطان انسپکٹر کو ابھی ڈسچارج کریں۔ ورنہ اسٹوڈنٹس اس تھانے کو آگ لگا دیں گے۔"

تمام سینئر افسران نے مشترکہ طور پر اس انسپکٹر کو ڈسچارج کرنے کا فیصلہ سنایا۔ تھانے سے باہر آکر پروفیسر' مرینہ اور جمشید کے بزرگوں نے اسٹوڈنٹس کو سمجھایا کہ علی کی حالت نازک ہے۔ اسے فوراً ہسپتال پہنچایا جا رہا ہے۔ اگر وہ یہاں توڑ پھوڑ اور ہنگامے کریں گے تو علی کی رہائی میں مشکلات پیش آئیں گی۔

جب اسے اسٹریچر پر ڈال کر ایمبولینس میں پہنچایا جانے لگا تو طلبہ اسے زخموں سے چُور دیکھ کر غصے سے بپھر گئے۔ پولیس کے خلاف نعرے لگانے لگے۔ طالبات علی کو دیکھ کر رونے لگیں۔ مرینہ ایمبولینس کے اندر آگئی تھی۔ باپ اور بھائی کی موجودگی کا خیال کئے بغیر اس سے لپٹ کر رو رہی تھی۔ وہ اسی طرح اس کے ساتھ اسپتال پہنچی۔ ایمرجنسی وارڈ میں فوراً اسے اٹینڈ کیا گیا۔ مرینہ نے رو رو کر باپ سے کہا۔ "میں انہیں اسپتال میں نہیں رہنے دوں گی۔ انہیں فرسٹ ایڈ کے بعد گھر لے چلیں۔ ورنہ میں گھر نہیں جاؤں گی۔ یہیں رہا کروں گی۔"

اسے سمجھایا گیا کہ فی الحال علی کو اسپتال میں زیرِ علاج رکھنا ہوگا تاکہ علاج ہو سکے اور علی کو نقصان پہنچے تو پولیس والوں کے خلاف قانونی کارروائی کی جا سکے۔

صبح سے شام تک اسپتال کے اندر اور باہر طلبہ و طالبات کی بھیڑ لگی رہی۔ ڈاکٹروں نے بیان دیا کہ علی خطرے سے باہر ہے۔ مسلسل علاج سے ٹھیک ہو جائے گا۔ اسٹوڈنٹس نعرے لگا رہے تھے کہ شیطان انسپکٹر نے علی پر چوری کا جھوٹا الزام لگایا ہے اور عبدالقادر سومرو نے علی سے سیاسی انتقام لیا ہے۔ اخبارات کے رپورٹرز اور فوٹوگرافرز وہاں پہنچ رہے تھے۔ پولیس والوں کے لئے مشکلات پیدا ہوتی جا رہی تھیں۔ معاملے کو رفع دفع کرنے کے لئے یہ سمجھوتہ کیا جا رہا تھا کہ پولیس کے خلاف کارروائی اور ہنگامے نہیں کئے جائیں گے تو علی کو چوری کے الزام سے بری کر دیا جائے گا۔

سب سے پہلے مرینہ نے باپ سے کہا۔ "کوئی مخالفانہ کارروائی نہیں کی جائے گی۔

علی کو الزام سے بری کرایا جائے میں اسے اسپتال سے گھر لے جاؤں گی۔"

اس کے ذہن میں یہ بات تھی کہ علی اسپتال میں رہے گا تو سبیکا عیادت کے لئے آ سکتی ہے۔ وہ اس کا سایہ بھی علی پر نہیں پڑنے دینا چاہتی تھی۔ ڈاکٹر اسے فی الوقت چھٹی نہیں دینا چاہتے تھے۔ کم از کم چوبیس گھنٹوں تک وہاں زیرِ علاج رکھنا چاہتے تھے۔ جمال احمد نے بیٹی کو سمجھایا۔ "رات ہو چکی ہے۔ گھر چلو۔ کل اس وقت تک اسے یہاں سے فارغ کیا جائے گا تو ہم اپنے گھر لے جائیں گے۔ بشرطیکہ اس کی والدہ کو اعتراض نہ ہو۔"

ہاجرہ بی نے کہا۔ "آپ سب اتنی محبت اور توجہ سے علاج کرا رہے ہیں۔ میرے بیٹے کو آپ کے ہاں علاج کی سہولتیں حاصل ہوں گی تو میں مطمئن رہوں گی۔"

مرینہ اس رات گھر جانے سے انکار کرنے لگی۔ باپ نے سمجھایا۔ "بیٹی! یہ مناسب نہیں ہے۔ تمہیں یہاں نہیں رہنا چاہئے۔"

بڑے بھائی نے کہا۔ "مرینہ! اس بات کو سمجھو' علی سے ایسا کوئی رشتہ نہیں ہے کہ تم اس کی تیمارداری کے لئے یہاں رہو۔ ہمارے رشتے دار باتیں بنائیں گے۔"

"مجھے رشتے داروں اور دنیا والوں کی کوئی پروا نہیں ہے۔ علی نے میری آبرو بچائی تھی۔ مجھے نئی زندگی دی ہے۔ یہ زندگی علی کی امانت ہے۔ میں آج ہی نہیں ساری زندگی ان کی خدمت کرتی رہوں گی۔"

ہاجرہ بی اس کی باتیں سن رہی تھیں۔ انہوں نے کہا۔ "بیٹی! تم میرے بیٹے کے لئے ایسے خیالات اور جذبات رکھتی ہو۔ میں یہ دیکھ کر دل ہی دل میں تم پر قربان ہو رہی ہوں لیکن تمہیں ایک اچھی بیٹی کی طرح باپ کی اور بڑے بھائی کی بات مان لینی چاہئے۔ ایک رات کی بات ہے۔ میں اس کی دیکھ بھال کروں گی۔ تم صبح آ جانا۔"

وہ بولی۔ "آپ کو اس عمر میں تمام رات نہیں جاگنا چاہئے۔ آپ گھر جائیں یا یہاں سو جائیں۔ میں جاگتی رہوں گی۔ مجھے زبردستی یہاں سے بھیجا جائے گا تو مجھے گھر میں نیند نہیں آئے گی اور نیند نہیں آئے گی تو میں پھر یہاں چلی آؤں گی۔"

اس کے ڈیڈی اور بھائی جانتے تھے کہ وہ بہت ضدی ہے۔ اپنی بات منوا کر رہتی ہے اور یہ بات تو اچھی طرح سمجھ میں آ رہی تھی کہ وہ علی کو دل و جان سے چاہنے لگی ہے۔ انہیں اعتراض نہیں تھا۔ وہ مرینہ کے لئے ایسا ہی لڑکا چاہتے تھے جو ساری زندگی

اس کا محافظ بن کر رہے۔

وہ اسے وہاں چھوڑ کر چلے گئے۔ ہاجرہ بی نے کہا۔ "تمہاری یہ ضد بتا رہی ہے کہ میرے بیٹے کو بہت چاہتی ہو۔"

"میں نہیں جانتی کہ انہیں کتنا چاہتی ہوں۔ اتنا جانتی ہوں کہ ان کے بغیر جی نہیں سکوں گی۔"

وہ خوش ہو کر اس کا ہاتھ تھام کر بولیں۔ "اس کا مطلب ہے، تم میری بہو بنو گی؟"

وہ مسکراتی اور شرماتی ہوئی ان کے گلے سے لگ گئی۔ وہ کچھ سوچتے ہوئے بولیں۔

"یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ تم اسے اس قدر چاہتی ہو پھر یہ اپنی کاپیوں اور کتابوں میں سبیکا کا نام کیوں لکھتا ہے؟"

"آپ کے بیٹے بہت ہی بھولے ہیں۔ وہ ان سے جھوٹی محبت کرتی رہی۔ یہ اس کے فریب میں آ گئے۔ میں نے بہت سمجھایا تھا لیکن یہ مانتے ہی نہیں تھے۔ آج دیکھیں اس مکار لڑکی نے ان کا کیا حال کیا ہے۔"

ہاجرہ بی نے اسے بددعائیں دیتے ہوئے کہا۔ "اللہ نے چاہا تو ایک غریب اور یتیم بچے پر ظلم کرنے کی سزا اسے ضرور ملے گی۔ میں صبح سے تمہیں علی کی خاطر پریشان ہوتے اور بھاگ دوڑ کرتے دیکھ رہی ہوں۔ تم نہ ہوتیں تو تھانے والے اسے مار ہی ڈالتے۔ میں تو تمہیں اپنی بہو ضرور بناؤں گی۔"

مرینہ ان کا ہاتھ تھام کر بولی۔ "آپ کے صاحبزادے اسی کے دیوانے ہیں۔ کیا آپ ان کے دل سے اس دشمن لڑکی کو نکال سکیں گی؟ وہ لڑکی کالج میں دوبارہ نیک نامی حاصل کرنے کے لئے پھر آپ کے صاحبزادے کو پھانسے گی۔"

"اب تو میں اس کا سایہ بھی بیٹے پر نہیں پڑنے دوں گی۔ علی سے صاف کہہ دوں گی، اس کا نام بھی زبان پر لائے گا تو میں کھانا پینا چھوڑ دوں گی۔ اُس سے بات بھی نہیں کروں گی۔"

"مجھے یہی ایک فکر ہے۔ علی کچھ سوچتے سمجھتے نہیں ہیں۔ بس اسی کے پیچھے بھاگتے رہتے ہیں۔"

"تم کوئی فکر نہ کرو۔ اب تمہاری ساری فکریں دور کرنا میرا کام ہے۔ میں علی کو اب بے لگام نہیں ہونے دوں گی۔"

"آپ میری ایک بات مانیں۔"

"بیٹی! آج تم نے اتنا بڑا کام کیا ہے۔ میں بھلا تمہاری بات نہیں مانوں گی! بولو کیا بات ہے؟"

"پہلے آپ وعدہ کریں۔ جو کہوں گی، آپ وہی کریں گی۔"

"بہت ضدی ہو۔ چلو وعدہ کرتی ہوں۔ تم جو کہو گی، وہ کروں گی۔"

"آپ ابھی گھر جا کر آرام کریں۔"

"یہ کیا کہہ رہی ہو؟"

"آپ کل سے پریشان ہیں۔ کل رات سے جاگ رہی ہیں۔ یہاں آپ کو سکون سے گہری نیند نہیں آئے گی۔ آپ کی پریشانیوں کا اور آپ کے آرام کا خیال میں نہیں رکھوں گی تو اور کون رکھے گا۔"

"خوش رہو بیٹا! اللہ تعالیٰ تمہیں لمبی عمر دے۔ میری کوئی بیٹی نہیں ہے، جو میرا اتنا خیال رکھتی۔ آج پہلی بار ایسا لگ رہا ہے، مجھے بیٹی بھی مل رہی ہے اور بہو بھی۔"

"تو پھر آپ میری بات مان رہی ہیں نا؟ دیکھئے آپ نے ابھی وعدہ کیا ہے۔"

"میں بات مان لوں گی مگر گھر جا کر سارا دھیان ادھر ہی لگا رہے گا۔ مجھے گھر جانے کے لئے نہ کہو۔"

وہ اچانک قریب ہو کر ہاجرہ بی کے گلے لگ گئی پھر بولی۔ "میری امی نہیں ہیں۔ جب میں پانچ برس کی تھی، تب ہی وہ اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ میں آپ کو امی کہوں؟"

"ہاں بیٹی! ضرور کہو۔ بہو بن کر آؤ۔ تب بھی امی کہو۔"

"تو پھر بیٹی، بہو کچھ بھی سمجھ کر میری بات مان لیں اور گھر جا کر آرام کریں۔"

"تم واقعی ضدی ہو۔ بڑے پیار سے بات منوا لیتی ہو۔ ٹھیک ہے۔ تم جیتیں، میں ہاری۔ اب تو خوش ہو؟"

اس نے خوشی سے انہیں چوم لیا۔ علی کے سر پر اور چہرے کے اطراف پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ شام کو وہ ہوش و حواس میں تھا۔ اس نے اپنی امی اور پروفیسرز وغیرہ سے مختصر سی باتیں کی تھیں پھر دواؤں کے اثر سے سو گیا تھا۔ ہاجرہ بی نے کہا۔ "یہ بھوکا ہے۔ سو کر

اٹھے گا تو اسے کچھ کھلا پلا دینا۔"

"آپ فکر نہ کریں۔ میں کھلانے پلانے میں کمی نہیں کروں گی۔ ہر طرح سے خیال رکھوں گی۔"

وہ انہیں کمرے کے باہر تک رخصت کرنے آئی۔ وہاں اس کا ڈرائیور بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے کہا۔ "یہ میری امی ہیں۔ انہیں گاڑی میں لے جاؤ۔ واپسی میں گھر سے چکن سوپ' دودھ اور تازہ پھل لے آؤ۔"

وہ ڈرائیور کے ساتھ چلی گئیں۔ مرینہ نے ایک گہری سانس لی۔ کمرے میں آ کر دروازے کو اندر سے بند کیا پھر خوابیدہ محبوب کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگی۔

سبیکا اور اس کے باپ کو صبح سے یہ رپورٹ مل رہی تھی کہ کالج کے تمام اسٹوڈنٹس اس کی مخالفت میں نعرے لگا رہے ہیں پھر تھانے سے انسپکٹر نے گھبرا کر فون کیا کہ طلبہ و طالبات نے تھانے کا گھیراؤ کر لیا ہے۔ پروفیسرز' شہر کے معزز بزنس مین اور پولیس کے اعلیٰ افسران بھی پہنچ گئے ہیں۔ انہوں نے علی پر چوری کا جو الزام عائد کیا تھا' وہ کمزور پڑ گیا ہے۔ اسے سیاسی انتقام کہا جا رہا ہے۔

سبیکا نے پوچھا۔ "ڈیڈ! ہمارا کیس کمزور کیوں پڑ رہا ہے؟"

اس نے کہا۔ "انسپکٹر کی غلطی سے ہوا ہے۔ اس نے علی پر اس قدر تشدد کیا ہے کہ اسے اسپتال پہنچانے کی نوبت آ گئی ہے۔"

وہ پریشان ہو کر بولی۔ "اس پر تشدد کیوں کیا گیا ہے؟ یہ تو قانون کے خلاف ہے۔"

"ہماری سیاسی پارٹی کا لیڈر انتقام لینا چاہتا تھا۔ علی نے ہماری اسٹوڈنٹس یونین کو اس کالج سے تقریباً ختم کر دیا ہے۔ اسے تو ہیرو بننے کی سزا ملنی ہی تھی۔"

سبیکا نے باپ کو چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "کیا اس لئے علی کو چوری کے الزام میں تھانے پہنچایا گیا تھا؟"

"ہاں مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ اسے الزام سے بری کر دیا گیا ہے۔ انسپکٹر کو تسلیم کرنا پڑا ہے کہ اسے چوری کے الزام میں پھنسایا گیا ہے۔"

"اور یہ الزام ہمارے گھر سے لگایا گیا ہے اور ہم نے لگایا ہے۔ ڈیڈی! آپ نے ایسا کیوں کیا؟ مجھ سے بھی جھوٹ کہہ دیا۔ علی کو میری نظروں سے گرا دیا۔ وہاں کالج میں

میری کتنی بے عزتی ہو رہی ہے۔ سب یہی سمجھ رہے ہیں کہ میں نے اسے چور بنایا ہے۔ اسے تھانے اور اسپتال پہنچایا ہے۔ میں کیا منہ لے کر کالج جاؤں گی؟"

"شہر میں بہت سے کالج ہیں۔ کہیں بھی تمہارا ایڈمیشن ہو جائے گا۔"

"آپ نے علی سے کیوں دشمنی کی؟ مجھے بھی کیوں اس کا دشمن بنا دیا؟"

"میں نے اس کی اوقات اسے یاد دلائی ہے۔ آئندہ وہ ہماری بلندی کو چھونے کی کوشش نہیں کرے گا۔"

"یہ بلندی نہیں ہے۔ میں خود کو ایک گری ہوئی ذلیل لڑکی سمجھ رہی ہوں۔"

"فضول باتیں نہ کرو۔ ایسی جذباتی باتیں دماغ سے نکال کر پھینک دو۔ آئندہ تم اس کا نام بھی نہیں لو گی اور نہ ہی اس کالج میں جاؤ گی۔"

وہ سوچتی ہوئی نظروں سے باپ کو دیکھنے لگی۔ وہ بہت کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن کہنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ بہت کچھ کر گزرنے سے ہوتا ہے۔ وہ ناگواری سے منہ پھیر کر اپنے کمرے کی طرف جانے لگی۔ اسے یہ سوچ کر شرمندگی ہو رہی تھی کہ اس نے اپنے عاشق کی دیوانگی اور سچائی کو نہیں سمجھا۔ باپ کی باتوں میں آ کر اسے چور مان لیا۔ اب وہ اس کے سامنے کیسے جائے گی؟ کیسے اس سے نظریں ملائے گی؟ اسے کیسے یقین دلائے گی کہ وہ باپ کی سازشوں میں شریک نہیں تھی؟

وہ بیڈروم میں آ گئی۔ اپنے بستر کو دیکھ کر سوچنے لگی۔ "وہ اسپتال کے بستر پر پڑا ہو گا۔ ایک تو زخموں سے چُور ہے۔ اس پر میری بے وفائی اسے تکلیف پہنچا رہی ہو گی۔ مجھے وہاں جانا چاہئے۔ میں اپنی صفائی پیش کروں گی تو اس کی تکلیف کسی حد تک کم ہو جائے گی۔"

وہ لباس تبدیل کرنے لگی۔ اس وقت رات کے دس بج رہے تھے۔ اس نے انٹرکام پر گورنس سے کہا۔ "میں سو رہی ہوں۔ میرے دروازے پر دستک نہ دینا۔"

اس نے دروازے کو اندر سے بند کیا۔ زیرو پاور کا بلب روشن کر کے باقی لائٹس آف کر دیں۔ وہاں سے چلتی ہوئی دوسرے دروازے پر آئی۔ وہ دروازہ پائیں باغ کی طرف کھلتا تھا۔ وہ دروازہ کھول کر باہر آ گئی۔

☆------☆------☆

علی کی آنکھ کھل گئی۔ آنکھ کھلتے ہی مرینہ دکھائی دی۔ وہ مسکراتی ہوئی اس کے قریب آ رہی تھی۔ تب اسے یاد آیا کہ وہ زخمی ہے اور اسپتال میں ہے۔ وہ اپنے سر اور چہرے کے اطراف کی پٹیوں کو چھو کر محسوس کرنے لگا۔ انجکشن اور دواؤں کے باعث تکلیف کم ہوگئی تھی لیکن کمزوری محسوس ہو رہی تھی۔

وہ اٹھنا چاہتا تھا۔ مرینہ نے اسے سہارا دے کر بیڈ کے سرے سے ٹیک لگا کر بٹھایا اور کہا۔ "میں نے گھر سے چکن سوپ منگوایا ہے۔ اسے پی لو۔ توانائی ملے گی۔"

وہ ایک پیالے میں سوپ نکالنے لگی۔ وہ بولا۔ "مجھے کچھ یاد آ رہا ہے۔ میں نے یہاں امی کو دیکھا تھا۔"

"وہ یہاں تھیں۔ میں نے انہیں سمجھا منا کر گھر بھیجا ہے۔ بے چاری کل رات سے تمہاری تلاش میں بھٹک رہی تھیں۔ کالج پہنچ گئی تھیں۔ میں نے اور تمام سٹوڈنٹس نے پتا لگایا تو معلوم ہوا کہ سبیکا اور اس کے باپ نے تم پر چوری کا الزام لگایا ہے۔"

وہ اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ ایک ایک چمچ سوپ پلاتے ہوئے تمام روداد سنانے لگی۔ وہ سن رہا تھا اور چشم تصور سے دیکھ رہا تھا کہ عبدالقادر سومرو کس طرح کاروباری لین دین کی باتیں کر رہا تھا۔ سبیکا بھی باپ کی حمایت میں کہہ رہی تھی کہ وہ تمام پلاٹس اس کے نام کر دے۔ شادی کے بعد تو سب کچھ اسی کا ہوگا۔ وہ محبت سے اس کا ہاتھ مانگنے آیا تھا اور سبیکا اس سے لین دین کی باتیں کر رہی تھی۔

وہ باپ سے کہہ سکتی تھی کہ وہ تمام پلاٹس علی کی امی کے نام رہنے دیئے جائیں۔ وہ صرف علی کی محبت چاہتی ہے۔

وہ تقریباً انکار کر چکا تھا کہ وہ پلاٹس ماں سے نہیں لے گا اور اس کے انکار نے باپ بیٹی کو مایوس کیا تھا۔ اسی لئے انہوں نے اس پر چوری کا الزام لگا کر اسے پولیس والوں کے حوالے کر دیا تھا۔

حوالات کا منظر نگاہوں کے سامنے گھومنے لگا۔ ایک ایک ٹھوکر' ایک ایک ڈنڈا یاد آنے لگا۔ وہ غصے سے سوچنے لگا۔ سبیکا کا باپ حوالات میں آیا تھا۔ اس کی باتوں سے پتہ چلا تھا کہ اس سے سیاسی انتقام لیا جا رہا ہے۔ سبیکا نے اسے محبت سے نہیں' چوری کے الزام میں پھانسنے کی غرض سے اپنے گھر بلایا تھا۔

وہ غم اور غصے سے مٹھیاں بھینچنے لگا۔ مرینہ نے فوراً ہی پیالے کو ایک طرف رکھ کر اسے ہولے سے جھنجھوڑتے ہوئے مخاطب کیا۔ "علی! ہوش میں آؤ۔ تم غصے سے کانپ رہے ہو۔ زخموں سے لہو رسنے لگے گا۔ ایزی علی! ایزی۔"

وہ کمزوری کے باعث خود ہی ڈھیلا پڑ گیا۔ بڑی تکلیف سے لمبی لمبی سانسیں لینے لگا۔ مرینہ نے اسے سہارا دے کر سیدھا لٹایا پھر اس کے پاس آ کر لیٹ گئی۔ وہ کمزور سی آواز میں بولا۔ "یہ............ یہ کیا کر رہی ہو؟"

"تیمارداری کر رہی ہوں۔"

"نادانی نہ کرو۔ کوئی دیکھے گا تو کیا کہے گا؟"

"محبت بند کمرے میں بھی ہو تو اس کی خوشبو باہر تک جاتی ہے۔ تو پھر جانے دو۔ میں کسی سے نہیں ڈرتی۔ مجھے فخر ہے' میں نے ایک جھوٹی اور فریبی لڑکی کی اصلیت پہلے ہی بتا دی تھی۔ آج تمہیں ثبوت بھی مل گیا۔"

"بے شک تم نے اس کی اصلیت بتائی تھی۔ میں اس کی طلب میں اندھا ہو کر تمہاری سچائی کو نہ سمجھ سکا لیکن تم اتنی رات کو یہاں ہو۔ کیا تمہارے والدین اور رشتے دار تمہیں کچھ نہیں کہیں گے؟"

"کچھ کہتے تو میں یہاں نہیں ہوتی۔ میں نے اپنے ڈیڈی اور بھائی کو اپنی باتوں اور عمل سے سمجھا دیا ہے کہ تم نے میری آبرو بچائی ہے۔ میری جان بچائی ہے۔ مجھے نئی زندگی دی ہے۔ میں نے یہ زندگی تمہارے لئے وقف کر دی ہے۔ تم مجھے چاہو یا نہ چاہو۔ میں نہیں کہوں گی کہ میری محبت کے بدلے محبت دو۔ یہ کوئی کاروبار نہیں ہے کہ میں تم سے لین دین کروں۔"

وہ متاثر ہو کر بولا۔ "تم بہت اچھی ہو۔ میں نے تمہیں سمجھنے میں غلطی کی تھی۔"

وہ کبھی اس کی پٹیوں پر ہاتھ رکھ رہی تھی۔ کبھی اس کے شانے اور بازو کو سہلا رہی تھی پھر اس نے اپنا چہرہ اس کے چہرے پر رکھ کر کہا۔ "ایک وعدہ کرو۔ تم مجھ سے محبت نہ کرو۔ تب بھی مجھے محبت کرنے سے نہیں روکو گے۔ مجھے میرے حصے کی محبت کرنے دو گے۔"

چہرے پر چہرہ تھا۔ سانسوں سے سانسیں الجھ رہی تھیں۔ علی کو نہ چاہتے ہوئے بھی

اچھا لگ رہا تھا۔ وہ اپنی سچائی اور اپنی محبت سے اسے متاثر کر چکی تھی۔ اس قدر مار کھانے اور زخموں سے چُور ہونے کے بعد مرینہ کی پیار بھری قربت سحر طاری کر رہی تھی اور کمزوری کے باعث آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔

وہ بڑی نقاہت سے بولا۔ "میں نہیں جانتا' تمہیں کتنی محبت دے سکوں گا لیکن تمہاری محبت کا یہ انداز مجھے نئی مسرتیں دے رہا ہے۔ میں بیان نہیں کر سکتا' تم کتنی اچھی لگ رہی ہو۔ میں ڈوب رہا تھا۔ تم مجھے بچا رہی ہو۔"

بولتے بولتے اس کی آواز ڈوب رہی تھی۔ مرینہ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کی آنکھیں بند ہو گئی تھیں۔ وہ نقاہت کے باعث سو گیا تھا۔ وہ بڑے جذبوں میں ڈوب کر اسے دیکھنے لگی۔ یہ خوشی کچھ کم نہیں تھی کہ وہ اس کی محبت کا اعتراف کرتے کرتے سو گیا تھا۔ وہ اسے دیکھ رہی تھی۔ ہولے ہولے اس کے بدن کو سہلا رہی تھی اور اسے سر سے پاؤں تک چومتی جا رہی تھی۔

فون کی گھنٹی نے چونکا دیا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ گھنٹی کی آواز سے اس کی آنکھ کھل جائے۔ اس نے فوراً ہی بستر سے اتر کر ریسیور کو اٹھایا پھر دھیمی آواز میں کہا۔ "ہیلو۔"

دوسری طرف سے اسپتال کی کاؤنٹر گرل نے کہا۔ "یہ ملاقات کا وقت تو نہیں ہے لیکن ایک مس صاحبہ پیشنٹ سے ملنے کی ضد کر رہی ہیں۔ کیا آپ اجازت دیں گی؟"

"یہ کوئی پوچھنے کی بات ہے؟ رات آدھی ہونے والی ہے۔ ایسے وقت سگے رشتے داروں کو بھی ملنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ بائی دا وے وہ محترمہ کون ہیں؟ کیا نام ہے؟"

"یہ اپنا نام سبیکا بتا رہی ہیں۔"

مرینہ کے ذہن کو ایک جھٹکا لگا۔ دماغ گرم ہو گیا۔ جو محبت ابھی ابھی اسے ملی تھی' اسے وہ پھر چھیننے آئی تھی۔ وہ غصے پر قابو پاتے ہوئے بولی۔ "آپ اسے وہیں روکیں۔ میں آ رہی ہوں۔"

اس نے ریسیور رکھ کر علی کی طرف دیکھا۔ وہ سو رہا تھا۔ اگر سبیکا یہاں آ جاتی تو اس کی نیند میں خلل پڑتا اور مرینہ کی تنہائی میں تو خلل پڑ ہی چکا تھا۔ اس نے کمرے سے باہر آ کر آہستگی سے دروازے کو بند کر دیا۔ لفٹ کی طرف جانے لگی۔

ادھر کاؤنٹر گرل نے ریسیور رکھتے ہوئے سبیکا سے کہا۔ "وہ مریض سے ملنے کی اجازت نہیں دیں گی۔ خود یہاں آ رہی ہیں۔"

سبیکا براہ راست علی سے ملنے آئی تھی۔ یہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ کوئی آنے والی اسے یہیں سے ٹال دے۔ اس نے پرس میں سے ایک ہزار کا نوٹ نکال کر کاؤنٹر گرل کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "پلیز! مجھے اس کمرے میں جانے دو۔"

وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔ "یہ آپ کیا کر رہی ہیں؟ وہ آنے والی اعتراض کرے گی۔"

"اس سے کہہ دینا۔ تم فون پر باتیں کر رہی تھیں۔ اسی وقت نہ جانے میں کہاں چلی گئی۔ تم نے مجھے جاتے نہیں دیکھا ہے۔"

اس نے پرس میں سے ہزار کے اور دو تین نوٹ نکال کر اسے دیئے۔ وہ جلدی سے نوٹ لے کر چھپانے لگی۔ سبیکا تیزی سے چلتی ہوئی لفٹ کے پاس آئی۔ وہاں دو لفٹیں تھیں۔ ایک اوپر گئی ہوئی تھی۔ یقیناً مرینہ کو لینے گئی تھی۔ وہ دوسری لفٹ میں آ گئی۔ دروازہ بند ہو گیا۔ وہ لفٹ اوپر جانے لگی۔ دوسری لفٹ نیچے آ رہی تھی۔

ایک بہت ہی پرانا گیت ہے۔ "تیری گٹھری کو لاگا چور مسافر جاگ ذرا۔"

گیت سن کر یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ مسافروں کو مال سے بھری ہوئی گٹھری پاس رکھ کر گہری نیند نہیں سونا چاہئے۔ چور تاک میں لگے رہتے ہیں۔ اس گیت کے مطابق مسافر کو جاگتے رہنا چاہئے۔

مرینہ نے یہی غلطی کی۔ اپنی گٹھری کھلی چھوڑ کر لفٹ کے ذریعے نیچے کاؤنٹر کی طرف گئی۔ سبیکا دوسری لفٹ سے اوپر آ گئی۔ اس کمرے کا دروازہ باہر سے بند تھا۔ اس نے اسے کھول کر اندر جھانکا۔ علی سفید صاف شفاف بیڈ پر آنکھیں بند کئے لیٹا ہوا تھا۔

وہ اندر آ گئی۔ اچھا ہوا' اس کی آنکھیں بند تھیں۔ وہ اس کا سامنا کرتے ہوئے جھجکتی' ندامت سے نظریں نہ ملا پاتی۔ وہ ذرا رک رک کر اس کی طرف بڑھتے ہوئے سوچنے لگی۔ "کیا یہ جاگ رہا ہے؟ نہیں۔ سو رہا ہے۔ جاگ رہا ہوتا تو میری آہٹ سن لیتا۔ کیا میں اسے آواز دوں؟"

وہ آ تو گئی تھی لیکن کشمکش میں مبتلا ہو گئی تھی۔ اس کے زخم اور اس کی پٹیاں دیکھ کر اسے اتنی تکلیف ہو رہی تھی کہ وہ کھڑی نہ رہ سکی۔ اس کے قدموں میں جھک گئی۔

آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل آئے۔ وہ اس کے دونوں پیروں سے لپٹ گئی۔ سسک سسک کر رونے لگی۔

مرینہ نے نیچے آ کر اِدھر اُدھر دور تک دیکھا۔ سبیکا دکھائی نہیں دی۔ اس نے کاؤنٹر گرل سے پوچھا۔ ”کہاں ہے وہ لڑکی؟ ابھی تم نے روم تھری زیرو فور میں فون کیا تھا۔“

وہ ذرا جھجک کر بولی۔ ”وہ.......... وہ یہاں آئی تھی۔ تھری زیرو فور کے پیشنٹ سے ملنا چاہتی تھی۔ میں نے کہا‘ آدھی رات کو یہاں کسی وزیٹر کو ALLOW نہیں کیا جاتا لیکن وہ ضد کرنے لگی۔ تب میں نے آپ کو فون کیا۔“

”لیکن وہ ہے کہاں؟“

”پتا نہیں۔ میں نے ریسیور رکھ کر پلٹ کر دیکھا تو وہ نہیں تھی۔ شاید جا چکی ہے۔“

”جو آدھی رات کو مریض سے ملنے کی ضد کر رہی تھی۔ وہ ملاقات کئے بغیر کیسے چلی جائے گی۔“

”میں کیا کہہ سکتی ہوں؟ جب وہ یہاں نہیں ہے تو پھر جا چکی ہو گی۔“

”وہ لفٹ یا زینے کی طرف تو نہیں گئی تھی؟“

”میں نے کہا نا۔ میں دوسری طرف منہ کئے آپ سے فون پر باتیں کر رہی تھی۔ میں نے اسے کسی بھی سمت جاتے ہوئے نہیں دیکھا ہے۔ آپ پریشان کیوں ہو رہی ہیں۔ وہ جا چکی ہو گی۔“

”وہ بڑی ڈھیٹ اور مکار ہے۔ مجھے اوپر جا کر دیکھنا چاہئے۔“

وہ تیزی سے چلتی ہوئی لفٹ کی طرف جانے لگی۔ کاؤنٹر گرل پریشان ہو کر اسے جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

سبیکا آنسوؤں سے اس کے پیروں کو دھو رہی تھی۔ نمی کے باعث علی نیند میں کسمسانے لگا۔ اپنے دونوں پیروں کو ایک دوسرے سے رگڑنے لگا۔ سبیکا نے چونک کر اسے دیکھا پھر اپنے دوپٹے سے اس کے پیروں کو پونچھنے لگی۔

وہ نیند میں کراہ رہا تھا۔ وہ کراہیں اس کے زخموں سے ابھر رہی تھیں اور اس کے ہونٹوں سے نکل رہی تھیں۔ سبیکا دل پکڑ کر رہ گئی۔ اس کا ضمیر شدت سے ملامت کر رہا تھا کہ وہ زخم اس نے دیئے ہیں۔ اس نے انجانے میں اس سے بدترین دشمنی کی ہے۔

وہ قدموں کے پاس سے اٹھ گئی۔ اس کے سرہانے آ کر دونوں ہاتھ جوڑ کر کہنے لگی۔ ”مجھے معاف کر دو۔ تم نے محبت کی‘ میں نے ظلم کیا۔ ایک بار معاف کر دو۔ مجھے اپنی غلطی کی تلافی کا موقع دو۔ میں تمہیں اتنی محبتیں دوں گی کہ تم ساری دنیا کو بھول جاؤ گے۔ صرف مجھے یاد رکھو گے۔“

وہ آگے کچھ نہ کہہ سکی۔ آہٹ سن کر سر گھما کر دیکھا۔ مرینہ دروازہ کھول کر اندر آ گئی تھی۔ وہاں سبیکا کو دیکھتے ہی غصے سے بولی۔ ”تم..........؟ تم یہاں کیوں آئی ہو؟ کیسے آئی ہو؟ وہاں کاؤنٹر والی کو تو دھوکا دیا ہے۔ مجھے دھوکا نہیں دے سکو گی۔ نکلو یہاں سے۔“

وہ مرینہ کو دیکھ کر حیرانی سے بولی۔ ”تم اتنی رات کو یہاں کیا کر رہی ہو؟ اور تم مجھے یہاں سے نکالنے والی کون ہوتی ہو؟ کیا تم بھی کاؤنٹر والی کو دھوکہ دے کر آئی ہو؟“

”میں تمہاری طرح دھوکے باز نہیں ہوں۔ میں اسے تھانے سے رہائی دلا کر یہاں لائی ہوں۔ شرم کرو‘ تم نے اس پر چوری کا الزام لگایا۔ میں نے اس کے دامن سے یہ داغ دھو دیا ہے۔ تم کیا منہ لے کر آئی ہو؟“

”میں اپنی صفائی پیش کرنے آئی ہوں۔ مجھ سے ایک غلطی ہو گئی ہے۔ میں اس کی تلافی کرنے آئی ہوں۔“

”تلافی کرنا چاہتی ہو تو اپنے باپ کے ساتھ کالج میں تمام اسٹوڈنٹس کے سامنے آؤ۔ تم باپ بیٹی کی ایسی درگت بنائی جائے گی کہ ساری زندگی یاد کرتے رہو گے۔“

”تم بہت زیادہ بول رہی ہو۔ علی جاگ رہا ہوتا تو میں ابھی اس کے دل سے سارا میل دھو دیتی۔ اس کی غلط فہمی دور کر دیتی پھر یہ میرے خلاف تمہیں ایک لفظ بولنے نہ دیتا۔“

”تمہیں بڑی خوش فہمی ہے کہ یہ پھر تمہارے پیچھے دوڑنے لگے گا۔ ایسا تو میں کبھی نہیں ہونے دوں گی۔ اگر تم پانچ منٹ میں یہاں سے نہ گئیں تو میں اسپتال کی انتظامیہ اور عملے کو یہاں بلاؤں گی۔ وہ تمہیں یہاں سے نکال دیں گے۔“

سبیکا نے کہا۔ ”میں ان سے پوچھوں گی کہ تمہیں ایک نامحرم کے ساتھ یہاں رہنے کی اجازت کیوں دی گئی ہے۔ علی سے تمہارا کیا رشتہ ہے؟ میں تو یہاں سے نکلوں گی ہی تمہیں بھی یہاں سے ضرور نکلواؤں گی۔“

مرینہ اسے پُرسوچ نظروں سے دیکھنے لگی۔ بے شک وہ دین اور دنیا کے دستور کے خلاف ایک نوجوان لڑکے کے ساتھ تنہا کمرے میں رات نہیں گزار سکتی تھی' خواہ وہ بیمار ہی کیوں نہ ہو۔ سبیکا کی جوابی کارروائی کے باعث اسے بھی وہاں سے جانا پڑتا۔

پھر بھی وہ بڑے عزم سے بولی۔ "تم مجھے اس کمرے سے نکلوا سکتی ہو لیکن میں علی کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔ اسپتال کے برآمدے میں بیٹھی رہوں گی۔ تمہیں دوبارہ یہاں گھسنے نہیں دوں گی۔"

سبیکا نے کہا۔ "تو پھر میرے ساتھ اس کمرے سے نکلو۔ میں بھی یہاں صبح تک رہوں گی۔ تمہیں علی کے پاس آنے نہیں دوں گی۔"

مرینہ نے چیلنج کیا۔ "سوچ لو۔ میں یہاں سے باہر جاتے ہی یونین لیڈر جمشید کو فون کر دوں گی۔ وہ بیس پچیس اسٹوڈنٹس کو تو ضرور لے آئے گا۔ میں ڈیڈی اور اپنے بھائیوں کو بھی بلاؤں گی۔ ہمت ہے تو تم اپنے باپ کو بلاؤ۔ اسٹوڈنٹس تمہارے ساتھ وہ سلوک کریں گے کہ تمہارا باپ بھی تمہیں ان سے نہیں بچا سکے گا۔"

سبیکا سوچ میں پڑ گئی۔ وہ باپ سے چھپ کر آئی تھی۔ علی پر چوری کا لگایا ہوا الزام غلط ثابت ہوا تھا۔ وہ باپ بیٹی اپنے مخالفین کا سامنا نہیں کر سکتے تھے۔ وہ شکست خوردہ سی ہو کر بولی۔ "ٹھیک ہے۔ تم یہاں رہو۔ میں جا رہی ہوں۔ کل دن کے وقت وزیٹنگ آورز میں آکر اس سے ملوں گی۔"

اس نے جانے سے پہلے علی کو گھوم کر دیکھا اور آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اس کے پاس آئی۔ وہ بے خبر سو رہا تھا۔ یہ نہیں جانتا تھا کہ چکی کے دو پاٹ کس طرح گھوم رہے ہیں۔ ایک دوسرے سے رگڑ کھا رہے ہیں اور وہ ان کے درمیان پس رہا ہے۔ آئندہ بھی بری طرح پسنے والا ہے۔

سبیکا نے اپنے خوابیدہ محبوب کے ایک ہاتھ کو تھام لیا۔ مرینہ نے اسے گھور کر دیکھا۔ اس نے فاتحانہ انداز میں اسے دیکھا پھر بڑی محبوبیت سے جھک کر اس کے ہاتھ کو چوم لیا۔ مرینہ نے تڑپ کر آگے بڑھتے ہوئے اعتراض کیا۔ "یہ کیا کر رہی ہو؟ وہ زخموں سے چُور ہے۔ آرام سے سو رہا ہے اور تم اسے جگا رہی ہو۔"

وہ اس کے ہاتھ کو چھوڑ کر سیدھی کھڑی ہوئی پھر بولی۔ "تم کیا جانو پیار کیا ہوتا ہے؟

میں نے اس کے ایک ہاتھ کو بوسہ دیا ہے۔ یہ بوسہ اس کی رگوں میں لہو کی طرح دوڑتا ہوا اس کے دماغ میں پہنچ رہا ہوگا۔ اسے اور زیادہ پیار کی میٹھی نیند سلا رہا ہوگا۔"

یہ کہتے ہی وہ پلٹ کر جانے لگی۔ مرینہ اس کے پیچھے چلتے ہوئے کمرے سے باہر آئی۔ لفٹ تک اس کا پیچھا کیا تاکہ اس کے چلے جانے کا یقین ہو جائے۔ جب لفٹ کا دروازہ کھلا اور وہ اندر چلی گئی تو مرینہ نے دروازے کو پکڑ کر کہا۔ "تمہیں چند لمحات ملے اور تم نے ایک بوسہ دیا۔ میرے لئے ساری رات پڑی ہے۔ میں صبح تک اسے تم سے زیادہ میٹھی نیند سلاؤں گی۔"

یہ کہتے ہی اس نے خودکار دروازے کو چھوڑ دیا۔ سبیکا کوئی جواب نہ دے سکی۔ دروازہ بند ہو گیا۔ لفٹ نیچے چلی گئی۔ وہ تھوڑی دیر تک وہاں کھڑی رہی پھر گہری سنجیدگی سے سوچتی ہوئی کمرے میں آئی۔ دروازے کو اندر سے بند کر لیا۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ سبیکا اتنی ڈھیٹ ہو گی۔ علی پر ظلم کرنے اور اس کی محبت ہارنے کے بعد پھر اسے جیتنے آئے گی۔

وہ علی کے پاس آئی اور بستر کے سرے پر بیٹھ کر پریشانی سے سوچنے لگی۔ کیا وہ علی کو پھر اپنی طرف مائل کر لے گی؟ کیا یہ پھر اس کا دیوانہ ہوگا؟

یہ سوچتے ہی اس نے علی کے ہاتھ کو تھام لیا جیسے سبیکا ابھی اسے چھین کر لے جا رہی ہو پھر اس ہاتھ کو تھام کر یاد آیا کہ اس کمینی نے وہاں اپنے ہونٹ رکھے تھے۔ وہ فوراً ہی اپنے آنچل سے اس ہاتھ کو پونچھنے لگی۔ دل ہی دل میں قسمیں کھانے لگی کہ آئندہ وہ اسے کمرے میں گھسنے نہیں دے گی۔ وزیٹنگ آورز میں تمام اسٹوڈنٹس کو بلائے گی تاکہ سبیکا آئے تو وہ سب اس کا محاسبہ کریں اور اسے علی سے ملنے کی اجازت نہ دیں۔

پھر یہ بھی دل میں ٹھان لی کہ اب اسے اسپتال میں نہیں رہنے دے گی۔ اپنے ڈیڈی سے ضد کر کے اسے اپنے گھر لے جائے گی اس پر سبیکا کا سایہ بھی نہیں پڑنے دے گی۔

اس نے وہاں سے اٹھ کر لائٹ آف کی۔ زیرو پاور کے بلب کو آن رکھا پھر اس کے پاس آکر لیٹ گئی۔

☆======☆======☆

سبیکا اپنے باپ کی اجازت کے بغیر چھپ کر پچھلے دروازے سے اسپتال گئی تھی۔

واپسی میں سامنے کے دروازے سے کوٹھی کے اندر آئی۔ وہاں اس کا باپ غصے سے ٹہل رہا تھا۔ گورنس اور دوسرے ملازم اس سے ذرا دور ہاتھ باندھے سر جھکائے کھڑے ہوئے تھے۔

عبدالقادر سومرو ٹہلتے ٹہلتے رک گیا۔ اسے دیکھتے ہی گرج کر بولا۔ ”کہاں گئی تھیں؟“

وہ بولی۔ ”آپ بخوبی سمجھ رہے ہیں کہ میں کہاں سے آ رہی ہوں۔ میں نے آپ کی باتوں میں آ کر انجانے میں بہت بڑی غلطی کی ہے۔ اس غلطی کی تلافی کرنے گئی تھی۔“

”میری اجازت کے بغیر تمہیں جانے کی جرأت کیسے ہوئی؟ میں تمہیں شوٹ کر دوں گا۔“

”کسی نہ کسی دن تو مرنا ہی ہے۔ تو پھر آج ہی سہی۔“

وہ غصے سے تلملاتے ہوئے بولا۔ ”کیا تمہیں احساس ہے کہ تم نے وہاں جا کر میری انسلٹ کی ہے؟“

”اپنی غلطی تسلیم کرنے اور معافی مانگ لینے سے انسلٹ نہیں ہوتی لیکن مجھے معافی مانگنے کا موقع نہیں ملا۔ وہ زخموں کی تکلیف سے نڈھال ہو کر گہری نیند سو رہا تھا۔ ڈیڈی! یہ کیسا ظلم ہے۔ ایک تو آپ نے اس پر چوری کا الزام لگایا پھر اس بے گناہ پر تشدد بھی کرایا۔ آپ نے ایسا کیوں کیا؟“

”میں نے جو بہتر سمجھا وہ کیا۔ اس کے لئے میں تمہارے سامنے جواب دہ نہیں ہوں۔ آئندہ تم اس لڑکے سے ملنے نہیں جاؤ گی۔ اگر ایک بار مجھے دھوکہ دے کر جاؤ گی تو پھر کبھی اس گھر سے باہر قدم نہیں نکال سکو گی۔ اس کوٹھی میں قیدی بن کر رہا کرو گی۔ جاؤ یہاں سے.......... دور ہو جاؤ میری نظروں سے۔ مجھے تم سے نفرت ہو گئی ہے۔“

وہ چپ چاپ سر جھکا کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ رات کے دو بج رہے تھے۔ بستر پر لیٹنے اور سونے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ سبھی اس کے دشمن ہو گئے تھے۔ گھر میں باپ دشمن تھا۔ باہر تمام طلبہ اور طالبات اس کا محاسبہ کرنے والے تھے پھر علی تک پہنچنے کے سلسلے میں مرینہ سب سے بڑی رکاوٹ بن گئی تھی۔

ان لمحات میں وہ بالکل تنہا رہ گئی تھی۔ علی تو اس سے بدظن ہو چکا تھا۔ مرینہ اسے

اور زیادہ بدظن کرنے والی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس طرح علی کے سامنے اپنی صفائی پیش کر سکے گی۔ اسے بہکانے اور بھڑکانے والے بہت تھے۔ اس کی حمایت میں بولنے والا کوئی ایک بھی نہیں تھا۔

دروازے پر دستک سنائی دی۔ اس نے پلٹ کر دروازے کی طرف دیکھا پھر کہا۔

”کم ان۔“

گورنس نے اندر آ کر کہا۔ ”بے بی! تمہیں جانا تھا تو تم مجھ سے کہہ دیتیں یا صاحب سے اجازت لے لیتیں۔ وہ بہت غصے میں ہیں۔ پتہ نہیں کتنی جگہ فون کر رہے تھے اور جلد سے جلد تمہاری شادی کرنے کی باتیں کر رہے تھے۔ کل وہ لڑکے والوں سے ملنے بھی جائیں گے۔“

وہ پریشان ہو کر گورنس کی باتیں سن رہی تھی یہ ایک نئی تکلیف وہ بات تھی کہ اس کا رشتہ کہیں طے کیا جا رہا تھا۔ اب تو وہ علی کے سوا کسی اور کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ وہ اس کی وجہ سے زخم کھانے کے بعد اس کے لئے اور زیادہ اہم ہو گیا تھا۔ اس کے دل میں نامعلوم گہرائیوں تک اتر گیا تھا۔

گورنس نے کہا۔ ”صاحب نے حکم دیا ہے کل سے تم کالج نہیں جاؤ گی۔ باہر کہیں بھی جانے سے پہلے صاحب سے اجازت لیا کرو گی۔ مجھے اور تمام ملازموں کو حکم دیا ہے کہ ہم تمہیں کوٹھی سے باہر نہ جانے دیں۔“

وہ اپنی توہین محسوس کر رہی تھی۔ گھر کے ملازموں کی نگرانی میں اسے رکھا جا رہا تھا۔ آئندہ اسے ملازموں سے ڈر کر رہنا تھا۔ وہ کہیں چھپ کر جانا چاہتی تو ان ملازموں کی اجازت کے بغیر نہیں جا سکتی تھی۔ باپ نے اسے سبھی کی نظروں سے گرا دیا تھا۔ باہر تو طلبہ اور طالبات سے منہ چھپانے ہی والی تھی۔ گھر میں بھی کسی سے نظریں نہیں ملا سکتی تھی۔

اس نے ناگواری سے گورنس کو دیکھا پھر کہا۔ ”آپ نے ڈیڈی کے احکامات سنا دیئے۔ میں نے سن لئے۔ اب یہاں سے جائیں مجھے سونے دیں۔“

گورنس وہاں سے چلی گئی۔ سبیکا دروازے کو بند کر کے بے چینی سے ٹہلنے لگی۔ دیکھتے ہی دیکھتے سختیاں اور پابندیاں بڑھ گئی تھیں۔ اب اسپتال جانا تو دور کی بات تھی۔ وہ

گھر سے باہر قدم بھی نہیں رکھ سکتی تھی۔ یہ محرومی کا خیال اسے مار رہا تھا کہ وہ علی کے سامنے ایک خطاوار کی طرح بھی حاضر نہیں ہو سکے گی۔ اپنی بے گناہی کا حساب نہیں دے سکے گی۔ اس کی غلط فہمی دور نہیں کر سکے گی۔

وہ سوچ رہی تھی لیکن علی سے ملنے کا کوئی راستہ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس نے ایک صوفے پر بیٹھ کر دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام لیا۔ آنکھیں بند کر لیں۔ اب تو اس کی پہلی اور آخری خواہش یہی تھی کہ کسی بھی طرح علی کے دل سے کدورتیں دور کر دے۔ اس کی نظروں میں پہلے کی طرح محبوب کا درجہ حاصل کر لے۔

سوچتے سوچتے اسے اپنے ایک جاننے والے کا خیال آیا۔ وہ کالج کے دفتر میں ملازم تھا۔ اس کا نام شبیر احمد تھا۔ عبدالقادر سومرو کی سفارش سے ہی اسے وہاں ملازمت ملی تھی۔ وہ ان باپ بیٹی کا احسان مند تھا۔

شبیر احمد کا خیال آتے ہی سبیکا نے موبائل فون کے ذریعے اس سے رابطہ کیا۔ اس وقت رات کے تین بجنے والے تھے۔ وہ گہری نیند میں تھا۔ فون کی گھنٹی دیر تک بجتی رہی تب اس کی آنکھ کھلی۔ اس نے ریسیور اٹھا کر جھنجلا کر پوچھا۔ "کون ہے؟"

پھر سبیکا کی آواز سنتے ہی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ جلدی سے بولا۔ "سبیکا! یہ تم ہو۔ میں تمہارا ادا شبیر احمد بول رہا ہوں۔"

وہ بولی۔ "ادا! میرا ایک کام کرو گے؟"

"یہ کوئی پوچھنے کی بات ہے؟ ایک نہیں ایک ہزار کام بتاؤ ابھی کروں گا۔"

"تم ایک موٹر بائیک خریدنا چاہتے تھے۔"

"ہاں خریدنے کے خواب دیکھتا ہوں مگر خرید نہیں سکتا۔ نئی بائیک ستر ہزار روپے کی آتی ہے۔"

"کل کسی وقت آ کر یہ رقم لے جاؤ۔"

"کیا!" وہ بے یقینی اور حیرانی سے بولا۔ "تم مجھے ستر ہزار روپے دو گی؟"

"تم میرے ادا ہو۔ کیا میں تمہاری ضرورت کے وقت کام نہیں آؤں گی؟ اور کیا تم میری ضرورت کے وقت کام نہیں آؤ گے؟"

"ضرور ضرور۔ میں تو تمہارے لئے جان بھی دے سکتا ہوں۔"

"تم دیکھ رہے ہو پورے کالج میں میرے خلاف نفرتیں پیدا ہو گئی ہیں۔ کیا یہ نفرتیں دور کرنے میں میری مدد کرو گے؟"

"تم نہ کہتیں تب بھی میں تمہارے لئے بہت کچھ کرنے والا تھا۔ ابھی صرف اسٹوڈنٹس ہی نہیں پرنسپل اور پروفیسرز وغیرہ بھی تمہارے خلاف ہیں۔ کل میں سب سے مل کر ان کی غلط فہمی دور کرنا چاہتا ہوں۔"

"جب تک تمہیں میرے صحیح حالات کا علم نہیں ہو گا تم کسی کے سامنے میری بے گناہی ثابت نہیں کر سکو گے۔ یہ درست ہے کہ علی پر چوری کا جھوٹا الزام لگایا گیا تھا۔ دراصل ڈیڈی نے اس سے سیاسی انتقام لیا تھا۔ یہ حقیقت مجھے بعد میں معلوم ہوئی۔ سبھی یہ سمجھ رہے ہیں کہ میں نے بھی ڈیڈی کی اس سازش میں شریک ہو کر اسے اسپتال پہنچایا ہے۔"

"انکل کو ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔ ان کی سیاست کی وجہ سے تم بدنام ہو رہی ہو۔"

"تم ذاتی طور پر پرنسپل اور پروفیسرز وغیرہ سے کہو کہ باپ کی سیاست نے بیٹی کے تعلیمی کیریئر کو برباد کر دیا ہے۔ میرا اور ایک کام کرو۔ جس طرح مرینہ نے پوسٹرز لکھوا کر کالج کی دیواروں پر چسپاں کرائے تھے۔ اسی طرح تم ابھی پوسٹر لکھو۔"

"مجھے کیا لکھنا ہو گا؟"

"کاغذ قلم اٹھاؤ میں بتاتی ہوں۔"

اس نے تھوڑی دیر بعد کہا۔ "ہاں بولو میں لکھ رہا ہوں۔"

وہ فون پر بولنے لگی۔ "تعلیمی سفر کے ساتھیو! تمہاری ایک غلط فہمی سے میری پوری زندگی برباد ہو جائے گی۔

"علی نے میرے ڈیڈی کی سیاسی پارٹی کی اسٹوڈنٹس یونین کو اس کالج میں نقصان پہنچایا ہے۔ ڈیڈی نے اور ان کے دوسرے سیاسی لیڈروں نے میرے کاندھے پر بندوق رکھ کر علی کو نقصان پہنچایا ہے۔

"میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہتی ہوں کہ میں نے علی پر چوری کا الزام نہیں لگایا ہے۔ علی سے صرف اور صرف سیاسی انتقام لیا گیا ہے۔

"خدا کے لئے مجھے غلط مت سمجھو۔ میں تم سب کے سامنے اور ساری دنیا کے

سامنے علی کی حمایت اور اپنے ڈیڈی کی مخالفت میں بیان دے سکتی ہوں۔

"میرے سچ کو آزماؤ۔ مجھ سے نفرت نہ کرو۔ فقط تمہاری تعلیمی ہم سفر سبیکا۔"

سبیکا نے پوسٹر کا یہ مضمون لکھوانے کے بعد کہا۔ "تم ابھی بیس پچیس پوسٹرز لکھو اور صبح ہوتے ہی انہیں ہر جگہ کالج کی دیواروں پر لگا دو۔ صبح کالج کھلنے سے پہلے یہ کام ہو جانا چاہئے۔"

اس نے کہا۔ "تم نے یہ لکھوایا ہے کہ علی کی حمایت میں انکل کے خلاف بیان دو گی۔ کیا واقعی تم انکل کے خلاف بولو گی؟"

"میں سچ کا ساتھ دوں گی ورنہ ڈیڈی کا جھوٹ مجھے کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑے گا۔"

"سبیکا تم انکل کا غصہ جانتی ہو۔ وہ اپنے خلاف کسی کی بات برداشت نہیں کرتے۔ تمہاری سوتیلی ماں نے ان کی ایک ذرا سی مخالفت کی تھی۔ انکل نے انہیں گولی مار دی۔ سبیکا تمہیں اپنے باپ کے خلاف نہیں بولنا چاہئے۔"

"وہ اگر گولی مار سکتے ہیں تو میں گولی کھانے کا حوصلہ رکھتی ہوں۔ تمہیں ڈر لگ رہا ہے تو میرا ساتھ نہ دو۔"

"نہیں ڈرنے کی بات نہیں ہے۔ میں تو تمہیں سمجھا رہا تھا۔ ویسے ایک بات کا وعدہ کرو۔ انکل کو کبھی یہ نہیں بتاؤ گی کہ اس معاملے میں' میں تمہارا ساتھ دے رہا تھا۔ وہ تو مجھے الٹا لٹکا کر میری کھال کھینچ لیں گے۔"

"میں وعدہ کرتی ہوں کسی معاملے میں بھی تمہارا نام نہیں آئے گا۔ ڈیڈی کو یہ بھی معلوم نہیں ہوگا کہ میں نے تمہیں موٹر بائیک کے لئے رقم دی ہے۔ بہرحال کل صبح تک میرا کام ہو جانا چاہئے۔"

اس نے اپنا موبائل فون بند کر کے ایک طرف رکھ دیا۔ اسے اپنی صفائی پیش کرنے کے لئے ایک راستہ مل گیا تھا لیکن دل مطمئن نہیں ہو رہا تھا۔ یہ باؤلا اپنے محبوب کے سامنے جا کر اپنے اندر کی ساری محبتیں نچھاور کر کے اس کا دل صاف کرنا چاہتا تھا اور فی الحال ایسی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔

☆======☆======☆

دوائیں اپنا اثر دکھا رہی تھیں۔ علی تمام رات گہری نیند سوتا رہا۔ صبح اس کی آنکھ آہستہ آہستہ کھلی۔ اس وقت بھی ذہن میں نیند کا خمار تھا۔ اس نے ادھ کھلی آنکھوں سے اس کمرے کو دیکھا تو اسے یاد آیا کہ وہ اسپتال میں ہے پھر اسے محسوس ہوا کہ وہ تنہا نہیں ہے۔ اس کے پاس کوئی ہے۔ اس کے بہت قریب ہے بلکہ اس کے وجود سے چپکا ہوا ہے۔ اس نے بڑی آہستگی سے سر اٹھا کر دیکھا تو مرینہ اس سے لپٹی سو رہی تھی۔ اس کے بدن پر لباس تھا مگر بے ترتیب ہو رہا تھا۔

اس کی زلفیں بکھری ہوئی تھیں۔ وہ نیند کی حالت میں اتنی خوبصورت' اتنی معصوم اور اتنی پیاری لگ رہی تھی کہ اسے پیار سے دیکھتے رہنے کو جی چاہتا تھا۔ وہ مبہوت سا ہو کر اسے دیکھتا رہ گیا پھر اسے احساس ہوا کہ یہ غلط ہے۔ ایسا نہیں ہونا چاہئے۔ کوئی آ جائے گا انہیں ایسی حالت میں دیکھ لے گا تو کیا سوچے گا؟

اس نے مرینہ کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اسے ہولے سے ہلایا۔ وہ نیند میں مست ہو رہی تھی۔ کچھ اور شدت سے لپٹ گئی۔ اس نے پریشان ہو کر آواز دی۔ "مرینہ۔ اٹھو۔ تم یہاں کیوں سو رہی ہو؟"

وہ "اوں اوں" کہہ کر پھر غافل ہو گئی۔

وہ بولا۔ "پلیز اٹھو۔ دیکھو کوئی آ جائے گا۔ امی آ سکتی ہیں۔"

وہ نیند میں کسمسانے لگی۔ وہ اسے دھیرے دھیرے پکارنے لگا۔ اس نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں نیند بھری ہوئی تھی۔ پیار بھرا ہوا تھا۔ ایک جان دو قالب ہونے کا اقرار بھرا ہوا تھا۔ پچھلی رات کوئی پیار بھری واردات ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو لیکن قربت کہہ رہی تھی کہ کچھ تو ہوا ہی ہوگا۔ اچانک مرینہ نے چونک کر علی کو دیکھا پھر ایک دم سے ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ اپنے لباس کو جلدی جلدی درست کرنے لگی۔ اس سے نظریں چراتے اور شرماتے ہوئے بولی۔ "وہ.......... پتا نہیں میں کیسے سو گئی؟ تمہاری طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ میں تمہیں سنبھال رہی تھی۔ تم نے سہارے کے لئے مجھے جکڑ لیا تھا۔ اگر میں خود کو چھڑا لیتی تو تم بے سہارا ہو جاتے۔ میں تم سے لگی رہی۔ تمہارا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔"

وہ تعجب سے سن رہا تھا۔ کچھ پریشان سا ہو کر بولا۔ "مجھے کچھ یاد نہیں آ رہا ہے۔ کیا

میں ہوش میں نہیں تھا؟"

"پتہ نہیں نیند کی کیسی دوا دی گئی ہے۔ تم پر نیند کا غلبہ بھی تھا اور تم زخموں کی تکلیف سے بے چین بھی ہو رہے تھے۔ میرا سہارا ملنے کے بعد تمہیں کچھ آرام آنے لگا۔ ایسی حالت.........."

وہ اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔ "میں کیا بتاؤں ایسی حالت میں مجھے بھی آرام آ رہا تھا۔ پتہ ہی نہ چلا کہ میں تمہارے پیار کی چھاؤں میں کیسے سو گئی؟"

وہ سن رہا تھا اور اسے بڑی چاہت سے دیکھ رہا تھا۔ دل کہہ رہا تھا۔ میں نے اس لڑکی کی قدر نہیں کی۔ یہ کالج میں پہلے دن سے مجھے چاہتی آ رہی ہے۔ اس نے مجھے پہلے بھی سبیکا کے جھوٹ اور فریب سے آگاہ کیا تھا۔ میں یہ سمجھتا رہا کہ یہ حسد اور جلن سے ایسا کہہ رہی ہے۔ اس نے اپنے پیار کی سچائی ثابت کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ اس نے مجھے چوری کے الزام سے بری کرانے کے لئے پرنسپل پروفیسرز اور اسٹوڈنٹس کو میری حمایت کے لئے متحد کیا۔ پولیس والوں کے خلاف محاذ آرائی کی اور یہ محبت نہیں ہے تو اور کیا ہے کہ اپنے گھر والوں کو چھوڑ کر میرے ساتھ اسپتال میں رہتی ہے۔ حد تو یہ ہے کہ یہ میرے ساتھ رات گزار چکی ہے۔ میں اس کا جتنا بھی احسان مانوں اور بدلے میں کتنی بھی محبتیں دوں وہ کم ہوں گی۔

مرینہ نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا تھا۔ اس نے مرینہ کے اس ہاتھ کو بڑے پیار سے تھام لیا پھر کہا۔ "محبت یا تو پہلی نظر میں کسی سے ہو جاتی ہے یا پھر کسی سے آہستہ آہستہ متاثر ہونے کے بعد ہوتی ہے۔ سبیکا سے پہلی نظر میں محبت ہوئی تھی۔ یہ تلخ تجربہ ہو رہا ہے کہ پہلی نظر کی محبت سوچے سمجھے بغیر ہوتی ہے۔ بعد میں جھوٹ اور فریب ملتا ہے۔ تم نے رفتہ رفتہ مجھے متاثر کیا ہے۔ اپنے عمل سے اپنی محبت اور وفاداری ثابت کی ہے۔ اگر تم نہ ہوتیں تو سبیکا اور اس کے باپ کی سازشی اور انتقامی کارروائیوں سے مجھے نجات نہ ملتی۔"

وہ اس کی طرف جھک گئی۔ بڑے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔ "سبیکا کو بھول جاؤ۔ دکھ پہنچانے والی باتیں یاد نہ کرو۔ ایسی باتیں یاد کرنے سے اور زیادہ صدمہ ہوتا ہے۔"

"تم درست کہتی ہو۔ میں اس کے بارے میں نہیں سوچوں گا۔ وہ میری نظروں سے گر چکی ہے۔ میرے دل سے نکل چکی ہے۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ بند آنکھوں کے پیچھے وہ مسکرانے لگی۔ ابھی اس نے کہا تھا کہ اسے بھول جائے گا۔ دل سے نکال دینا آسان نہیں ہوتا۔ خوابوں اور خیالوں پر پہرا نہیں بٹھایا جا سکتا۔ وہ اس کے اندر چھپی ہوئی تھی۔ آنکھ بند کرتے ہی کسی روک ٹوک کے بغیر چلی آئی تھی۔ وہ بڑے دکھ سے بولا۔ "یہ تم نے کیا کیا؟ کیوں میرے اعتماد کو دھوکا دیا؟ میں تم سے کیا شکایت کروں؟ ظالم سے شکایت کرو یا دیوار سے سر پھوڑو تو اپنا ہی نقصان ہوتا ہے۔ بس چلی جاؤ۔ چلی جاؤ میرے اندر سے۔"

اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو سانسوں کے قریب مرینہ مسکرا رہی تھی۔ سبیکا گم ہو گئی تھی۔ اسے گم کر دینے کی یہی ایک صورت رہ گئی تھی کہ وہ مرینہ کی صورت دیکھتا رہے۔

☆======☆======☆

کالج کے باہر جگہ جگہ دیواروں پر اور اندر کوریڈورز اور کلاس رومز میں وہ پوسٹرز لگے ہوئے تھے۔ تمام طلبہ اور طالبات انہیں پڑھ رہے تھے۔ سبیکا نے ان پوسٹرز کے ذریعے اپیل کی تھی کہ اسے غلط نہ سمجھا جائے۔ علی کے خلاف اس کے باپ نے سازش کی تھی۔ وہ اس سازش میں شریک تھی اور نہ ہی اس نے علی پر چوری کا الزام لگایا تھا۔

وہ ان پوسٹرز کے ذریعے اپنی طرف سے صفائی پیش کر رہی تھی۔ طلبہ و طالبات اس تحریر کو پڑھ کر مختلف آراء قائم کر رہے تھے۔ کوئی اس کے خلاف بول رہا تھا کہ سبیکا جھوٹ بول رہی ہے۔ وہ بیٹی اپنے باپ کی سازشوں میں شریک تھی۔ اب جھوٹ کھل گیا ہے تو وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہی ہے۔ وہ کالج میں آنے اور تمام اسٹوڈنٹس سے نظریں ملانے سے پہلے اپنی طرف سے صفائی پیش کر رہی ہے۔

کچھ اسٹوڈنٹس کہہ رہے تھے کہ سبیکا ایک ذہین اور سنجیدہ لڑکی ہے۔ پچھلے تین برسوں سے کالج میں اس کا ریکارڈ بہت اچھا رہا ہے۔ اگرچہ وہ ہر ایک سے دوستی نہیں رکھتی، ریزرو رہتی ہے لیکن مغرور نہیں ہے۔ کوئی اسے مخاطب کرے تو بڑے خلوص اور سنجیدگی سے باتیں کرتی ہے۔ وہ علی سے خواہ مخواہ دشمنی نہیں کرے گی۔ سوچے سمجھے بغیر سبیکا کو الزام نہیں دینا چاہئے۔

سبیکا کا احسان مند شبیر احمد اس کالج کے دفتر میں ایک کلرک تھا۔ اس نے ہی وہ تمام پوسٹرز وہاں لگائے تھے پھر اس نے پرنسپل اور تمام پروفیسرز سے فرداً فرداً ملاقات کر کے انہیں بتایا تھا کہ کس طرح وہ خود اپنے باپ کی سازشوں کا شکار ہوئی ہے۔ وہ خود مظلوم ہے۔ اگر تمام اسٹوڈنٹس کی غلط فہمیاں دور نہ کی گئیں تو وہ کالج اٹینڈ نہیں کر سکے گی۔ یہاں آ کر کسی سے نظریں نہیں ملا سکے گی۔

پرنسپل اور پروفیسرز نے تمام اسٹوڈنٹس کو کانفرنس ہال میں طلب کر کے انہیں

سمجھایا کہ سبیکا ایک ذہین اسٹوڈنٹ ہے۔ آج تک اساتذہ اور کسی بھی اسٹوڈنٹ کو اس سے کسی بھی قسم کی شکایت نہیں ہوئی۔ اسے علی سے بھی کوئی ذاتی دشمنی نہیں تھی۔ وہ پوسٹرز کے ذریعے اعلانیہ یہ کہہ رہی ہے کہ وہ علی کی حمایت میں اور اپنے باپ کی مخالفت میں بیان دے گی اور ہمیں یقین ہے وہ ایسا کرے گی۔ لہٰذا تمام اسٹوڈنٹس کو اس کی عزت کرنی چاہئے۔ وہ کالج آئے تو اسے ویلکم کہنا چاہئے۔ سبیکا کی حمایت سے علی کو یہ فائدہ پہنچے گا کہ اس کا باپ اور دوسرے سیاسی پارٹی والے آئندہ اس کے خلاف کوئی سازش نہیں کریں گے۔ لہٰذا علی کی بہتری کے لئے سبیکا کو اپنا بنا کر رکھنا چاہئے۔

تمام اسٹوڈنٹس علی کی بہتری کے لئے سبیکا کو اپنا بنائے رکھنے کے لئے راضی تھے۔ سبیکا نے اپنی حکمت عملی سے کالج کے نفرت بھرے ماحول کو محبت میں تبدیل کر دیا تھا۔ شبیر احمد نے فون کے ذریعے اسے بتایا۔ "سبیکا! میں نے پرنسپل اور تمام پروفیسرز سے تمہاری اتنی تعریفیں کی ہیں اور تمہاری طرف سے اس طرح ان کے دل صاف کئے ہیں کہ انہوں نے تمام اسٹوڈنٹس کو تمہاری عزت کرنے اور تمہاری حمایت کرنے پر مائل کیا ہے۔ تمام طلبہ و طالبات اس بات سے خوش ہیں کہ وقت آنے پر تم علی کی حمایت میں اور اپنے ڈیڈی کی مخالفت میں بیان دو گی۔"

اس نے پوچھا۔ "کوئی تو میری مخالفت کر رہا ہو گا؟ میری سب سے بڑی مخالف تو مرینہ ہے۔"

"آج مرینہ کالج نہیں آئی ہے۔ یوں سمجھو کہ تم نے یہاں سب کے دل جیت لئے ہیں۔ تم کل کالج آؤ گی تو سب ہی تمہیں خوش آمدید کہیں گے۔"

وہ ریسیور رکھ کر مایوسی سے سوچنے لگی۔ "کالج کیسے جاؤں گی؟ ڈیڈی سختی سے منع کر چکے ہیں۔ ان کا حکم پتھر کی لکیر ہوتا ہے۔"

وہ اٹھ کر ٹہلنے لگی۔ صبح سے یہ سوچ کر پریشان ہو رہی تھی کہ کس طرح اسپتال جائے اور پھر سے علی کے دل میں جگہ بنائے۔ گھر کے اندر اور باہر تمام ملازم اور سکیورٹی گارڈز سختی سے اس کے ڈیڈی کے حکم کی تعمیل کر رہے تھے۔ وہ گھر سے باہر قدم نکالتی تو وہ اسے کہیں جانے نہ دیتے اگر وہ جبراً جانا چاہتی تو اس کے ڈیڈی کو اطلاع دے دی جاتی۔

وہ اپنے باپ کی ظالمانہ فطرت کو خوب سمجھتی تھی۔ وہ علی کے اور اس کے خلاف

بہت کچھ کر سکتا تھا۔ علی کو قتل کرا سکتا تھا' اسے یہاں سے دور اپنی گوٹھ والی حویلی میں لے جا کر قید کر سکتا تھا۔ اس نے تو مخالفت کی ابتدا میں ہی علی پر اس قدر تشدد کرایا تھا کہ وہ مرتے مرتے بچا تھا۔

وہ سوچ رہی تھی اور اسے یہ فکر ستا رہی تھی کہ اس کی محبت علی کے لئے مصیبت بنتی رہے گی۔ دیکھا جائے تو وہ محبت سے آئندہ بھی اپنے محبوب کو مصائب میں مبتلا کرتی رہے گی۔ عقل کہتی تھی کہ وہ اس کی سلامتی کی خاطر اس سے دور ہی دور رہے۔ محبت میں یہ ضروری نہیں ہے کہ قربت حاصل ہو۔ بہتر یہی تھا کہ تمام ارمانوں کو دل میں دفن کردے۔ دور سے بھی محبوب کی سلامتی کے لئے دعائیں مانگی جا سکتی ہیں۔

وہ علی کے لئے اپنے دل کا خون کر سکتی تھی۔ اس سے دور رہ سکتی تھی لیکن دور ہونے سے پہلے اپنی صفائی پیش کر دینا چاہتی تھی۔ ایک بار اس سے مل کر اس کی غلط فہمی دور کر دینا چاہتی تھی۔ ایک بار اس کا دل صاف ہو جاتا اور اس کی محبت پھر سے اس کے اندر زندہ ہو جاتی تو اسے یہ خوشی حاصل ہوتی کہ علی نے اسے اپنی نظروں سے نہیں گرایا ہے۔ وہ ایک بار پھر اسے جیت لینا چاہتی تھی۔ اس کے بعد اسے ہار جانے کا حوصلہ بھی پیدا ہو جاتا۔

فی الحال اس کے روبرو جانے کی کوئی صورت نہیں رہی تھی۔ وہ کسی بھی طرح سے اس سے نہیں مل سکتی تھی لیکن بات تو کر سکتی تھی۔ اس نے موبائل کے ذریعے اسپتال کے نمبر پنچ کئے۔ رابطہ ہونے پر اس سے پوچھا گیا کہ وہ کس سے بات کرنا چاہتی ہے۔ اس نے علی کا نام اور کمرہ نمبر بتایا پھر انتظار کیا۔ تھوڑی دیر بعد علی کی آواز سنائی دی۔ "ہیلو...........کون؟"

وہ دنیا کی ایک ہی آواز تھی جو دل دھڑکا دیتی تھی۔ ایک دم سے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ ایسا لگا کان سے ریسیور نہیں وہ لگا ہوا بول رہا ہے۔ "ہیلو میری جان! تم کس عالم نامعلوم میں کھو گئی ہو۔ میں اپنی ہر سانس پر تمہیں پکارتا رہا۔ تم میری صداؤں سے دور کیوں چلی گئی تھیں؟"

وہ دوسری بار اس کی آواز سن کر چونک گئی۔ "ہیلو! خاموش کیوں ہو؟ کون ہو بھئی؟"

وہ جھجکتے ہوئے بولی۔ "میں...........میں بول رہی ہوں۔"

علی اس کی آواز لاکھوں میں پہچان سکتا تھا۔ ایک دم سے چپ ہو گیا۔ اس نے سوچ رکھا تھا' کبھی اس کی صورت نہیں دیکھے گا۔ کبھی وہ فون پر بولے گی تو اس کی آواز زہر لگے گی۔ وہ اس کی آواز سننا بھی گوارا نہیں کرے گا۔ اس وقت اسے چاہئے تھا کہ وہ نفرت سے ریسیور رکھ دیتا لیکن وہ تھم سا گیا تھا۔ جہاں تھا وہاں جم سا گیا تھا۔ قصہ حاتم طائی کے ساتویں سوال میں یہ تاکید کی گئی تھی کہ کوئی صدا سنائی دے تو پیچھے پلٹ کر نہ دیکھنا ورنہ پتھر کے ہو جاؤ گے۔

وہ صدائے محبوب سنتے ہی پتھر کا ہو گیا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "پلیز ریسیور نہ رکھنا۔ اگر تم نے کبھی ایک لمحے کے لئے بھی مجھ سے سچی محبت کی تھی تو تمہیں اس لمحے کا واسطہ ہے۔ میری باتیں سن لو۔ میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہتی ہوں..........."

وہ آگے سن نہ سکا۔ اس کا دھیان بھٹک گیا۔ مرینہ باتھ روم سے باہر آ کر پوچھ رہی تھی۔ "کس کا فون ہے۔ میں نے گھنٹی کی آواز سنی تھی۔ اتنی دیر سے کون بول رہا ہے؟"

وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "وہ...........وہ بول رہی ہے۔"

مرینہ نے چونک کر فون کی طرف دیکھا۔ اگرچہ علی نے اس کا نام نہیں لیا تھا پھر بھی اس کے دماغ میں پتھر سا آ کر لگا تھا۔ وہ تیزی سے اس کے پاس آئی پھر اس کے ہاتھ سے ریسیور جھپٹ کر کان سے لگا کر بولی۔ "تم...........؟ تم اب کیا چاہتی ہو؟ کیا علی کے زندہ بچنے کا افسوس ہو رہا ہے۔ اب کوئی نیا فریب دینے کے لئے ٹیلی فون کا سہارا لے رہی ہو؟ علی سے نظریں ملانے کے قابل نہیں رہیں۔ اس لئے چھپ کر لچھے دار باتیں بنا کر پھر محبت کا فریب دینا چاہتی ہو۔"

سبیکا نے عاجزی سے کہا۔ "پلیز ایسی باتیں کر کے علی کے دل میں میرے لئے زہر نہ گھولو۔ میں وعدہ کرتی ہوں تمہاری محبت کے راستے میں دیوار نہیں بنوں گی۔ اس کے دل سے غلط فہمی دور کر کے تم دونوں کے راستے سے ہٹ جاؤں گی۔"

"اگر تم سمجھتی ہو کہ جھوٹ بول کر اور باتیں بنا کر علی کو دوبارہ گمراہ کر سکتی ہو تو لو' اس سے باتیں کرو۔"

اس نے علی کی طرف ریسیور بڑھاتے ہوئے کہا۔ "شیطان کا کام بہکانا ہے۔ انسان

کی دانائی یہ ہے کہ ایک ہی ٹھوکر سے سنبھل جاتا ہے۔ اگر آئندہ ٹھوکروں سے بچ سکتے ہو تو لو' اس سے خوب باتیں کرو۔"

علی نے ریسیور کو ہاتھ نہیں لگایا۔ اسے مرینہ کے ہاتھ میں دیکھتا رہا۔ سوچتا رہا۔ "ابھی وہ عاجزی سے بول رہی تھی۔ مجھے چور بنانے اور حوالات سے اسپتال پہنچانے کے بعد عاجزی سے کیوں بولنے آئی ہے؟ کیا لچھے دار باتیں بنائے گی؟ پھر فریب دے گی؟ کیا میں اس کی باتوں میں آ جاؤں گا؟ کیا پھر دھوکا کھانا چاہوں گا؟"

وہ ریسیور کی طرف سے منہ پھیر کر لیٹ گیا۔ مرینہ نے اطمینان کی سانس لی پھر ریسیور کو کان سے لگا کر بولی۔ "اگر تم نے اپنی غلطی کی معافی مانگنے کے لئے فون کیا ہے تو علی کا دل بہت بڑا ہے۔ اس نے تمہیں معاف کیا۔ تم بھی اسے معاف کردو۔ آئندہ فون نہ کرو۔"

اس نے ریسیور رکھا اور پھر اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔ "تم بیمار ہو۔ اس کی نئی چالبازی کو نہیں سمجھو گے۔ میں سمجھ رہی ہوں۔ وہ تم پر جھوٹا الزام لگا کر کالج میں بدنام ہو گئی ہے۔ وہاں کسی سے نظریں ملانے کے قابل نہیں رہی ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ تم اسے معاف کر دو۔ تمام اسٹوڈنٹس کے دل اس کی طرف سے صاف کر دو۔ اس کے بعد ہی وہ کالج اٹینڈ کر سکے گی۔ ابھی اس کا سب سے بڑا مسئلہ یہی ہے کہ کالج میں پھر سے نیک نامی کس طرح حاصل کرے۔ ذرا غور کرو۔ اس کی یہ مشکل تم ہی آسان کر سکتے ہو۔"

وہ سن رہا تھا۔ اس کی باتیں درست لگ رہی تھیں۔ یہ بات موٹی عقل سے بھی سمجھی جا سکتی تھی کہ سبیکا کالج میں سب ہی کی نظروں سے گر چکی ہے۔ اسے پہلے جیسی عزت اور نیک نامی اسی وقت ملے گی' جب علی اسے معاف کرے گا۔ اس کی حمایت کرے گا۔ دوسرے لفظوں میں پھر پہلے کی طرح محبت کرے گا۔

وہ دل ہی دل میں تسلیم کر رہا تھا کہ مرینہ اگرچہ سبیکا کے خلاف سخت باتیں کرتی ہے لیکن وہ باتیں سچی اور کھری ہوتی ہیں۔ فون کی گھنٹی پھر سنائی دی۔ اس نے سر گھما کر یوں دیکھا جیسے سبیکا پکار رہی ہو۔ مرینہ نے ناگواری سے ریسیور کو کان سے لگا کر پوچھا۔ "کیوں پیچھے پڑ گئی ہو؟ اب کیا کہنا چاہتی ہو؟"

دوسری طرف سے یونین لیڈر جمشید کی آواز سنائی دی۔ "مرینہ! میں جمشید بول رہا ہوں۔ یہ۔ تم کیسے باتیں سنا رہی ہو؟"

وہ بولی۔ "سوری جمشید! وہ سبیکا پھر علی کے پیچھے پڑ گئی ہے۔ ابھی فون پر علی سے باتیں کرنا چاہتی تھی پھر کوئی چال چلنا چاہتی ہے۔"

جمشید نے کہا۔ "وہ تو چال چل چکی ہے۔ اس نے علی کے معاملے میں خود کو بے قصور کہا ہے۔ پرنسپل اور تمام پروفیسرز نے اسٹوڈنٹس کو سمجھایا ہے کہ وہ علی کی حمایت میں اپنے باپ کے خلاف بولے گی۔ لہٰذا اسے قصوروار نہ سمجھا جائے۔ علی کے خلاف اس کے باپ نے سازشیں کی تھیں۔ سبیکا سازشوں میں شریک نہیں تھی۔"

جمشید نے بتایا کہ سبیکا نے کس طرح کالج کی دیواروں پر پوسٹرز لگوائے تھے اور شبیر احمد کے ذریعے پرنسپل اور پروفیسرز وغیرہ کو اپنی حمایت کرنے پر آمادہ کر لیا تھا۔ مرینہ سن رہی تھی۔ یہ سوچ کر دل ڈوب رہا تھا کہ رقیبہ بڑی تیزی سے پورے کالج کی حمایت حاصل کر رہی ہے۔ بری طرح ہاری ہوئی بازی کو آسانی سے جیت رہی ہے۔

اس نے ریسیور رکھ کر علی سے کہا۔ "میں نے ابھی سبیکا کے بارے میں کہا تھا کہ وہ کالج اٹینڈ کرنے سے پہلے اپنے دامن سے بدنامی کا داغ دھوئے گی۔ وہ ایسا کر چکی ہے۔"

اس نے جمشید سے جو کچھ سنا تھا' وہ علی کو بتایا پھر کہا۔ "پرنسپل وغیرہ تم سے بھی کہیں گے کہ تمہارے معاملے میں سبیکا قصوروار نہیں ہے۔ کیا تم یہ تسلیم کر لو گے؟"

"کیسے تسلیم کروں گا؟ سبیکا نے مجھے اپنے گھر بلایا۔ وہاں ڈرائنگ روم میں پہلے سے وہ بریف کیس رکھا ہوا تھا۔ کیا وہ نہیں جانتی ہو گی کہ مجھے پھنسانے کے لئے اس رقم سے بھرے ہوئے بریف کیس کو وہاں رکھا گیا تھا؟ اگر نہیں جانتی تھی تو اسے یہ خبر ضرور ملی ہو گی کہ میں چوری کے جھوٹے الزام میں سزا پا رہا ہوں۔ وہ میری بے گناہی ثابت کرنے کے لئے تمہاری طرح تھانے میں آ سکتی تھی۔ تمام اسٹوڈنٹس نے میری حمایت میں آوازیں بلند کیں۔ وہ بھی میری حمایت میں آواز اٹھا سکتی تھی لیکن اس نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ کالج کی دیواروں پر پوسٹرز لگوا کر اور پرنسپل وغیرہ کی حمایت حاصل کر کے وہ میری نفرت محبت میں نہیں بدل سکے گی۔"

وہ اطمینان کی سانس لے کر بولی۔ "تمہیں اسی طرح دانائی سے سبیکا کے جھوٹ اور

فریب کو سمجھتے رہنا چاہئے۔ مجھے تو بڑا ڈر لگ رہا ہے۔ پتہ نہیں وہ اور کیسی کیسی چالیں چلے گی اور تمہیں مجھ سے چھین لینا چاہے گی۔"

علی نے اس کے ہاتھ کو تھام کر کہا۔ "تم اپنی خدمت اور وفاداری سے میرے دل و دماغ پر چھا گئی ہو۔ تمہاری ایک ایک بات سے اور ایک ایک عمل سے میرے لئے پیار ہی پیار جھلکتا ہے۔ میرے دل میں تمہارے لئے جو جگہ ہے' وہ جگہ سبیکا کبھی نہیں لے سکے گی۔"

وہ خوش ہو کر کچھ کہنا چاہتی تھی پھر دروازے پر دستک سن کر چونک گئی۔ علی نے کہا۔ "شاید امی آئی ہیں۔"

مرینہ کا اندیشہ کہہ رہا تھا' وہ دشمن آئی ہے۔ وہ آسانی سے پیچھا نہیں چھوڑے گی۔ اس نے بیڈ سے اتر کر دروازے کے پاس آ کر اسے کھولا۔ اندیشہ غلط تھا۔ علی کی والدہ ہاجرہ بی آئی تھیں۔ اس نے مسکرا کر سلام کیا۔ وہ جواب میں دعائیں دیتی ہوئی اندر آئیں۔ بیٹے کے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر اس کی پیشانی کو چوم کر کہا۔ "یا اللہ تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ کل تم بے ہوشی کی نیند سو رہے تھے۔ آج تو اٹھ کر بیٹھے ہوئے ہو۔ بیماری کے باوجود چہرے پر تازگی ہے۔ یہ سب مرینہ کی خدمت گزاری کا نتیجہ ہے۔ بیٹی! تمہارے لئے میرے دل سے دعائیں نکل رہی ہیں۔"

وہ پلٹ کر مرینہ کی بلائیں لیتے ہوئے اسے دعائیں دینے لگیں پھر کہا۔ "میرے بیٹے کو تندرست بنا رہی ہو اور خود مرجھائی سی لگ رہی ہو۔ غسل کیا ہے نہ لباس تبدیل کیا ہے۔ کیا تم صبح گھر نہیں گئی تھیں؟"

"نہیں امی! آپ کے بیٹے کو یہاں تنہا چھوڑ کر نہیں جا سکتی تھی۔ وہ سبیکا پھر ان کے پیچھے پڑ گئی ہے۔ کل رات آئی تھی۔ میں نے بھگا دیا۔ ابھی فون پر کہنا چاہتی تھی کہ وہ بے قصور ہے۔"

ہاجرہ بی اسے کوسنے اور بددعائیں دینے لگیں۔ مرینہ نے کہا۔ "امی! میں دو چار گھنٹے کے لئے گھر جاؤں گی پھر یہاں آ جاؤں گی۔ آپ وعدہ کریں' سبیکا کو کمرے میں نہیں آنے دیں گی۔"

"اے بیٹی! میں تو اس کا سایہ بھی اپنے بیٹے پر نہیں پڑنے دوں گی۔ تم اطمینان سے

جاؤ۔"

اس نے ریسیور اٹھا کر اپنی کوٹھی کے نمبر پنچ کئے پھر رابطہ ہونے پر ڈرائیور کو حکم دیا کہ اس کے لئے گاڑی لے آئے۔

سبیکا کی بے چینی بڑھ گئی تھی۔ علی سے اس کا رابطہ ہوا تھا لیکن اس سے بات نہیں ہو پائی تھی۔ مرینہ نے کالی بلی کی طرح اس کا راستہ کاٹ دیا تھا۔ یہ سمجھ میں آ گیا تھا کہ وہ اسپتال میں علی سے ملنے دے گی نہ ہی فون پر باتیں کرنے دے گی۔ اب تو کوئی زور زبردستی والا راستہ اختیار کرنا ہوگا۔

وہ اپنے کمرے سے نکل کر ڈرائنگ روم میں آئی۔ اس کا باپ عبدالقادر سومرو اسی وقت کہیں باہر سے آیا تھا۔ اپنے بیڈ روم کی طرف جا رہا تھا۔ اس نے کہا۔ "ڈیڈ! میں آپ سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔"

اس نے رک کر بیٹی کو دیکھا پھر کہا۔ "ہاں بولو۔"

"میں آپ سے التجا کرتی ہوں' مجھ پر پابندیاں عائد نہ کریں۔ مجھے باہر جانے کی اجازت دیں۔"

"باہر کہاں جاؤ گی؟ کیا اسپتال؟ اس چھوٹی ذات کے قلاش لڑکے سے ملنے۔"

"آپ غصے سے' غرور سے جو چاہیں' اسے کہہ دیں۔ میری نظروں میں اس کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ میں اپنا مستقبل اس کے نام کر چکی ہوں۔"

وہ غصے سے دھاڑتا ہوا بولا۔ "بکواس مت کرو۔ میں تمہارا منہ توڑ دوں گا۔ اس کمینے سے خود کو منسوب کرو گی تو میں تمہیں گولی مار دوں گا۔"

"آپ مرنے مارنے سے نہیں ڈرتے۔ میں بھی نہیں ڈرتی۔ آخر آپ کی بیٹی ہوں۔ میں تعلیم یافتہ ہوں۔ اپنے جائز حقوق مانگ رہی ہوں۔ پلیز مجھے میری مرضی سے زندگی گزارنے دیں۔"

"ہمارے خاندان میں کبھی کسی لڑکی نے حقوق نہیں مانگے۔ تم مانگو گی تو یہاں سے گوٹھ والی حویلی میں تمہیں پہنچا دوں گا۔ وہاں کی دیواروں اور دروازوں کو دیکھ چکی ہو۔ وہ عورتوں کا جیل خانہ ہے۔ وہاں سے کبھی باہر نہیں آ سکو گی؟"

وہ دھمکی دے کر اپنے بیڈ روم میں چلا گیا۔ سبیکا کھڑی سوچتی رہی۔ وہ بظاہر بے بس

دکھائی دے رہی تھی لیکن باپ کی طرح بہت ضدی تھی۔ اپنی بات منوا کر رہتی تھی۔ فی الحال وہ منوانا چاہتی تھی کہ اسے باہر جانے سے نہ روکا جائے۔ یہ ایک چھوٹا سا مطالبہ تھا کہ بے جا پابندی عائد نہ کی جائے۔

ایسی پابندی کے باعث وہ علی تک پہنچ نہیں پا رہی تھی۔ مرینہ بھی اس کے لئے چیلنج بن گئی تھی۔ وہ اسے بھی منہ توڑ جواب دینا چاہتی تھی۔ اسے راستے سے ہٹانے کے بعد ہی وہ علی سے ملاقات کر سکتی تھی۔

اس نے بیڈ روم میں آ کر موبائل فون کے ذریعے اسپتال کے ایکس چینج سے رابطہ کیا۔ انہیں علی کا نام اور نمبر بتایا۔ ایک منٹ کے اندر ہی فون پر علی کی آواز سنائی دی۔ وہ خوش ہو کر بولی۔ ”میں.......... میں سبیکا بول رہی ہوں۔ پلیز مجھ سے باتیں کرو۔ مجھ سے نفرت نہ کرو۔ پرنسپل اور پروفیسرز وغیرہ سے پوچھ لو۔ وہ تمہیں میری بے گناہی کا یقین دلائیں گے۔ میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہتی ہوں۔ ڈیڈی نے صرف تمہیں ہی نہیں مجھے بھی دھوکا دیا تھا۔ میں انسان ہوں علی! ڈیڈی پر اندھا اعتماد کر کے دھوکا کھا گئی۔ خدا کے لئے مجھے غلط نہ سمجھو۔ ایک بار اپنے روبرو آ کر کلام پاک اٹھا کر قبلہ رو ہو کر قسم کھانے کا موقع دو۔ ڈیڈی نے سخت پہرا لگایا ہے۔ مجھے کوٹھی سے باہر جانے کی اجازت نہیں ہے پھر بھی بڑی سے بڑی رکاوٹیں توڑ کر تمہارے پاس آ سکتی ہوں۔ مرینہ کو سمجھاؤ کہ وہ خواہ مخواہ میری مخالفت نہ کرے۔ مجھے تمہارے پاس آنے سے نہ روکے۔“

وہ بڑی تیزی سے بے تکان بولتی جا رہی تھی۔ یہ اندیشہ تھا کہ اپنی طرف سے صفائی پیش کرنے میں دیر کرے گی تو مرینہ لائن کاٹ دے گی۔ علی سے رابطہ ختم ہو گا تو پھر نہ جانے کب اس سے بولنے کا موقع ملے گا۔

وہ ریسیور کان سے لگائے اس کی باتیں سن رہا تھا۔ پتہ نہیں کیوں اس کا نام سن کر‘ اس کی آواز سن کر دل کی دھڑکنیں پاگل ہو جاتی تھیں۔ اس نے بڑی دیوانگی سے اسے ٹوٹ کر چاہا تھا۔ یہ چاہت آسانی سے ختم نہیں ہو سکتی تھی۔ دیوانگی کہیں لاشعور میں چھپی ہوئی تھی۔ وہ فون پر کچھ بول نہیں پا رہا تھا۔ ادھر زخم تازہ تھے۔ یہ تلخ حقیقت بھلائی نہیں جا سکتی تھی کہ سبیکا نے محبت سے اپنے گھر بلایا تھا پھر چوری کا الزام لگا کر تھانے اور اسپتال پہنچایا تھا۔

اس کی امی نے کہا۔ ”بیٹے! اتنی دیر سے ریسیور لئے بیٹھے ہو۔ کچھ بولتے کیوں نہیں؟ کس کی باتیں سن رہے ہو؟“

سبیکا نے پوچھا۔ ”یہ کس کی آواز ہے؟ کیا تمہاری امی ہیں؟“

اس نے مختصر سا جواب دیا۔ ”ہاں۔“

”کیا مرینہ نہیں ہے؟“

اس نے پھر مختصر سا جواب دیا۔ ”نہیں۔“

”خدا کا شکر ہے۔ میں دل کھول کر تم سے باتیں کر سکتی ہوں۔“

”باتیں ختم کرو۔ اب بولنے اور سننے کے لئے کچھ نہیں رہا۔“

”ایسی باتیں نہ کرو۔ میرا دل تو نہ توڑو۔ مجھ سے جیسی بھی قسم لے لو۔ میرے ڈیڈی نے تمہارے ساتھ جو کیا تھا‘ اس میں‘ میں شریک نہیں تھی۔ پلیز مجھے بتاؤ کہ میں تمہیں کیسے یقین دلاؤں۔“

”مجھے یقین نہ دلاؤ۔ تمہارا باپ چاہتا تھا‘ جو زمینیں میری امی کے نام ہیں‘ وہ میں تمہارے نام کر دوں۔ تم نے بھی مجھے یہی مشورہ دیا۔ میں نے انکار کیا تو مجھے اس کی یہ سزا مل رہی ہے۔ تمہارا ایک ایک جھوٹ ایک ایک فریب مجھے یاد آ رہا ہے۔ میں تم سے انتقام نہیں لوں گا۔ میں نے تمہیں معاف کیا۔ میرے خدا نے تمہیں معاف کیا۔ آئندہ فون نہ کرنا۔“

اس نے ریسیور رکھ دیا۔ ہاجرہ بی نے اسے گھور کر دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا یہ وہی دشمن لڑکی تھی؟“

وہ پریشان ہو کر بولا۔ ”پتہ نہیں امی! وہ دشمن ہے یا نہیں؟ وہ اپنی بے گناہی کے سلسلے میں اللہ رسول ﷺ کی قسمیں کھا رہی ہے۔ میری حمایت میں اپنے باپ کے خلاف بول رہی ہے۔“

”اس کی باتوں میں ہرگز نہ آنا۔ ایسی لڑکیاں اللہ رسول ﷺ کی جھوٹی قسمیں کھاتی ہیں۔ وہ دکھاوے کے لئے اپنے باپ کی مخالفت کر رہی ہے۔ جس نے تمہیں چور بنایا۔ تھانے میں پہنچا کر لہولہان کرا دیا۔ کیا تم اسے بے قصور مان لو گے؟“

”میں نے عبدالقادر سومرو کی سیاسی اسٹوڈنٹس یونین کو کالج سے ختم کر دیا۔ اس

نے انتقاماً میرے ساتھ یہ سلوک کیا ہے۔ اس کی بیٹی نے مجھ سے انتقام نہیں لیا ہے۔ وہ کیوں انتقام لے گی؟ کیوں خواہ مخواہ دشمنی کرے گی؟ بے وجہ دشمنی نہیں کی جاتی۔"

وہ ناگواری سے بولیں۔ "تم اس مکار لڑکی کی حمایت میں بول رہے ہو جس کے باپ نے تمہیں مار ڈالنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ تم اس کے لئے اپنے دل میں نرم گوشہ رکھتے ہو۔"

"یہ بات نہیں ہے امی!"

"یہی بات ہے بیٹے! اس نے تم پر جادو کر دیا ہے۔ اسی لئے اس کا نام اپنی کاپیوں اور کتابوں میں لکھتے رہتے ہو۔"

"پلیز امی! آپ ایسی باتیں مرینہ کے سامنے نہیں کریں گی۔ اسے دکھ پہنچے گا۔"

"مجھے بھی دکھ پہنچ رہا ہے۔ مرینہ تمہیں دل و جان سے چاہتی ہے۔ وہ نہ ہوتی تو وہ لوگ تمہیں حوالات میں ہی مار ڈالتے۔ جس لڑکی نے تمہیں نئی زندگی دی ہے۔ تم اسے نظرانداز کر رہے ہو۔ میں پوچھتی ہوں مرینہ میں کیا کمی ہے؟ کیا وہ خوبصورت نہیں ہے؟ اتنی امیرزادی ہو کر وہ کل سے تمہاری خدمت کر رہی ہے لیکن تم اس کی قدر نہیں کر رہے ہو۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ کیا تمہاری عقل سوچنے سمجھنے کے قابل نہیں رہی ہے؟"

"امی! ایسی بات نہیں ہے۔ مرینہ بہت اچھی لڑکی ہے۔ اس نے اپنے عمل سے مجھے بہت متاثر کیا ہے۔ میں ہمیشہ اس کی قدر کرتا رہوں گا۔"

"دور ہی دور سے قدر نہیں کی جاتی۔ میں اسے بہو بنا کر گھر لاؤں گی۔"

علی نے ماں کو چونک کر دیکھا۔ مرینہ کی ادائیں اور وفائیں بھی یہی کہتی تھیں کہ وہ اس کی شریکِ حیات بننا چاہتی ہے۔ کوئی رشتہ نہ ہونے کے باوجود وہ بند کمرے میں ایک رات گزار چکی تھی۔ اس کے بعد کہنے اور سمجھنے کے لئے کچھ نہ رہا تھا۔

اب تو علی کو سمجھنا تھا۔ عمل اور جذبات کے درمیان جنگ شروع ہو چکی تھی۔ مرینہ کا عمل اسے اپنی طرف کھینچ رہا تھا اور جذبات اسے سبیکا کی طرف لے جا رہے تھے۔ اگرچہ اس نے فون پر سبیکا سے بے اعتنائی اور بے نیازی ظاہر کی تھی لیکن اس کا ظاہر کچھ تھا اور باطن کچھ تھا۔ وہ اپنے اندر چھپ رہا تھا اور چھپ چھپ کر سبیکا کے سلسلے میں الجھ رہا تھا۔ شعوری طور پر اس سے منکر ہو رہا تھا اور لاشعوری طور پر اس کی طرف کھنچا جا رہا

تھا۔

☆======☆======☆

سبیکا دل برداشتہ تھی۔ علی نے اس کی پذیرائی نہیں کی تھی۔ اس نے سوچا تھا' علی کی محبت اور حمایت حاصل ہو گی تو وہ اسے اپنا بنانے کے لئے تمام مخالفین سے لڑتی رہے گی لیکن فون پر اس نے بڑی بے نیازی دکھائی تھی۔ زیادہ باتیں نہیں کی تھیں۔ رابطہ ختم کر دیا تھا۔

یہ دل توڑنے کی بات تھی لیکن وہ حوصلہ ہارنے والی نہیں تھی۔ اسے خود پر اعتماد تھا کہ وہ اس کی غلط فہمی دور کر دے گی اور ایسا کرنے کے لئے اس کے روبرو جا کر اس سے گفتگو کرنا ضروری تھا۔

اس سے ملاقات کرنے کے لئے کوٹھی سے باہر جانا تھا۔ باپ کی مرضی کے خلاف قدم اٹھانا تھا۔ ایسا کرنے سے باپ اس پر ظلم کر سکتا تھا۔ اسے زنجیریں پہنا سکتا تھا۔ بیٹی کی بغاوت کو غیرت کا مسئلہ بنا کر اسے گولی مار سکتا تھا۔

اور سبیکا کا سب سے اہم مسئلہ یہ تھا کہ وہ علی کی نظروں سے گر کر زندہ نہیں رہنا چاہتی تھی۔ وہ اس کے دل سے غلط فہمیاں اور نفرتیں مٹا دینے کے بعد اپنے باپ سے سزا پانے کے لئے تیار تھی پھر اسے علی ملے یا نہ ملے' یہ فاتحانہ آسودگی رہتی کہ محبوب کا دل اس کے لئے آئینے کی طرح صاف ہو گیا ہے اور وہ دل کے آئینے میں ہمیشہ اس کی صورت دیکھتا رہے گا۔

عبدالقادر سومرو اکثر آدھی رات کے بعد گھر آتا تھا۔ کبھی کبھی زیادہ پی لینے کے باعث وہ اپنے کسی عیش کدے میں رہ جاتا تھا۔ دوسرے دن گھر آتا تھا۔ سبیکا نے رات گیارہ بجے اپنے سیف سے بڑے نوٹوں کی گڈیاں نکال کر اپنے پرس میں رکھیں پھر ایک ریوالور نکال کر اسے لوڈ کیا اور اسے بھی پرس میں رکھ کر باہر جانے لگی۔ گورنس اور دوسرے ملازموں نے اسے روکنا چاہا۔ اس نے پرس سے ریوالور نکال کر کہا۔ "میرے قریب کوئی نہ آئے۔ ورنہ گولی مار دوں گی۔"

وہ سب سہم کر دور ہو گئے۔ وہ تیزی سے چلتی ہوئی کوٹھی کے باہر احاطے کے گیٹ پر آئی۔ مسلح گارڈ کا نشانہ لے کر بولی۔ "میرا راستہ روکو گے تو میں گولی چلاؤں گی۔ میں

تمہارے مالک کی بیٹی ہوں۔ کیا تم جواباً مجھ پر گولی چلاؤ گے؟ سامنے سے ہٹ جاؤ یا پھر میں فائر کرتی ہوں۔"

وہ جواباً فائر نہیں کر سکتا تھا۔ ایک طرف ہٹ کر اسے راستہ دیتے ہوئے عاجزی سے بولا۔ "بی بی جی! آپ اس طرح جائیں گی تو صاحب میری چھٹی کر دیں گے۔ میری ملازمت کا کچھ خیال کریں۔"

وہ کوئی جواب دیئے بغیر تیزی سے چلتی ہوئی مین گیٹ کے باہر آئی۔ کچھ فاصلے پر دو ٹیکسیاں کھڑی ہوئی تھیں۔ وہ ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر اسپتال پہنچ گئی۔ رات کے وقت وہی لڑکی کاؤنٹر کے پیچھے ڈیوٹی پر تھی جس نے سبیکا سے رشوت لے کر اسے علی کے کمرے تک جانے دیا تھا۔ اس وقت بھی سبیکا نے کاؤنٹر پر پہنچتے ہی ہزار روپے کا ایک نوٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "میں کل کی طرح جا رہی ہوں۔ جلد ہی واپس آ جاؤں گی۔"

وہ اس کا جواب سنے بغیر وہاں سے لفٹ کے پاس آئی۔ بٹن دبا کر اس کا دروازہ کھولا پھر اس کے ذریعے اوپر پہنچ گئی۔ رات آدھی ہو رہی تھی۔ کمرے کا دروازہ بند تھا۔ اس نے دستک دی۔ اندر سے مرینہ کی آواز سنائی دی۔ "کون؟"

وہ سوچ کر آئی تھی کہ علی کی والدہ ہوں گی لیکن مرینہ پھر واپس آ گئی تھی۔ سبیکا نے کچھ سوچا پھر بھاری آواز میں بولی۔ "نرس۔"

مرینہ نے دروازے کو ذرا سا کھول کر دیکھنا چاہا۔ سبیکا نے ایک جھٹکے سے اور کھول دیا۔ وہ دھکا کھا کر پیچھے گئی۔ یہ اندر آ گئی۔ علی نے چونک کر اسے دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ دونوں کے دل تیزی سے دھڑکنے لگے۔ مرینہ نے غصے سے پوچھا۔ "یہ کیا بیہودگی ہے۔ اس طرح دروازے کو دھکا کیوں دیا؟ کیا لڑنے آئی ہو؟"

وہ علی کو دیکھ کر اس کی طرف بڑھتی ہوئی بولی۔ "ہاں۔ میں تمہارے لئے ساری دنیا سے لڑنے آئی ہوں۔ تم نہیں جانتے' یہاں سے واپس جاؤں گی تو ڈیڈی مجھ پر کتنا ظلم کریں گے۔ مجھے کوٹھی میں نظر بند کیا گیا ہے۔ میں ملازموں کو ریوالور سے دھمکیاں دے کر آئی ہوں۔ واپسی پر مجھے زنجیریں پہنا دی جائیں گی۔ میں فیصلہ کر چکی ہوں۔ کچھ بھی ہو جائے میں تمہارے دل سے غلط فہمی دور کروں گی۔ میں بلندی سے انتہائی پستی میں گر سکتی ہوں لیکن تمہاری نظروں سے گر کر زندہ نہیں رہ سکوں گی۔"

مرینہ ان کے درمیان آ گئی۔ مٹھیاں بھینچ کر بولی۔ "یہ کیا بکواس کر رہی ہو؟ علی تمہاری کوئی بکواس نہیں سنیں گے۔ یہ بیمار ہیں۔ تم یہاں سے جاؤ۔"

علی نے کہا۔ "مرینہ! تم آرام سے بیٹھو۔ اس کی باتیں سمجھنے دو۔ یہ رکاوٹیں توڑ کر آئی ہے۔"

پھر اس نے سبیکا سے کہا۔ "تم اعتماد کھو چکی ہو۔ اب یہ سمجھنا مشکل ہے کہ تمہاری باتوں میں کتنا جھوٹ ہے اور کتنا سچ۔"

وہ التجا آمیز لہجے میں بولی۔ "کالج میں پہلے دن محبت کی ابتدا میں نے نہیں تم نے ہی کی تھی۔ جس لمحے میں پہلی بار تمہارے اندر میری محبت پیدا ہوئی تھی' میں اسی پہلے لمحے کی قسم دیتی ہوں۔ دل سے تمام غلط فہمیاں نکال کر سوچو کہ میں تم سے کیوں دشمنی کروں گی؟ کیوں تم پر الزام لگاؤں گی؟"

اس کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ وہ بولی۔ "میرے ڈیڈی وڈیرا شاہی کے پروردہ ہیں۔ وہ دوسروں کو گری ہوئی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ وہ تمہارے خلاف سازش کر کے دو فائدے حاصل کرنا چاہتے تھے۔ ایک تو انہوں نے تم سے سیاسی انتقام لیا۔ دوسرا یہ کہ تمہیں چور بنا کر ذلیل کر کے میرے سامنے یہ ثابت کرنا چاہا کہ تم چور اچکے ہو اور میرے جیون ساتھی بننے کے قابل نہیں ہو۔ تم یقین کرو۔ اتنا کچھ ہونے کے باوجود میرا دل تمہیں مجرم نہیں سمجھ رہا تھا۔ میں آدھی رات کے بعد ڈیڈی اور پہرے داروں سے چھپ کر یہاں تم سے ملنے آئی تھی لیکن مرینہ نے تم سے ملنے نہیں دیا۔"

مرینہ نے تڑخ کر کہا۔ "ہاں میں نے نہیں ملنے دیا تھا۔ یہ میری محبت ہے۔ یہ میرا پیار ہے۔ تم نے اسے مار ڈالنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ میں نے اسے نئی زندگی دی ہے۔ اس کی نئی زندگی پر صرف میرا حق ہے۔"

علی نے کہا۔ "مرینہ! اسے بولنے دو۔ بڑے سے بڑے مجرم کو اپنی صفائی میں بولنے کا موقع دیا جاتا ہے۔ تم تھوڑی دیر کے لئے اپنے دل سے عداوت نکال دو۔ سنجیدگی سے اس کی بات پر غور کرو۔ ہم نے اس کی مخالفت میں بہت سی باتوں کو درست سمجھ لیا ہے تو ہمدردی اور حمایت میں اس کی کچھ باتوں کو درست کیوں نہیں سمجھ سکتے؟ تم بھی سبیکا سے دوستی اور محبت کرتی رہی ہو۔ ہم اسی محبت سے اس کی مجبوریوں اور مسائل کو سمجھ سکتے

ہیں۔"

علی کی باتیں سن کر مرینہ کا دل ڈوب رہا تھا۔ اس کی باتوں سے واضح ہو رہا تھا کہ وہ سبیکا کی طرف پھر سے مائل ہو رہا ہے۔

سبیکا نے مرینہ سے کہا۔ "میرے دل میں تمہارے لئے کوئی عداوت نہیں ہے لیکن تمہارے دل میں ہے۔ تمہیں یہ اندیشہ ہے کہ میں علی کو تم سے چھین لوں گی۔ پیار اعتماد کے بغیر نہیں ہوتا۔ مجھے اتنا اعتماد ہے کہ میں ابھی علی سے محبت مانگنے نہیں آئی ہوں صرف غلط فہمیاں دور کرنے آئی ہوں۔ جب مجھے یقین ہو جائے گا کہ علی نے مجھے نظروں سے نہیں گرایا ہے' اس کے دل میں میرے لئے پہلے جیسا ہی مقام ہے تو میں یہاں سے چلی جاؤں گی۔"

وہ بولی۔ "تم لچھے دار باتیں کر رہی ہو۔ پہلے جیسے مقام کا مطلب یہ ہے کہ پہلے جیسی محبت حاصل کرنا چاہتی ہو۔ اس بات کو گھما پھرا کر کہہ رہی ہو۔"

"میں ایک بات جانتی ہوں کہ علی کو ابھی اس معاملے میں نہیں الجھانا چاہئے کہ یہ ہم دونوں میں سے کسے چاہتا ہے۔ اس کا دل تمہاری طرف سے صاف ہے۔ میری طرف سے بھی دل صاف ہو جائے تو مجھے اطمینان حاصل ہو گا۔"

وہ علی کو دیکھ کر بولی۔ "پلیز مجھے بتاؤ۔ میں اور کس طرح اپنی بے گناہی کا یقین دلا سکتی ہوں۔"

مرینہ کچھ کہنا چاہتی تھی۔ سبیکا نے تنبیہہ کے انداز میں انگلی اٹھا کر کہا۔ "بار بار ہمارے درمیان نہ بولو۔ میں بھی تم سے دشمنی کرنا چاہوں تو ابھی تمہیں اس کمرے سے نکال سکتی ہوں۔"

علی نے قائل ہو کر مرینہ سے کہا۔ "یہ درست کہہ رہی ہے۔ تم اس کی موجودگی یہاں برداشت نہیں کر رہی ہو۔ یہ بھی عداوت پر اتر آئے تو تم ایک منٹ بھی یہاں نہیں رہ سکو گی۔ تمہیں اس کا احسان ماننا چاہئے کہ یہ تمہاری موجودگی یہاں برداشت کر رہی ہے۔"

مرینہ نے بے بسی سے سبیکا کو دیکھا۔ وہ اسے علی سے دور کرنے کی بات کر رہی تھی لیکن وہ بھی اس کی طرح ضدی تھی۔ علی کے قریب آ کر بستر کے سرے پر بیٹھ گئی پھر

بولی۔ "میں جان دے دوں گی مگر تم سے دور نہیں جاؤں گی۔"

سبیکا نے پرس کے اندر سے ریوالور نکال کر اسے دکھاتے ہوئے کہا۔ "میں بھی جان پر کھیلنا جانتی ہوں۔ یہ طے کر کے آئی ہوں کہ علی کے دل میں جگہ نہیں پا سکوں گی اور ناکام واپس جاؤں گی پھر وہاں ڈیڈی مجھ پر ظلم کریں گے اور مجھے کسی وڈیرے کے پلے باندھنا چاہیں گے تو اس روز یہ ریوالور میرے کام آئے گا۔ اب میری زندگی میں کوئی دوسرا شخص نہیں آئے گا۔ میں اپنی جان پر کھیل جاؤں گی۔"

وہ ریوالور کو دوبارہ پرس میں رکھتے ہوئے بولی۔ "تم علی کی جدائی میں مرجانے کی بات کرتی ہو۔ میں تو موت کو ساتھ لئے گھوم رہی ہوں۔"

فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ علی نے ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھایا پھر اسے کان سے لگا کر بولا۔ "ہیلو۔ کون..........؟"

دوسری طرف سے عبدالقادر سومرو کی گرجتی ہوئی آواز سنائی دی۔ "کیا تم علی بول رہے ہو؟"

"ہاں میں بول رہا ہوں۔ تم کون ہو؟"

"ہاں یا ناں میں جواب دو۔ کیا میری بیٹی سبیکا تمہارے پاس آئی ہے؟"

علی نے سبیکا کی طرف دیکھا پھر جواب دیا۔ "اگر تمہاری بیٹی یہاں ہو گی تو تم میرا کیا بگاڑ لو گے؟"

سبیکا نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ سمجھ گئی کہ اس کا باپ فون کے ذریعے اسے ڈھونڈ رہا ہے۔ ادھر وہ فون پر گرج رہا تھا۔ برس نہیں سکتا تھا۔ اس سے کہہ رہا تھا۔ "میں کیا بگاڑ سکتا ہوں اس کا ایک نمونہ تم دیکھ چکے ہو۔ سیدھی طرح میرے سوال کا جواب دو۔"

"پہلے میرے سوال کا جواب دو۔ بیٹی کس لئے باپ کا گھر چھوڑ کر گئی ہے۔"

وہ دھاڑتے ہوئے بولا۔ "میرے گھر کو آگ لگا کر مجھ سے پوچھ رہے ہو۔ تم نے اس کا دماغ خراب کر دیا ہے۔ وہ کل رات بھی میری اجازت کے بغیر تم سے ملنے گئی تھی۔ آج بھی تمہارے پاس ضرور پہنچی ہو گی۔"

"اگر وہ پہنچی ہو گی تو کیا تمہاری وڈیرا شاہی کی طاقت اسے یہاں سے لے جا سکے گی؟

سینکڑوں اسٹوڈنٹس تم سے نفرت کرتے ہیں۔ اگر وہ تمہاری بیٹی کو کہیں غائب کر دیں گے تو تم مجھے کبھی الزام نہیں دے سکو گے۔“

”تم باتیں بنا رہے ہو مگر یہ نہیں بتا رہے ہو کہ سبیکا تمہارے پاس آئی ہے یا نہیں؟“

”اگر آئی ہے تو اس کی واپسی کے لئے جنگ کرو گے یا سمجھوتہ؟“

دوسری طرف تھوڑی دیر تک خاموشی طاری رہی پھر اس نے کہا۔ ”بیٹی غریب کی ہو یا کسی وڈیرے کی‘ جب وہ گھر سے بھاگتی ہے تو بدنامی کے ہزاروں دروازے کھل جاتے ہیں۔ ہم تو بدنامی سے بچنے کا ایک ہی راستہ جانتے ہیں۔ گھر سے بھاگنے والی لڑکی کو گولی مار دیتے ہیں۔ اگر وہ گوٹھ میں ہوتی اور حویلی سے قدم باہر نکالتی تو میں اسے زندہ واپس نہ لاتا لیکن یہ شہر ہے اور تمہارے پیچھے ایسے طلبہ کی طاقت ہے جن کے باپ اور سرپرست بڑے بڑے سرمایہ دار ہیں۔ لہٰذا میں سمجھوتہ کروں گا۔ یہ سمجھ گیا ہوں کہ سبیکا وہاں موجود ہے۔ اس سے بات کراؤ۔“

علی نے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”تمہارے ڈیڈی سمجھوتہ کرنے پر راضی ہیں۔ وہ تم سے باتیں کرنا چاہتے ہیں۔ تم ان شرائط پر واپس جانے پر راضی ہو سکتی ہو کہ وہ تم پر ظلم نہ کریں اور تمہارے اطراف پہرے نہ بٹھائیں۔“

سبیکا نے اس سے ریسیور لے کر کان سے لگایا پھر دھیمی آواز میں بولی۔ ”ہیلو ڈیڈ! میں بول رہی ہوں۔“

وہ غصے سے بولا۔ ”فوراً واپس آؤ۔“

”میں واپس آؤں گی لیکن میں بے جا پابندیوں میں نہیں رہوں گی۔ کل سے کالج اٹینڈ کروں گی اور علی کے خلاف آپ کی کوئی سازش برداشت نہیں کروں گی۔ میں آپ سے یہ جائز باتیں منوا رہی ہوں۔ پلیز آپ مان لیں۔“

”یہ باتیں ہم گھر میں بھی کر سکتے ہیں۔ میں گاڑی لے کر آ رہا ہوں۔ اسپتال کے باہر پہنچتے ہی فون پر اطلاع دوں گا۔ تم چلی آنا۔ ٹھیک ہے؟ میں ابھی آ رہا ہوں۔“

فون بند ہو گیا۔ اس نے ریسیور رکھتے ہوئے علی کو دیکھا پھر کہا۔ ”جس جہنم سے بھاگ کر آئی تھی وہاں واپس جا رہی ہوں۔ ایک بار کہہ دو کہ میں قصوروار نہیں ہوں۔

میں نے تمہارے خلاف کوئی سازش نہیں کی تھی۔“

علی نے بڑے پیار سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ مرینہ کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ سبیکا کا دل خوشی سے دھڑکنے لگا۔ وہ بولا۔ ”مجھے افسوس ہے کہ میں نے تم پر شبہ کیا۔ تم باپ بیٹی کی مخالفت نے ثابت کر دیا ہے کہ تم میری خاطر سچ مچ باپ کی مخالفتیں مول لے رہی ہو اور مجھے خوش نصیب بنا رہی ہو۔“

وہ اسے آئی لو یو کہنا چاہتا تھا لیکن بات ادھوری رہ گئی۔ مرینہ دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپ کر رو رہی تھی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ اس کے آنسو سمجھ میں آ رہے تھے۔ مرینہ نے بھی پیار کی انتہا کر دی تھی۔ اس سے بے لوث محبت کر رہی تھی۔ اس کے لئے دن کو دن اور رات کو رات نہیں سمجھ رہی تھی۔ باپ بھائیوں نے اس کے اسپتال میں رہنے پر اعتراض کیا لیکن وہ دوسری عورت بھی وہاں رہنے چلی آئی تھی۔

باپ اور بھائی بے غیرت نہیں تھے۔ وہ اسے کبھی رات کو گھر سے باہر جانے کی اجازت نہ دیتے لیکن بات کچھ اور تھی۔ مرینہ دل کی مریضہ تھی۔ دل اس قدر کمزور تھا کہ شدید صدمہ ہو یا کسی طرح کا ذہنی انتشار ہو تو اس کے دل کی دھڑکنیں تھمنے لگتی تھیں۔ ایسے وقت اسے فوراً اسپتال پہنچایا جاتا تھا۔ فیملی ڈاکٹر نے کہا تھا کہ زندگی میں دکھ سکھ لگے رہتے ہیں لیکن اسے کوئی بڑا صدمہ نہ پہنچنے دیا جائے۔ اسے ہر حال میں خوش رکھا جائے۔

اس کے باپ اور بھائیوں نے یہ طے کیا تھا کہ اسے ہر حال میں خوش رکھیں گے۔ کسی ایسے لڑکے سے رشتہ کریں گے جو معمولی حیثیت کا ہو گا۔ وہ کروڑوں کی جائیداد کی مالک تھی۔ کوئی بھی کم حیثیت کا جوان تمام تمام عمر اس کا وفادار بن کر رہ سکتا تھا۔

انہیں اپنی پلاننگ کے مطابق علی ایسا دکھائی دے رہا تھا۔ اسی لئے انہوں نے مرینہ کو ڈھیل دی تھی لیکن اس نے رات کو اسپتال میں رہنے کی ضد کی تو وہ پریشان ہو گئے۔ وہ علی سے اتنی گہری وابستگی اور ایسی دیوانگی ظاہر کر رہی تھی کہ وہ اس پر پابندی عائد کر کے اسے صدمہ نہیں پہنچانا چاہتے تھے۔ پچھلی رات جب علی کی والدہ ان کی کار میں بیٹھ کر گھر جانے لگیں تو انہوں نے ہاجرہ بی کو اپنی کوٹھی میں بلا لیا۔ ان سے علی کے سلسلے میں باتیں کیں تو پتہ چلا کہ صدر کی پریڈی اسٹریٹ میں ان کی بہت بڑی زمین ہے۔ اس

انکشاف نے انہیں چونکا دیا تھا۔ بہت پہلے سے وہ زمین ان باپ بیٹوں کی نظروں میں تھی۔ وہ پلاٹ تقریباً ڈیڑھ کروڑ کی مالیت کا تھا۔ اس پر شاپنگ پلازہ بنا کر وہ کروڑوں روپے کما سکتے تھے۔

ہاجرہ بی نے انہیں یہ بھی بتایا تھا کہ وہ اس زمین پر کوئی فلاحی ادارہ قائم کرنا چاہتی ہیں۔ کمال احمد نے کہا۔ "یہ اچھی بات ہے کہ آپ نیک کام کرنا چاہتی ہیں لیکن فلاحی ادارہ آپ کسی دوسرے علاقے میں بھی قائم کر سکتی ہیں۔ آپ کا وہ پلاٹ کمرشل علاقے میں ہے۔ وہاں سے آپ اپنے بیٹے بہو اور پوتے پوتیوں کے لئے کروڑوں حاصل کر سکتی ہیں۔"

ہاجرہ بی نے اسپتال میں اپنے بیٹے کے لئے مرینہ کی محبت اور وفاداری دیکھی تھی۔ دل ہی دل میں اسے بہو بنانے کی خواہش بھی کی تھی۔ وہ اتنی جلدی رشتے کی بات نہیں چھیڑنا چاہتی تھیں۔ انہوں نے ابتدائی تعلقات بنائے رکھنے کے لئے کہا۔ "آپ میری ہونے والی بہو اور پوتے پوتیوں کے لئے بہترین مشورہ دے رہے ہیں۔ میں اس پر غور کروں گی پھر عمل کروں گی۔"

کمال احمد کے دو مقاصد پورے ہو رہے تھے۔ مرینہ کے لئے من پسند لڑکا ملنے والا تھا اور اس لڑکے کی زمینوں سے کروڑوں روپے کا فائدہ بھی حاصل کیا جا سکتا تھا۔ ڈاکٹر نے سختی سے سمجھایا تھا کہ اسے کبھی کوئی بڑا صدمہ نہ پہنچایا جائے لیکن اس وقت اسپتال کے کمرے میں صدمے سے ٹوٹ رہی تھی۔ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپائے پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ سبیکا اور علی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح اسے سمجھایا جا سکتا ہے۔ پھر علی نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "مرینہ! تمہارے آنسو دیکھ کر مجھے تکلیف پہنچ رہی ہے۔ تم میری مسیحائی کے لئے آئی ہو یا مجھے تکلیف پہنچاؤ گی؟"

وہ اور بلک بلک کر رونے لگی۔ آنکھ سے نکلے ہوئے آنسوؤں کو پونچھا جا سکتا ہے لیکن ٹوٹے ہوئے دل سے بہتے ہوئے آنسوؤں کو نہیں پونچھا جا سکتا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کن الفاظ میں اسے سمجھائے کہ آنسو بہاؤ یا دل کا خون کرو تب بھی محبت نہیں ملتی۔ یہ تو مقدر سے ملتی ہے۔

فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ سبیکا نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا۔ "ہیلو۔ آپ کون

ہیں؟"

باپ کی آواز سنائی دی۔ "میں اسپتال کے باہر پجارو میں ہوں۔ فوراً چلی آؤ۔"

اس نے کہا۔ "ابھی آ رہی ہوں۔"

اس نے ریسیور رکھ کر علی کو دیکھا۔ وہ اسے حسرت سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "جا رہی ہو؟"

وہ سر جھکا کر بولی۔ "ہاں۔ پتہ نہیں مقدر میں کیا ہے؟ میرا دل گھبرا رہا ہے۔ پھر بھی یہ خوشیاں لے کر جا رہی ہوں کہ میں تمہیں ہارتے ہارتے جیت چکی ہوں۔ میں کل کسی وقت آؤں گی۔"

اس نے علی کی طرف اپنا ہاتھ بڑھایا۔ وہ اس کا ہاتھ تھام کر بیڈ سے اتر کر اس کے ساتھ دروازے تک جاتے ہوئے بولا۔ "میں تمہارے لئے فکرمند رہوں گا۔ گھر پہنچتے ہی مجھے فون ضرور کرنا۔"

"میں ضرور فون کروں گی۔ خدا حافظ۔"

اس نے ہاتھ پر بوسہ دیا۔ وہ سر سے پاؤں تک مسرتوں میں بھیگ گئی۔ فوراً ہی ہاتھ چھڑا کر شرماتی اور مسکراتی ہوئی تیزی سے چلتی ہوئی لفٹ کے پاس آئی۔ لفٹ اسے نیچے لے جانے لگی جبکہ وہ اوپر نامعلوم بلندیوں میں اڑ رہی تھی۔ پچھلے دو دنوں سے پریشان رہنے کے بعد اسے علی کو جیت لینے کی خوشیاں مل رہی تھیں۔

وہ لفٹ سے نکل کر تیزی سے چلتی ہوئی کاؤنٹر کے قریب سے گزرنے لگی۔ کاؤنٹر گرل اسے دیکھ کر مسکرائی۔ وہ بھی مسکراتی ہوئی اسپتال سے باہر آ گئی۔ باہر مین گیٹ کے سامنے پجارو کھڑی ہوئی تھی۔ اس کا باپ اسٹیئرنگ سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر ذرا جھجک گئی۔ سر جھکا کر دروازہ کھول کر اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ دروازے کو بند کر دیا۔

وہ گاڑی اسٹارٹ کر کے اسے آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ "خاندان کی عزت کو خوب اچھال رہی ہو۔ اگر تم دن کی روشنی میں یہاں آتیں تو یہ باپ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتا۔ اچھا کیا کہ رات کے اندھیرے میں ایسا کیا۔ مجھے بھی رات کے اندھیرے میں کچھ کر گزرنا چاہئے۔"

پھر اس نے عقب نما آئینے میں دیکھتے ہوئے آواز دی۔ "عثمان!"

عثمان اس کا بہت ہی خاص اور رازدار کارندہ تھا۔ سبیکا نے چونک کر باپ کو دیکھا پھر اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتی پیچھے سے ایک ہاتھ اس کے منہ پر آیا۔ اس ہاتھ میں ایک رومال تھا۔ وہ رومال اس کی ناک اور منہ پر جم گیا۔ بے ہوشی کی زود اثر دوا تھی۔ وہ جدوجہد نہ کر سکی۔ چند سیکنڈ میں ہی ساری دنیا سے اور اپنے آپ سے غافل ہو گئی۔

☆======☆======☆

وہ بازی جیت کر گئی تھی۔ یہ بازی ہار کر بیٹھی ہوئی تھی۔ چہرہ آنسوؤں سے تربتر تھا۔ علی اس کے قریب کھڑا شرمندہ سا تھا۔ وہ آنسو اسی نے دیئے تھے۔ وہ انہیں کیسے پونچھ سکتا تھا؟ آپ ہی زخم دے کر آپ ہی مرہم لگانے والی بات ہوتی۔ دل ایک بار توڑا تو جا سکتا ہے پھر جوڑا نہیں جا سکتا۔

اس نے جان بوجھ کر مرینہ کا دل نہیں توڑا تھا۔ وہ سبیکا کی طلب میں دل سے مجبور تھا۔ وہ مرینہ کو چاہتا تھا اس کی قدر کرتا تھا۔ اس کی خاطر دنیا ہار سکتا تھا لیکن دل صرف سبیکا کی خاطر ہارنے کے لئے تھا۔

وہ پاس آ کر بیڈ کے سرے پر بیٹھ گیا۔ کچھ کہنے کے لئے مناسب الفاظ نہیں مل رہے تھے۔ وہ پریشان ہو رہا تھا کہ کیا کہے اور کیا نہ کہے؟ اس نے جھجکتے ہوئے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔ وہ ذرا سمٹ سی گئی۔ اس نے اس ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں سے تھام لیا پھر اس ہتھیلی کی پشت کو سہلاتے ہوئے بولا۔ "میں بہت شرمندہ ہوں۔ یقین کرو میں جان بوجھ کر ایسا نہیں کر رہا ہوں۔ یہ جو کچھ ہو رہا ہے۔ میں پہلے کبھی کسی لڑکی کو نظر بھر کر نہیں دیکھتا تھا۔ کبھی کسی کی طرف مائل نہیں ہوتا تھا لیکن کالج میں پہلے دن پہلی بار اسے دیکھا تو خدا جانے مجھے کیا ہو گیا۔ میں یکبارگی اپنی ذات کو بھول کر اس کی ذات میں گم ہو گیا۔"

مرینہ نے بڑی آہستگی سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ وہ بول رہا تھا۔ "سبیکا کے بعد تم میری زندگی میں آئی ہو۔ پہلے میں تم سے متاثر نہیں ہوا تھا لیکن تم نے اپنی محبت سے، اپنی خدمت گزاری سے اور اپنے بہترین عمل سے میرے دل میں جگہ بنا لی۔"

اس نے پھر اس کے ہاتھ کو تھام لیا۔ اس بار اس نے اپنا ہاتھ نہیں چھڑایا۔ وہ کہہ

رہا تھا۔ "میں حیران ہوں کہ پہلے کبھی کسی لڑکی کی طرف مائل نہیں ہوتا تھا لیکن بہت کم عرصے میں دو لڑکیوں سے متاثر ہو گیا۔ حالات مجھے تم دونوں کے درمیان لے آئے ہیں۔ میں کشمکش میں ہوں کدھر جاؤں اور کدھر نہ جاؤں۔ تم جس سچائی سے اپنی محبت اور وفاداری کا ثبوت دے رہی ہو۔ میں دل کی گہرائیوں سے تمہیں چاہنے لگا ہوں۔ میرے دل جو قدر و منزلت سبیکا کے لئے ہے وہی تمہارے لئے ہے۔ اگر میں تمہاری محبت کے صلے میں محبت نہیں دوں گا تو یہ میری کم ظرفی ہو گی۔"

مرینہ نے اتنی دیر بعد سر اٹھا کر اسے بڑے پیار سے دیکھا۔ اپنا دوسرا ہاتھ اس کے ہاتھوں پر رکھ دیا۔ دونوں کے دونوں ہاتھ ایک دوسرے سے یوں گڈمڈ ہو گئے تھے جیسے ایک دوسرے کو ڈھونڈ رہے ہوں اور پا رہے ہوں۔ اس نے کہا۔ "مجھے سنبھلنے کا موقع دو۔ میں تم دونوں میں سے کسی کا بھی دل توڑنا نہیں چاہتا اور دو کشتیوں پر پاؤں رکھ کر زندگی کا سفر طے نہیں کر سکتا۔ میں نہیں جانتا کہ تم دونوں کے درمیان کب تک الجھا رہوں گا۔ پتہ نہیں ہم تینوں کے مقدر میں کیا لکھا ہوا ہے۔"

وہ بولی۔ "تمہیں پریشان نہیں ہونا چاہئے۔ میں تمہاری الجھنوں کو سمجھ رہی ہوں۔ میں نہیں جانتی کہ تمہارے دماغ پر کون زیادہ حاوی ہے۔ اتنا جانتی ہوں کہ تم میرے دل و دماغ پر مسلط ہو چکے ہو۔ مرتے دم تک تم ہی میری سانسوں میں رہو گے۔ کوئی دوسرا تمہاری جگہ نہیں لے سکے گا۔ تمہاری زندگی میں کوئی دوسری یا تیسری آئے مجھے اس کی پروا نہیں ہے۔ میں تو تمہارے پیچھے بھاگتے بھاگتے عمر تمام کر دوں گی۔"

دروازے پر دستک سنائی دی۔ دونوں نے چونک کر ادھر دیکھا۔ دونوں کے ذہن میں یہی بات آئی۔ "کیا سبیکا واپس آئی ہے؟"

وہ بیڈ سے اتر کر دروازے کے پاس آئی پھر پوچھا۔ "کون ہے؟"

باہر سے اپنے ڈیڈی کی آواز سنائی دی۔ "میں ہوں دروازہ کھولو۔"

کمال احمد نے اندر آ کر مسکراتے ہوئے علی سے کہا۔ "کیسے ہو بیٹے؟"

وہ اٹھ کر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "آپ کی دعاؤں سے ٹھیک ہوں۔ ڈاکٹر نے کہا' زخم جلد ہی بھر جائیں گے۔ آپ مجھ پر مہربان نہ ہوتے تو پتہ نہیں میرا کیا انجام ہوتا۔"

کمال احمد نے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "غیروں جیسی باتیں نہ کرو۔ تم

میرے بیٹے جیسے ہو۔ کل میں ڈاکٹر سے کہوں گا کہ تمہیں یہاں سے چھٹی دے دیں۔ میں نے تمہاری امی سے اجازت لے لی ہے۔ تم پوری طرح صحت یاب ہونے تک ہمارے گھر میں ہی رہو گے۔"

مرینہ خوشی سے کھل رہی تھی۔ اس نے کہا۔ "آپ یہ بات کہنے کے لئے اتنی رات کو آئے ہیں۔"

"میں شام کو بہت مصروف تھا۔ وزیٹنگ آورز میں نہ آ سکا۔ تمہارے کمرے میں جا کر دیکھا تو پتہ چلا کہ تم اپنی دوائیں بھول گئی ہو۔ یہ دوائیں لے کر آیا ہوں۔ تم بہت بے پروا ہو گئی ہو۔ تمہیں دوائیں تو وقت پر کھانی چاہئیں۔"

علی نے کہا۔ "کل رات تم نے یہ دوائیں گھر سے منگوائی تھیں لیکن ایک ہی بار استعمال کی تھیں۔ جب یہ دوائیں ضروری ہیں تو تمہیں بلاناغہ استعمال کرنی چاہئیں۔ بائی دا وے تمہیں تکلیف کیا ہے؟"

باپ بیٹی نے ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ وہ جواب دینے سے کترا رہے تھے۔ علی نے کہا۔ "کوئی بات نہیں۔ کوئی بھی تکلیف ہو، تمہیں وقت پر دوائیں کھانی چاہئیں۔"

کمال احمد نے کہا۔ "تم سے چھپانے کی بات نہیں ہے۔ ہم دوسروں کو نہیں بتاتے۔ تم تو ہمارے اپنے ہو۔ یہ دل کی مریضہ ہے۔ اس کا دل بہت کمزور ہے۔ بعض اوقات دل کی دھڑکنیں اتنی کمزور ہو جاتی ہیں کہ اسے اسپتال پہنچانا پڑتا ہے۔"

علی نے مرینہ کو ہمدردی اور محبت سے دیکھا۔ وہ سر جھکائے بیٹھی ہوئی تھی۔ کمال احمد اس کے بارے میں بتا رہا تھا۔ "ڈاکٹر نے تاکید کی تھی کہ اسے کوئی بڑا صدمہ نہیں پہنچنا چاہئے۔ یہ برداشت نہیں کر سکے گی۔ لہٰذا اسے ہر حال میں خوش رکھا جاتا ہے۔ اب سے پہلے اسے دو بار صدمات پہنچ چکے ہیں۔ ایک صدمہ تو ماں کی موت پر پہنچا تھا۔ صدمے سے اس کا دل اس قدر ڈوبنے لگا تھا کہ اس کے بچنے کی کوئی امید نہیں رہی تھی۔

"دوسری بار چھوٹا بھائی ایک حادثے میں ہلاک ہو گیا تھا۔ اس وقت بھی یہ صدمے سے ٹوٹ گئی تھی۔ اسے انتہائی نگہداشت (.I.C.U) میں رکھا گیا تھا۔ بڑی مشکلوں سے اس کی جان بچائی گئی تھی۔"

علی گہرے جذبوں سے یہ سب کچھ سن رہا تھا۔ پہلی بار وہ ماں کی ممتا سے محروم ہوئی تھی۔ دوسری بار بھائی کی محبت چھن گئی تھی۔ دونوں بار محبت کی محرومی سے اس نے صدمات اٹھائے تھے۔ علی کو یہ سوچ کر دکھ ہوا تھا کہ تیسری بار انجانے میں وہ اسے صدمہ پہنچانے والا تھا۔ اگر وہ سبیکا کی حمایت میں یکطرفہ فیصلہ سنا دیتا تو یہ تیسری بار محبت کی محرومی کا صدمہ برداشت نہ کر پاتی۔ وہ ایک بہت بڑی غلطی کرنے سے بچ گیا تھا۔

کمال احمد نے کہا۔ "میرے تین بیٹوں میں یہی ایک بیٹی ہے۔ تیسرا بیٹا تو حادثے میں ہلاک ہو گیا تھا۔ اسی ایک بیٹی سے گھر میں رونق رہتی ہے۔ بعض اوقات یہ ایسی ضد منواتی ہے کہ جسے پورا کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ یہی دیکھو اس لڑکی کو تنہا تمہارے پاس نہیں رہنا چاہئے لیکن یہ یہاں رہ کر اپنی ضد منوا رہی ہے۔ اگر ہم پابندی عائد کرتے تو یہ رو رو کر صدمے سے دوچار ہوتی رہتی۔"

علی کو کہنا چاہئے تھا کہ واقعی یہ نامناسب ہے۔ اسے باپ اور بھائیوں کی عزت کا خیال کرنا چاہئے۔ اس کے کمرے میں دوسری رات گزارنے نہیں آنا چاہئے لیکن وہ ایسا نہیں کہہ سکا کیونکہ وہ خود بھی اس کے ساتھ دوسری رات گزار رہا تھا۔ ان کے بزرگ بھی اس بات کو عزت یا غیرت کا مسئلہ اس لئے نہیں بنا رہے تھے کہ ان دونوں کو ایک دوسرے سے منسوب کرنے اور انہیں رشتہ ازدواج میں منسلک کرنے کے سلسلے میں خاموشی سے سمجھوتا ہو چکا تھا۔

کمال احمد نے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے علی سے کہا۔ "اچھا بیٹے! میں چلتا ہوں۔ انشاء اللہ کل تمہیں یہاں سے لے جاؤں گا۔"

وہ مصافحہ کر کے جانے لگا۔ مرینہ اس کے ساتھ کمرے سے باہر لفٹ کے دروازے تک چھوڑنے آئی پھر اس کے بازو کو تھام کر بولی۔ "ڈیڈی! آپ بہت اچھے ہیں۔ آئی لو یو۔"

وہ آئی لو یو ٹو کہہ کر لفٹ کے ذریعے چلا گیا۔ علی کھلے ہوئے دروازے پر کھڑا ہوا تھا۔ وہ مسکراتی ہوئی اس کے پاس آ گئی۔ وہ بولا۔ "تمہارے ڈیڈی بہت اچھے ہیں۔"

وہ مسکراتی ہوئی بولی۔ "آخر ڈیڈی کس کے ہیں؟"

وہ دونوں ہنستے ہوئے کمرے میں آ گئے۔ ان لمحات میں سبیکا اس کے ذہن سے محو ہو

گئی تھی۔ اسے مرینہ کے علاوہ اس کے باپ سے بھی بھرپور اپنائیت مل رہی تھی۔ اس میں شبہ نہیں تھا کہ کل سے اب تک دونوں باپ بیٹی نے ظالم انسپکٹر سے اسے نجات دلا کر اسپتال پہنچایا تھا۔ اس کے علاج پر صرف توجہ ہی نہیں دے رہے تھے۔ دن رات اس کی تیمارداری بھی کر رہے تھے۔ اگر وہ اسے چوری کے الزام سے بری نہ کراتے تو وہ تمام عمر چور کہلاتا رہتا۔ وہ احسان بھی کر رہے تھے اور اسے محبتیں بھی دے رہے تھے۔ اس نے مرینہ کے دونوں بازوؤں کو تھام کر کہا۔ "تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا کہ تمہارا دل اس قدر کمزور ہے۔ تمہیں انجانے میں مجھ سے صدمہ پہنچنے والا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ میں نے اب تک تمہارا دل نہیں دکھایا۔ میری کوشش ہوگی کہ میری طرف سے تمہیں کبھی کوئی صدمہ نہ پہنچے۔"

وہ اس کی گردن میں بانہیں ڈال کر بولی۔ "تم مجھے کوئی دکھ نہیں پہنچاؤ گے۔ بس میں اتنا ہی چاہتی ہوں۔ مجھے دکھ نہ دینے کا مطلب یہ ہے کہ مجھے سکھ دیتے رہو گے۔"

فون کی گھنٹی سنائی دی۔ دونوں نے ادھر دیکھا۔ دوسری بار گھنٹی سنائی نہیں دی۔ خاموشی رہی۔ رانگ کال آتے آتے رہ گئی تھی۔ اس ایک گھنٹی کی آواز نے یہ یاد دلایا کہ سبیکا گھر پہنچتے ہی فون کرنے والی تھی۔ ایک گھنٹا گزر چکا تھا۔ اس نے ابھی تک فون نہیں کیا تھا۔ علی نے پھر بے چینی سے فون کی طرف دیکھا اور کہا۔ "وہ گھر پہنچ چکی ہوگی۔ اسے فون کرنا چاہئے۔ شاید وہی فون کر رہی ہے۔ لائن کٹ رہی ہوگی۔"

مرینہ کی مسکراہٹ ذرا سی بجھ گئی۔ مستی میں جھومنے والی کے پاؤں میں کانٹا چبھ گیا تھا۔ یہ کانٹا تو بار بار چبھنے والا تھا اور بار بار اسے نکالنا بھی تھا۔ وہ فون کی طرف دیکھ رہا تھا۔ مرینہ نے دونوں ہاتھوں سے اس کے چہرے کو تھام کر اپنی طرف کیا پھر کہا۔ "جب فون کو بولنا ہوگا تب بولے گا۔ ابھی تو میں تمہارے پاس ہوں۔ مجھ سے بولو۔ ابھی تم کتنے پیار سے بول رہے تھے۔"

وہ پیار سے بولنے لگا۔ وہ دل سے بول رہا تھا مگر ذہن ٹیلی فون کی طرف بھٹک رہا تھا۔ مرینہ اسے دوا کھلا رہی تھی پھر خود بھی دوا کھا رہی تھی۔ یوں وقت گزرتا جا رہا تھا۔ وہ ایک دم سے گھبرا کر بولا۔ "یہ فون خاموش کیوں ہے؟"

وہ بولی۔ "دو گھنٹے گزر چکے ہیں۔ وہ سو گئی ہوگی۔"

"کیا مجھ سے کیا ہوا وعدہ نباہے بغیر کبھی تمہیں نیند آ جائے گی؟ نہیں مرینہ! اس کا باپ بڑا خبیث ہے۔ وہ اس پر ظلم کر رہا ہوگا۔ اسے فون پر بات کرنے کی اجازت نہیں دے رہا ہوگا۔"

"تم تو جانتے ہو وہ کسی شک و شبے کے بغیر پیدائشی خبیث ہے۔ وہ اپنی بیٹی کے ساتھ جو ظلم کرے گا اسے ہم تم روک نہیں سکیں گے۔"

"کیوں نہیں روک سکیں گے؟ کیا ہم کسی طرح اس تنہا لڑکی کی مدد نہیں کر سکیں گے؟"

"تم مجھ سے توقع کر رہے ہو۔ میں بھلا اس کے لئے کیا کر سکوں گی؟"

"تم کچھ کرو یا نہ کرو۔ میں اسے ظلم سہنے کے لئے تنہا نہیں چھوڑوں گا۔ وہ میری خاطر باپ سے مخالفتیں مول لے رہی ہے۔ تمہیں اس کا فون نمبر معلوم ہوگا؟ اس کے موبائل کا یا گھر کا فون نمبر؟"

وہ بولی۔ "اس نے کبھی مجھے اپنا فون نمبر اور گھر کا ایڈریس نہیں بتایا اور نہ ہی میں نے کبھی پوچھنا مناسب سمجھا۔"

وہ پریشان ہو کر بیڈ سے اتر گیا۔ اِدھر سے اُدھر ٹہلنے لگا۔ مرینہ پریشان ہو کر اسے دیکھ رہی تھی۔ اس نے کہا۔ "تم بیمار اور کمزور ہو۔ تمہیں آرام سے لیٹنا چاہئے۔ زیادہ سوچنا اور پریشان ہونا تمہارے لئے مناسب نہیں ہے۔"

"جب تک اس کی خیریت نہیں معلوم ہوگی، میں سکون سے نہ لیٹ سکوں گا، نہ بیٹھ سکوں گا۔"

وہ ٹہلتے ٹہلتے رک گیا پھر بولا۔ "تم یونین لیڈر جمشید کا فون نمبر جانتی ہو؟"

"ہاں جانتی ہوں لیکن جمشید اس سلسلے میں کیا کرے گا؟"

وہ فون کے پاس آ کر ریسیور اٹھا کر بولا۔ "تم نمبر بتاؤ۔"

وہ بتانے لگی۔ وہ نمبر پنچ کرنے لگا۔ دوسری طرف فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد دوسری طرف سے بھاری بھرکم آواز سنائی دی۔ علی نے کہا۔ "میں جمشید سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"میں جمشید کا باپ بول رہا ہوں۔ تم کون ہو؟"

"انکل! میں اسپتال سے علی بول رہا ہوں۔"

"اوہ اچھا۔ کیسے ہو بیٹا' کوئی پرابلم ہے؟"

"نو انکل! میں بالکل ٹھیک ہوں۔ کوئی پرابلم نہیں ہے۔ جمشید سے ذرا باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

"ہولڈ کرو۔ میں اسے بلا رہا ہوں۔"

اس نے انتظار کیا۔ تھوڑی دیر بعد جمشید کی آواز سنائی دی۔ "ہائے علی! اتنی رات کو کیسے فون کیا؟ خیریت تو ہے؟"

"میں خیریت سے ہوں۔ کیا تم سبیکا کا فون نمبر اور کوٹھی کا پتہ جانتے ہو؟"

"کوٹھی کا پتہ جانتا ہوں۔ فون نمبر نہیں جانتا۔ تم سبیکا کا پتہ کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"اس کا باپ نہیں چاہتا کہ وہ مجھ سے کوئی تعلق رکھے۔ وہ تمام پابندیاں توڑ کر یہاں مجھ سے ملنے آئی تھی۔ اس کا باپ اسے یہاں سے لے گیا ہے۔ سبیکا نے کہا تھا گھر پہنچتے ہی مجھے فون کرے گی۔ ڈھائی گھنٹے گزر چکے ہیں۔ اس نے ابھی تک اپنی خیریت کی اطلاع نہیں دی ہے۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اس کا باپ اس پر ظلم کر رہا ہوگا۔ پلیز میری کچھ مدد کرو۔ کسی طرح بھی اس سے رابطہ کراؤ۔"

جمشید نے کہا۔ "اس نے پوسٹرز میں لکھا تھا کہ وہ تمہاری حمایت اور باپ کی مخالفت کرے گی اور وہ عملی طور پر اس کا ثبوت دے رہی ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم اس کی خیریت معلوم کریں اور اس کے کام آئیں۔ میں اس کے کزن شبیر احمد کا فون نمبر جانتا ہوں۔ میں ابھی اس سے معلومات حاصل کرکے تمہیں کال بیک کروں گا۔"

رابطہ ختم ہو جانے پر علی نے ریسیور رکھ دیا۔ مرینہ نے پوچھا۔ "کیا ہوا؟"

"جمشید معلومات حاصل کر رہا ہے۔ ابھی فون کرے گا۔"

مرینہ دل ہی دل میں دعائیں مانگ رہی تھی۔ "اللہ کرے سبیکا سے رابطہ نہ ہو۔ اگر ہو تو اس کا باپ آخری فیصلہ سنا دے کہ وہ اپنی بیٹی کی شادی کسی وڈیرے سے کر رہا ہے۔ علی کی سمجھ میں یہ بات کیوں نہیں آتی کہ وہ کبھی ایک وڈیرے کا داماد نہیں بن سکے گا؟"

وہ سوچنے لگی۔ "مجھے بھی اس بات کا یقین رکھنا چاہئے کہ وہ وڈیرا اپنی جان دے دے گا مگر اپنی بیٹی علی کو نہیں دے گا۔ مجھے سبیکا کی مخالفت نہیں کرنی چاہئے۔ اس کے

معاملے میں ذرا فراخدلی سے علی کا ساتھ دینا چاہئے۔ وہ آسمان سے تارے توڑ کر لا سکتا ہے مگر سبیکا کو اس کی بلندی سے نہیں لا سکے گا۔ میں تو خواہ مخواہ اس معاملے میں پریشان ہو رہی ہوں۔"

فون کی گھنٹی سنائی دی۔ علی نے فوراً ہی ریسیور اٹھا کر کہا۔ "ہیلو؟"

دوسری طرف سے جمشید کی آواز سنائی دی۔ "کاغذ اور قلم لو۔ سبیکا کے موبائل نمبر اور گھر کے فون نمبر نوٹ کرو۔ گھر کا پتہ بھی لکھو۔"

اس نے کاغذ قلم لے کر کہا۔ "بولو میں لکھ رہا ہوں۔"

وہ بولنے لگا۔ یہ لکھنے لگا پھر جمشید نے کہا۔ "میں نے ان نمبروں پر سبیکا کو کال کی تھی۔ اس کا موبائل فون بند ہے۔ گھر کے فون نمبر پر گورنس نے بتایا کہ وہ باپ بیٹی گھر میں نہیں ہیں۔ کوئی تین چار گھنٹے پہلے عبدالقادر سومرو اپنی بیٹی کو گھر واپس لانے کے لئے اسپتال گیا تھا لیکن وہ اپنی بیٹی کے ساتھ ابھی تک گھر واپس نہیں آیا ہے۔"

علی نے کہا۔ "جمشید! گڑبڑ ہے۔ وہ سبیکا کو جبراً کہیں لے گیا ہے۔ وہ اسے مجھ سے دور کر دینا چاہتا ہے اور اسے دور کرنے کے لئے کچھ بھی کر سکتا ہے۔ پتہ نہیں وہ اس کے ساتھ کیسا سلوک کر رہا ہوگا؟"

جمشید نے سمجھایا۔ "تم پریشان ہو کر کیا کرو گے؟ ابھی ہم اندھیرے میں ہیں۔ ہم نہیں جان سکتے کہ وہ بیٹی کو کہاں لے گیا ہے۔ تمہیں صبر کرنا ہوگا۔ انتظار کرنا ہوگا۔ شاید کل صبح تک اس کے بارے میں کچھ معلوم ہو سکے۔ رات بہت ہو چکی ہے۔ تم سونے کی کوشش کرو۔"

رابطہ ختم ہو گیا۔ اس نے بے دلی سے ریسیور رکھ کر مرینہ کو دیکھا۔ وہ اس کا بازو تھام کر بولی۔ "پلیز بیڈ پر لیٹ جاؤ۔ لیٹنا نہ چاہو تو بیٹھ جاؤ۔ یوں تھکتے رہو گے تو کوئی مسئلہ حل نہیں ہوگا۔"

وہ بیڈ کے سرے پر آ کر بیٹھ گیا۔ سر جھکا کر سوچنے لگا۔ اس نے کہا۔ "علی! پلیز میری بات مان لو۔ آرام سے لیٹ جاؤ۔"

وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔ "زندگی کانٹوں کا بستر بن جائے تو تم مجھے کیسے سلاؤ گی؟"

"میں تمہاری زندگی کو پھولوں کی سیج بنا دوں گی۔ مجھے دیکھو' مجھے سمجھو۔ کیا میں کانٹے کی طرح چبھ رہی ہوں؟ اگر نہیں تو پھر تمہارے لئے پھول ہوں اور پھول کے سامنے کانٹوں کی باتیں نہ کرو۔"

"تم اپنی باتیں کر رہی ہو اور میں اس کے لئے پریشان ہو رہا ہوں۔ یہ بھول جاؤ کہ میں ایک عاشق ہوں۔ میں پہلے ایک انسان ہوں اور ایک انسان ہونے کے ناتے ایک مظلوم لڑکی کے دکھ کو اپنا دکھ سمجھ رہا ہوں۔ پلیز مرینہ اس وقت عشق و محبت کو بھول جاؤ۔ کسی طرح اسے ڈھونڈ نکالنے کی بات کرو۔ اس وقت میرا ذہن کام نہیں کر رہا ہے۔ تم کچھ سوچو۔ اگر میری پریشانی دور کرنے کا جذبہ تمہارے اندر ہے تو میرے لئے کچھ کرو۔"

"میں تو تمہارے لئے بہت کچھ کرتی آ رہی ہوں لیکن صلے میں مجھے کیا مل رہا ہے؟ میں اندیشوں میں گھری ہوئی ہوں۔ اندیشے یہ ہیں کہ تم مجھ سے محبت نہیں ہمدردی کر رہے ہو تاکہ مجھے صدمہ نہ پہنچے۔ تم میرے مسیحا تو بن رہے ہو لیکن محبوب نہیں بن رہے ہو۔ اگر میں تمہاری محبت سے محروم رہی تو پھر زندہ نہیں رہ پاؤں گی۔"

وہ اس کے دونوں بازوؤں کو تھام کر بولا۔ "ایسی باتیں مت کرو۔ میں تمہیں کبھی صدمہ نہیں پہنچاؤں گا۔ اگر تمہارا علاج محبت ہے تو میں تمہیں محبت ہی دوں گا لیکن سبیکا کے لئے جو جذبہ ہے اسے تم محبت نہیں انسانی ہمدردی سمجھو۔ وہ میری خاطر یہاں آئی تھی۔ میری وجہ سے اس پر مصیبتیں آ رہی ہوں گی۔ یہ سوچ سوچ کر نہ مجھے نیند آئے گی نہ میں سکون سے رہ سکوں گا۔"

وہ اس کے دونوں شانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔ "میں تمہیں پریشان نہیں دیکھ سکتی۔ تمہارا آرام اور سکون چاہتی ہوں۔ فی الحال میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ کس طرح اسے تلاش کر کے تمہاری پریشانیاں دور کروں۔ ہم نہیں جانتے کہ اس کا باپ اسے کہاں لے گیا ہو گا۔ ہمیں کل تک انتظار کرنا ہو گا۔ اگر تم ابھی سو جاؤ گے تو وعدہ کرتی ہوں کہ کل جمشید وغیرہ کے ساتھ اسے تلاش کرنے نکلوں گی۔ اگر اس نے بیٹی کو کہیں چھپایا ہو گا تو میں ڈیڈی کے ذریعے اس کے خلاف قانونی کارروائی کروں گی۔ یہ الزام عائد کروں گی کہ اس نے بیٹی کو کہیں حبس بے جا میں رکھا ہے یا اسے قتل کر چکا ہے۔ تب وہ

اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لئے بیٹی کو منظر عام پر ضرور لائے گا۔"

اس نے خوش ہو کر اسے گلے لگا لیا۔ "تم بہت ذہین ہو۔ واقعی اس پر الزامات لگا کر اسے بیٹی کو سامنے لانے پر مجبور کیا جا سکتا ہے۔ بے شک تم اپنے عمل سے میرا دل جیت رہی ہو۔ اب میں کسی قدر سکون سے سو سکوں گا۔"

مرینہ نے اس کے دونوں شانے تھام کر اسے بستر پر لٹایا پھر سوئچ بورڈ کے پاس آ کر لائٹ آف کر دی۔

☆======☆======☆

دوسرا دن بڑا ہنگامہ خیز تھا۔ دوپہر تک عبدالقادر سومرو کی کوٹھی میں فون کئے جاتے رہے اور یہ سوال کیا جاتا رہا کہ سبیکا کہاں ہے؟ جواب یہی ملتا رہا کہ وہ باپ بیٹی موجود نہیں ہیں۔ جمشید نے تمام اسٹوڈنٹس کے سامنے تقریر کرتے ہوئے کہا۔ "سبیکا نے پوسٹرز میں لکھا تھا کہ وہ علی رمزی کی حمایت اور اپنے باپ کی مخالفت کرے گی۔ وہ عملی طور پر علی کی حمایت کر رہی ہے اور باپ کی مخالفت کی سزا پا رہی ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم متحد ہو کر اس سزا کے خلاف احتجاج کریں۔"

تمام اسٹوڈنٹس پھر ایک بار علی اور سبیکا کی حمایت میں متحد ہو گئے تھے۔ علی کو اسپتال سے چھٹی مل گئی تھی۔ کمال احمد اسے اپنی کوٹھی میں لے آیا تھا۔ مرینہ نے باپ اور بھائیوں کو سبیکا کے متعلق بتایا تھا کہ وہ علی کی خاطر کسی مصیبت میں گرفتار ہو گئی ہے۔ اس کے باپ نے اسے کہیں حبس بے جا میں رکھا ہے۔ آپ اپنے وکیل سے مشورہ کریں اور اس کے خلاف ایسی قانونی کارروائی کریں کہ وہ بیٹی کو ہمارے سامنے پیش کرنے پر مجبور ہو جائے۔

اس کے بڑے بھائی نے کہا۔ "یہ باپ بیٹی کا ذاتی معاملہ ہے۔ ہم قانوناً ان کے کسی معاملے میں مداخلت نہیں کر سکیں گے۔"

باپ نے کہا۔ "سبیکا تھرڈ ایئر میں ہے۔ یعنی بالغ بھی ہے اور تعلیم یافتہ بھی۔ وہ اپنی آزادی اور خود مختاری کے لئے فائٹ کر سکتی ہے اور وہ ہمیں یہ حق دے سکتی ہے کہ ہم اس کے لئے فائٹ کریں۔ ہمارا وکیل ہمیں بہتر مشورہ دے سکے گا۔"

علی اگرچہ سبیکا کے لئے پریشان تھا' لیکن یہ اطمینان بھی تھا کہ سب ہی اسے ڈھونڈ

نکالنے کے لئے جی جان سے کوششیں کر رہے ہیں۔ وہ دوسری رات بھی گزر گئی تھی اور سبیکا کوٹھی میں واپس نہیں آئی تھی۔ کمال احمد کے وکیل نے مشورہ دیا کہ کالج اسٹوڈنٹس یونین کی طرف سے اور کمال احمد کی طرف سے سبیکا کی گمشدگی کے سلسلے میں ایف آئی آر درج کرائی جا سکتی ہے۔ عبدالقادر سومرو کو مجبور کیا جا سکتا ہے کہ وہ سبیکا کو تھانے میں سب کے سامنے پیش کرے۔ اگر وہ انکار کرے گا تو اس کے خلاف عدالتی کارروائی کی جائے گی۔

مرینہ نے علی سے کہا۔ "تم نے پہلے بھی دیکھا ہے کہ میں عملی طور پر کس طرح تمہارے کام آتی رہی ہوں۔ تم سے جو وعدہ کرتی ہوں' اسے پورا ضرور کرتی ہوں۔ سبیکا کو اس کے باپ کے چنگل سے نکال لانے کے لئے میں عدالت تک جاؤں گی لیکن اس کے بعد بھی تمہیں ہار جاؤں گی تو میرا کیا ہوگا؟ کیا میں زندہ رہ پاؤں گی؟"

علی نے اس کے ہاتھ کو تھام کر بڑے جذبے سے کہا۔ "تم میری خاطر سبیکا کو مصائب سے نجات دلانے کی کوشش کر رہی ہو۔ تم یہ بھی سوچ سکتی ہو کہ اپنے پیروں پر آپ کلہاڑی مار رہی ہو لیکن میں ایسا کوئی فیصلہ نہیں کروں گا جس کے نتیجے میں تمہیں پچھتانا پڑے۔"

"تو پھر فیصلہ کیوں نہیں کر لیتے؟ کیا تمہیں یہ اچھا لگتا ہے کہ میں اندیشوں کی سولی پر لٹکی رہوں؟"

وہ تھوڑی دیر تک سر جھکا کر سوچتا رہا' پھر بولا۔ "جب سے سبیکا گم ہوئی ہے' تب سے سوچ رہا ہوں مجھے آئندہ بھی اس کی سلامتی کی فکر کرنی چاہئے اور میں یہ بھی نہیں جانتا کہ وہ ابھی سلامت ہے یا نہیں؟ یہ وڈیرے بڑے ظالم ہوتے ہیں۔ اگر وہ ماری جائے گی تو میں کبھی اپنے آپ کو معاف نہیں کر سکوں گا۔ میں دعا مانگتا رہتا ہوں کہ وہ سلامت رہے۔ اس کی سلامتی کے لئے میں کچھ بھی کر سکتا ہوں۔"

وہ اس سے نظریں ملاتے ہوئے بولا۔ "تمہارے ڈیڈی دولتمند ہیں۔ وسیع ذرائع کے مالک ہیں' تم ان کے ذریعے کسی طرح سبیکا کو زندہ سلامت واپس لے آؤ۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ تم اور صرف تم میری شریکِ حیات بنو گی۔"

اس نے خوب سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ سنایا' اپنے دل کو یہ سمجھا لیا کہ محبت میں اپنے

محبوب کو حاصل کرنا ضروری نہیں ہے۔ اس کی سلامتی چاہنا لازمی ہے۔ وہ زندہ سلامت رہے گی تو وہ اسے دیکھ دیکھ کر جیتا رہے گا۔

ہاجرہ بی بیٹے کی خاطر اس کوٹھی میں آ گئی تھیں۔ کمال احمد سے کہہ دیا تھا کہ علی صحت یاب ہوگا تو وہ بیٹے کے ساتھ گھر واپس چلی جائیں گی۔ علی کی رضامندی کے بعد مرینہ سے رشتہ طے ہو گیا تھا۔ وہ دونوں فرسٹ ایئر میں تھے۔ سیکنڈ ایئر کے بعد دونوں کی شادی کی تاریخ طے ہونے والی تھی۔

عبدالقادر سومرو کے خلاف ایف آئی آر درج کرائی گئی تھی۔ جب وہ دو دنوں تک اپنی کوٹھی میں واپس نہیں آیا تو پولیس اسے تلاش کرنے سلطان گوٹھ گئی۔ وہاں پتہ چلا' وہ اسلام آباد گیا ہے۔ وہاں کی پولیس کے ذریعے اسے تلاش کیا گیا۔ معلوم ہوا کہ وہ گرمیوں کا موسم گزارنے کے لئے لندن اور سوئٹزر لینڈ گیا ہے۔ شاید دو ماہ بعد واپس آئے گا۔ سبیکا کو وہ ساتھ لے گیا ہے یا یہیں کہیں اسے چھپا رکھا ہے۔ اس سلسلے میں کچھ معلوم نہ ہو سکا۔

علی کا اطمینان ختم ہو گیا۔ وہ دن رات اس کے بارے میں سوچنے لگا۔ کیا وہ زندہ ہوگی؟ اگر کہیں زندہ ہے تو ایک قیدی کی طرح زندگی گزار رہی ہوگی۔ اگر وہ آزاد ہوتی تو اپنے محبوب سے ضرور رابطہ کرتی اور رابطہ نہ کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ وہ زندہ ہی نہ ہو۔

سوچتے سوچتے اس کا سکون غارت ہو گیا۔ کچھ ایب نارمل سا ہوتا جا رہا تھا۔ دن رات مرینہ سے' اس کے باپ سے اور اپنی امی سے سبیکا کے بارے میں کچھ نہ کچھ بولتا رہتا تھا۔ مرینہ پھر اندیشوں میں مبتلا ہو رہی تھی۔ اگر وہ سبیکا کو ڈھونڈ نکالتی اور وہ علی کو زندہ سلامت دکھائی دیتی تو اسے قرار آ جاتا۔ وہ اپنے وعدوں کے مطابق اس سے دور رہتا اور دور ہی دور سے اسے دیکھ کر جیتا رہتا اور ایک ہونے والے جیون ساتھی کی حیثیت سے مرینہ کو محبتیں دیتا رہتا۔

کمال احمد نے تنہائی میں مرینہ سے کہا۔ "بیٹی! یہ تو سبیکا کے لئے پاگل ہو رہا ہے۔ تمہیں سمجھ لینا چاہئے کہ تمہارا انتخاب غلط ہے۔ یہ شادی تم سے کرے گا اور دیوانہ اس کا رہے گا تو کیا تم بہترین ازدواجی زندگی گزار سکو گی؟"

"ڈیڈ! میرا انتخاب غلط ہے اور نہ ہی علی غلط ہیں۔ وہ بہت حساس ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ان کی وجہ سے سبیکا پر مصیبتیں آئی ہیں۔ ان کی وجہ سے اس کے باپ نے اسے مار ڈالا ہے یا کہیں قیدی بنا کر رکھا ہے۔ جب وہ واپس آجائے گی' علی اسے دیکھ لیں گے تو پھر انہیں دلی سکون حاصل ہو جائے گا۔"

"بیٹی! تم علی کی محبت اور حمایت میں یہ حقیقت چھپا رہی ہو کہ وہ اس لڑکی کا دیوانہ ہے۔"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے ڈیڈ! آپ میری بات کا یقین کریں یا پھر مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔ میں نہیں جانتی میری زندگی کتنی ہے۔ جتنی بھی ہے' وہ علی کے لئے ہے۔ علی کے بغیر میری دھڑکنیں ابھی رک سکتی ہیں۔"

کمال احمد اور اس کے دونوں بیٹے مرینہ کی ایسی ہی باتیں سن کر چپ ہو جاتے تھے۔ یہ اچھی طرح جانتے تھے کہ اس کی زندگی مختصر ہے۔ اسے اس کی مرضی کے مطابق جینے دیا جائے۔

ایک ماہ گزر گیا۔ علی کے زخم بھر گئے تھے۔ ہاجرہ بی اس بات پر راضی ہو گئی تھیں کہ ان کے پلاٹ پر شاپنگ پلازا بنایا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں علی اور کمال احمد کے درمیان تحریری معاہدہ ہو گیا تھا۔ معاہدے کے مطابق علی کو جو رقم ملی' اس سے اس نے ایک کوٹھی اور کار خرید لی۔ ایسے وقت اسے عبدالقادر سومرو کی باتیں یاد آئیں۔ اس نے کہا تھا کہ اس کی بیٹی سے شادی کرنے سے پہلے اس کے پاس کوٹھی اور کار ہونی چاہئے۔ وہ وڈیرا سامنے ہوتا تو وہ اسے دکھاتا کہ اس نے ایک ڈیڑھ ماہ میں اس کے مطالبے کے مطابق کچھ حاصل کیا ہے اور آئندہ بہت کچھ حاصل کرنے والا ہے۔ "اب تمہیں اپنی بیٹی کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دینا چاہئے۔"

☆======☆======☆

اس کے دن اور رات عجیب طرح سے گزر رہے تھے۔ راتیں خواب دیکھتے ہوئے گزرتی تھیں۔ ان الٹے سیدھے خوابوں میں کبھی کبھی علی دکھائی دیتا تھا پھر گم ہو جاتا تھا۔ دن کو کھلی آنکھوں سے دنیا دکھائی دیتی تھی لیکن وہ دنیا کچھ سمجھ میں آتی تھی اور کچھ سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ وہ کچھ کچھ ہوش میں رہتی تھی اور کچھ مدہوشی طاری رہتی تھی۔ ہر دوسرے تیسرے دن ایک ڈاکٹر آتا تھا اور اسے ایک انجکشن لگا کر چلا جاتا تھا۔

اس انجکشن کے بعد ایسا سواد ملتا تھا کہ در و دیوار آہستہ آہستہ گھومنے لگتے تھے۔ دنیا رنگین دکھائی دیتی تھی۔ ہر طرح کی فکر اور پریشانی سے نجات مل جاتی تھی۔ علی بھی یاد آتا تھا تو بڑی مست ہو کر اس سے باتیں کرتی تھی۔ "ہائے! تم کہاں ہو؟ کیا سمجھتے ہو مجھے چھوڑ کر جاؤ گے تو میں رو رو کر جان دے دوں گی؟ نہیں' میں پاگل نہیں ہوں۔ کوئی چیز گم ہو جائے تو میں اس کے لئے نہیں روتی۔ اس کے بدلے دوسری لے آتی ہوں۔"

وہ جھومتی ہوئی ڈگمگاتی ہوئی اِدھر سے اُدھر جاتی تھی پھر دونوں بانہیں پھیلا کر تکئے کو سینے سے لگا کر کہتی تھی۔ "تم نہیں ہو تو کیا ہوا پھر بھی تمہیں پا لیتی ہوں۔"

وہ حویلی کے ایک وسیع و عریض بیڈروم میں رہتی تھی۔ اس کی نگرانی کے لئے دو لمبی چوڑی تگڑی قسم کی عورتیں تھیں۔ کبھی وہ اس کمرے سے باہر جانا چاہتی تو وہ اسے پکڑ لیتی تھیں۔ اس طرح جکڑ لیتی تھیں کہ وہ خود کو چھڑا نہ سکتی تھی۔ اس کمرے کے باہر مسلح گارڈز دن رات موجود رہتے تھے۔ اسے حویلی کے باہر تو کیا کمرے کے باہر بھی آنے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔

اس کے کمرے میں نہ ٹی وی رکھا گیا نہ ریڈیو۔ اسے باہر کی دنیا سے بالکل کاٹ دیا گیا تھا۔ کوئی دور کے رشتے دار یا مہمان وہاں آتے تو انہیں یہ پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ اس حویلی کے ایک دور افتادہ کمرے میں سبیکا کو قیدی بنا کر رکھا گیا ہے۔ یہ راز چند قابلِ اعتماد

ملازم جانتے تھے یا پھر بہت ہی قریبی رشتے داروں کو یہ بتایا گیا تھا کہ سبیکا خاندانی روایات سے بغاوت کر رہی ہے۔ اس لئے اسے سزا دی جا رہی ہے۔

قریبی رشتے داروں میں سبیکا کا ایک چچا اور ایک چچی' ایک ماموں اور ایک ممانی تھے۔ ان کے بچے شہر میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ اس لئے یہ راز اس حویلی کے صرف چند افراد جانتے تھے۔ جس رات سبیکا کو بے ہوش کر کے سلطان گوٹھ کی حویلی میں لایا گیا تھا۔ اس کے تیسرے دن پولیس والے سبیکا اور عبدالقادر سومرو کو تلاش کرنے آئے تھے۔ حویلی میں رہنے والے ان رشتے داروں نے بیان دیا تھا کہ وہ یہاں نہیں ہے۔ عبدالقادر سومرو کا فون آیا تھا کہ وہ اسلام آباد میں ہے اور وہاں کئی دن تک ایسے ہی معاملات میں مصروف رہے گا۔

پولیس والوں نے ان کی اجازت سے حویلی کی تلاشی لی تھی۔ سبیکا کو مدہوشی کی حالت میں چند گھنٹوں کے لئے وہاں سے ہٹا دیا گیا تھا۔ پولیس والے مطمئن ہو کر چلے گئے تھے لیکن عبدالقادر کا اطمینان ختم ہو گیا تھا۔ وہ اپنے بھائی اور سالے سے بولا۔ "یہ لڑکی مصیبت بنتی جا رہی ہے۔ آج پولیس آئی تھی۔ آئندہ ہمارے مخالفین یہاں جاسوسی کرا سکتے ہیں۔ وہ لڑکا علی رمزی بہت ضدی ہے پھر اس کے پیچھے اسٹوڈنٹس یونین اور ایک بہت بڑے سرمایہ دار کی دولت اور طاقت ہے۔ یہ لڑکی میرا سکون غارت کر رہی ہے۔ میری عزت خاک میں ملا رہی ہے۔ اس کی وجہ سے میری سیاسی شہرت کو دھچکا پہنچ سکتا ہے۔"

اس کے سالے نے کہا۔ "بھائی صاحب! مجھے تو آپ کے غصے سے ڈر لگتا ہے۔ میری بہن نے بغاوت کی تھی تو آپ نے گولی مار دی تھی۔ میں سبیکا کے لئے رحم کی بھیک مانگتا ہوں۔ یوں بھی آپ اسے جیسی سزا دے رہے ہیں۔ اس سے تو وہ آدھی موت مرتی جا رہی ہے۔ آپ اسے کچھ دنوں کے لئے کسی دوسری جگہ لے جا کر قید کر لیں۔ جب خطرہ ٹل جائے تو اسے واپس لے آئیں۔"

عبدالقادر کے بھائی نے کہا۔ "آپ اسے دماغی کمزوری میں کب تک مبتلا رکھیں گے؟ کیا یہ اپنی ماں کی زمینیں آپ کے نام لکھ دے گی؟ مجھے تو ایسا نہیں لگتا کیونکہ یہ آپ کی طرح ضدی ہے۔"

وہ بولا۔ "مجھے اندیشہ ہے۔ یہ اس کم بخت کے عشق میں پاگل ہو کر تمام زمینیں اس کے نام لکھ دے گی۔ میں اسے اس کا موقع نہیں دے رہا ہوں۔ یہ ذہنی طور پر مفلوج رہے گی تو رفتہ رفتہ علی کا نام بھول جائے گی۔ جب یہ میرے نام پر سب کچھ لکھنے پر راضی ہو جائے گی تو پھر میں اسے دماغی کمزوریوں میں مبتلا نہیں کروں گا۔"

سبیکا کی ماں بہت بڑے وڈیرے کی بیٹی تھی۔ سلطان گوٹھ اور اس کے آس پاس کی میلوں دور تک پھیلی ہوئی زمینیں اس کی ملکیت تھیں۔ اس نے اپنی موت سے پہلے یہ سب سبیکا کے نام لکھ دیا تھا۔ عبدالقادر سومرو یہ کبھی گوارا نہیں کر سکتا تھا کہ بیٹی یہ سب کچھ لے کر علی رمزی کے پاس چلی جائے۔ اب وہ زمینیں حاصل کرنے کے دو ہی راستے تھے۔ ایک تو یہ کہ سبیکا اپنی مرضی سے سب کچھ اپنے باپ کے نام لکھ دے یا پھر طبعی موت مر جائے تو قانونی طور پر وہ ساری زمینیں باپ کے نام ہو جائیں گی۔

سبیکا کی ماں نے وصیت میں یہ صاف طور پر لکھا تھا کہ اگر سبیکا کو قتل کیا جائے گا یا وہ کسی حادثے میں ہلاک ہو گی' اس کی موت طبعی نہیں ہو گی' مشکوک ہو گی کہ اسے ہلاک کیا گیا ہے تو پھر اس کی تمام زمینیں محکمہ اوقاف میں چلی جائیں گی۔ اس وصیت نے عبدالقادر کے ہاتھ باندھ دیئے تھے۔ ورنہ جس طرح اس نے اپنی دوسری بیوی یعنی سبیکا کی سوتیلی ماں کو گولی ماری تھی اسی طرح سبیکا کا بھی کام تمام کر دیتا۔

اس نے سبیکا کی نگرانی کرنے والی ایک عورت کو بلا کر پوچھا۔ "وہ کیا کر رہی ہے؟"

وہ سر جھکا کر ہاتھ جوڑ کر بولی۔ "وہ بالکل ٹھیک ہیں سائیں! اب باہر جانے کی ضد نہیں کرتی ہیں۔ بھوک لگے تو کھانا کھا لیتی ہیں مگر بہت کمزور ہو گئی ہیں۔"

"کیا ابھی ہوش میں ہے؟"

"جی سائیں! چپ چاپ بیٹھی ہوئی ہیں۔"

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر جانے لگا۔ ملازمہ اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگی۔ وہ حویلی کے مختلف حصوں سے گزرتا ہوا' اس وسیع و عریض کمرے میں پہنچا۔ وہ ایک سوئنگ چیئر پر بیٹھی آگے پیچھے ہولے ہولے جھول رہی تھی۔ وہ اس کے سامنے آ کر تن کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے اکڑنے اور سینہ تان لینے کا سبیکا پر کوئی خاطر خواہ اثر نہیں ہوا۔ وہ خاموشی سے جھولتی رہی اور پلکیں جھپکائے بغیر باپ کو دیکھتی رہی۔ باپ نے ایک پاؤں آگے بڑھا کر

جھولتی ہوئی کرسی کو روک دیا پھر کہا۔ "ہوں! رسی جل رہی ہے، مگر بل نہیں جا رہے ہیں۔"

وہ اس پر جھک کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر طنزیہ انداز میں بولا۔ "کیا وہ اب بھی یاد آتا ہے؟"

اس نے جواب نہیں دیا لیکن باپ کی آنکھوں سے آنکھیں ملاتی رہی۔ اس کی آنکھوں میں نہ محبت تھی، نہ نفرت تھی اور نہ غصہ تھا۔ بس ایک اعتماد تھا کہ وہ آج نہیں تو کل اس پل صراط سے گزر جائے گی۔ عبدالقادر کو یہ دیکھ کر غصہ آتا تھا کہ دماغی کمزوری کے باوجود اس کا اعتماد متزلزل نہیں ہو رہا تھا۔

وہ پلٹ کر اس سے دور گیا۔ وہ پھر جھولنے لگی۔ وہ دور سے پلٹ کر بولا۔ "تم نے گھر سے فرار ہو کر بغاوت کی دھمکی دی۔ میں نے تمہیں زنجیریں پہنا دیں۔ تم یہاں سے باہر نہیں جا سکو گی۔ اگر تمہیں آزادی مل جاتی تو تم دنیا والوں کے سامنے بے حیائی سے علی کی حمایت میں بولتیں۔ میں نے تمہاری آواز کو دنیا والوں تک پہنچنے سے روک دیا ہے۔"

وہ اس کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ "تم علی سے ملنے اور میرے خلاف سازشیں کرنے کے لئے جس دماغ سے تدبیریں سوچا کرتی تھیں، میں تمہارے اس دماغ کو مفلوج بنا رہا ہوں۔"

اس نے پھر اس پر جھک کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر طنزیہ انداز میں پوچھا۔ "کیا تمہارا دماغ اب کوئی تدبیر سوچنے کے قابل رہا ہے؟"

وہ بدستور چپ تھی۔ پلکیں جھپکائے بغیر اس سے آنکھیں ملا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں پھر وہی اعتماد تھا جسے دیکھ کر وہ غصے سے تلملا جاتا تھا۔ وہ ڈانٹ کر بولا۔ "چپ کیوں ہو؟ جواب دو۔"

اس نے ذرا چپ رہ کر جواب کا انتظار کیا لیکن وہ جیسے گونگی اور بہری ہو گئی تھی۔ سن رہی تھی نہ بول رہی تھی۔ وہ غصے سے بولا۔ "یہ تمہاری دونوں نوکرانیاں کہتی ہیں کہ تم تنہائی میں بولتی ہو نشے میں بڑبڑاتی رہتی ہو۔ پھر میرے سامنے چپ کیوں ہو جاتی ہو؟ چپ کیوں ہو جاتی ہو؟ بولو۔ مجھے غصہ نہ دلاؤ۔"

وہ پلکیں نہیں جھپکا رہی تھی۔ اس کی نظریں برچھی کی طرح دماغ میں لگ رہی تھیں۔ وہ اس سے منہ پھیر کر سیدھا کھڑا ہو گیا۔ ایک قدم پیچھے ہٹ کر بولا۔ "کچھ پانے کے لئے کچھ کھونا پڑتا ہے۔ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں۔ تم کچھ کھو کر علی کو پا سکتی ہو۔ تمہیں فیصلہ کرنا چاہئے کہ اپنی ماں کی زمینیں عزیز ہیں یا علی اہم ہے۔ اگر اس کے ساتھ زندگی گزارنا چاہتی ہو تو تمام زمینیں میرے نام کر دو۔ کاغذات تیار ہیں۔ ان پر دستخط کر دو پھر تمہارے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں رہے گی۔ تم سیدھی علی کے پاس جا سکو گی۔"

وہ خاموشی سے جھول رہی تھی۔ وہ گرج کر بولا۔ "میں جو کچھ کہہ رہا ہوں تمہاری بہتری کے لئے کہہ رہا ہوں۔ تم آج چاہو گی، آج آزادی حاصل کر لو گی۔ آج ہی علی کے پاس چلی جاؤ گی۔ بولو کیا کہتی ہو؟"

خاموشی۔ بڑ بولے ظالم کے سامنے ہتھیار بن جانے والی خاموشی۔ صبر کا پیمانہ چھلکا دینے اور طیش دلانے والی خاموشی۔ اس نے ایک دم سے جھنجلا کر اسے لات ماری۔ وہ لات کھا کر کرسی کی پشت سے ٹکرائی۔ اس نے ایک ہاتھ سے کرسی کو اٹھا کر پیچھے کی طرف الٹ دیا۔ وہ بھی کرسی سمیت پیچھے کی طرف الٹ گئی۔ تکلیف کی شدت سے بھی کراہ نہیں نکلی۔ خاموش رہنے کی ایسی ضد تھی کہ تکلیف کے باوجود چیخ کی آواز بھی نہیں نکال رہی تھی۔

وہ کرسی کے نیچے دبی ہوئی تھی۔ باپ نے کرسی کو لات مار کر ایک طرف پھینکا پھر اس کے بالوں کو مٹھی میں جکڑ کر اس کے سر کو فرش پر دے مارا۔ یہ کیسی زبردست چوٹ لگی، یہ وہی جانتی تھی پھر بھی اس نے چیخ نہیں ماری۔ دونوں نوکرانیاں سہمی ہوئی ایک طرف کھڑی تھیں۔ اس کی سوتیلی ماں کا بھائی یعنی اس کا ماموں دروازے پر آ کر دیکھ رہا تھا۔ اس کی اتنی جرأت نہیں ہوئی تھی کہ وہ اس ظالم وڈیرے کا ہاتھ پکڑ لیتا۔ اس نے تو اس وقت بھی اس کا ہاتھ نہیں پکڑا تھا جب وہ اس کی بہن کو گولی مار رہا تھا۔

سبیکا کا چہرہ لہولہان ہو رہا تھا۔ وہ غصے سے پاگل ہو کر اسے پوری قوت سے مارتا جا رہا تھا۔ کبھی ہاتھوں سے، کبھی لاتوں سے، کبھی گھونسوں سے اور کبھی اس کی گردن پکڑ کر اسے رگیدتا ہوا دیوار کے پاس لے جا کر ٹکرا دیتا تھا۔ اسے کمزور بنانے کے لئے نشہ آور انجکشن لگایا جاتا تھا۔ وہ بہت کمزور ہو چکی تھی۔ برداشت کی حد تک مار کھاتی رہی پھر فرش

پر گر کر بے ہوش ہو گئی۔

اس نے غصے سے ہانپتے ہوئے دیکھا پھر اسے ٹھوکر مارتے ہوئے بولا۔ "تُو مجھ سے زیادہ ضدی نہیں ہے۔ میں تجھے بولنے پر مجبور کر دوں گا۔"

اس نے دوسری ٹھوکر ماری ایک نوکرانی نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "سائیں! اسے چھوڑ دو۔ یہ بے ہوش ہو گئی ہے۔"

اس نے توجہ سے بے ہوش ہونے والی کو دیکھا پھر اس پر تھوک کر جانے لگا۔ دروازے پر اس کا سالا کھڑا ہوا تھا۔ وہ اس کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے بولا۔ "بھائی صاحب! یہ آپ بہت اچھا کرتے ہیں۔ کبھی کبھی آ کر اسے لات جوتے کی خوراک دے دیتے ہیں۔ اب یہ اور زیادہ ڈھیٹ بن کر نہیں رہ سکے گی۔ اس کی ہڈیاں پسلیاں ٹوٹ رہی ہیں۔ یہ آپ کے حکم کے آگے سر جھکا دے گی۔"

وہاں کام کرنے والی عورتیں اور مرد حویلی کے پیچھے کچے مکانوں میں رہتے تھے۔ ایک ملازم نے بیٹھک میں آ کر اطلاع دی کہ ان کی ایک جوان ملازمہ سکھاں مر گئی ہے۔ وہ کئی دنوں سے بیمار تھی۔ اس کا علاج ہو رہا تھا۔ اس کے باوجود اس کی سانسیں پوری ہو چکی تھیں۔ سکھاں نے ماں باپ کی موت کے بعد بچپن سے وہیں خدمت گزاری کی تھی۔ اس کا آگے پیچھے کوئی نہیں تھا۔ موت کے بعد بھی اس کے پیچھے رہنے والا کوئی نہیں تھا۔

عبدالقادر اپنے سالے کے ساتھ تیزی سے چلتا ہوا وہاں آیا۔ اس کا بھائی ملازم سے کہہ رہا تھا۔ "اس کے کفن دفن کا انتظام کرو۔ میں ابھی رقم دے رہا ہوں۔"

عبدالقادر نے پوچھا۔ "کون مر گیا ہے؟"

اس کے بھائی نے کہا۔ "سکھاں کئی دنوں سے بیمار تھی۔ مر گئی ہے۔"

یہ کہہ کر وہ تدفین کے لئے رقم لینے اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔ عبدالقادر نے ایک صوفے پر بیٹھتے ہوئے سوچا۔ "کیا ہی اچھا ہوتا سکھاں کی جگہ سبیکا مر جاتی۔ کسی تشدد کے بغیر اس کی طبعی موت ہو جاتی تو وصیت کے مطابق ساری زمینیں میرے نام ہو جاتیں۔"

وہ سوچتے سوچتے چونک گیا۔ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے اطلاع دینے والے ملازم سے پوچھا۔ "سکھاں کی عمر کیا تھی؟"

وہ ہاتھ جوڑ کر بولا۔ "سائیں! وہ کوئی بیس بائیس برس کی تھی۔"

اس نے سوچتی ہوئی نظروں سے ملازم کو دیکھا پھر تیزی سے چلتا ہوا بھائی کے کمرے میں آیا۔ اس کا سالا دم ہلانے والے کتے کی طرح پیچھے پیچھے رہتا تھا۔ اس نے اپنے سالے سے کہا۔ "سچل! میں ایک بہت راز کی بات کہنے جا رہا ہوں۔ یہ راز تم سب کے اندر رہے گا۔ باہر نکلے گا تو گولی مار دوں گا۔"

پھر اس نے اپنے بھائی سے کہا۔ "نادر! ابھی کفن کے لئے رقم نہ دو۔ میری بات غور سے سنو۔ سکھاں نہیں مری ہے' میری بیٹی سبیکا مر گئی ہے۔ سکھاں کی میت حویلی میں لے آؤ۔"

نادر نے کہا۔ "بھائی! میں سمجھ گیا۔ سکھاں کی میت کو سبیکا کا نام دیا جائے گا۔ ہمارے خاندانی رواج کے مطابق سکھاں کی تدفین ہو گی۔"

"ہاں۔ تمام ملازموں کو بلاؤ۔ ہم انہیں دھمکی دے کر رازدار بنائیں گے۔ پھر وہ دیواروں سے بھی یہی کہیں گے کہ میری بیٹی کی موت ہوئی تھی۔ سبیکا کو دفنایا گیا ہے۔"

سچل نے کہا۔ "بھائی صاحب! گوٹھ کی عورتیں یہاں ماتم کرنے آئیں گی۔ وہ سبیکا کا منہ دیکھنا چاہیں گی۔"

"گوٹھ کی کسی عورت کو سکھاں کا منہ نہ دیکھنے دیا جائے۔ کسی بھی بہانے سے انہیں ٹالنے کی کوشش کی جائے بلکہ میت کو غسل کرانے اور کفن پہنا دینے کے بعد گوٹھ والوں کو اس کی میت کی اطلاع دی جائے۔ ان کے آتے آتے جنازہ اٹھایا جائے۔ اس طرح کوئی اس کا منہ نہیں دیکھ سکے گا۔"

"بھائی! فکر نہ کریں۔ آپ جیسا چاہیں گے' ویسا ہی ہو گا۔ کسی ملازم کی مجال نہیں ہے کہ وہ ہمارے حکم کے خلاف بیان دے سکے۔"

عبدالقادر نے کہا۔ "سبیکا کا ڈیتھ سرٹیفکیٹ حاصل کرنا بہت ضروری ہے۔ اس سے ثابت ہو گا کہ وہ طبعی موت مری تھی۔ میں ڈاکٹر احسان الحق کے پاس جا رہا ہوں۔ اس سے ڈیتھ سرٹیفکیٹ لکھوا کر لاؤں گا۔"

وہ اپنی پجارو میں وہاں سے روانہ ہو گیا۔ ڈاکٹر احسان الحق حیدر آباد میں بڑی شہرت کا حامل تھا۔ بہت مہنگا ڈاکٹر تھا۔ امیر کبیر افراد ہی اس سے علاج کرواتے تھے۔ اس ڈاکٹر
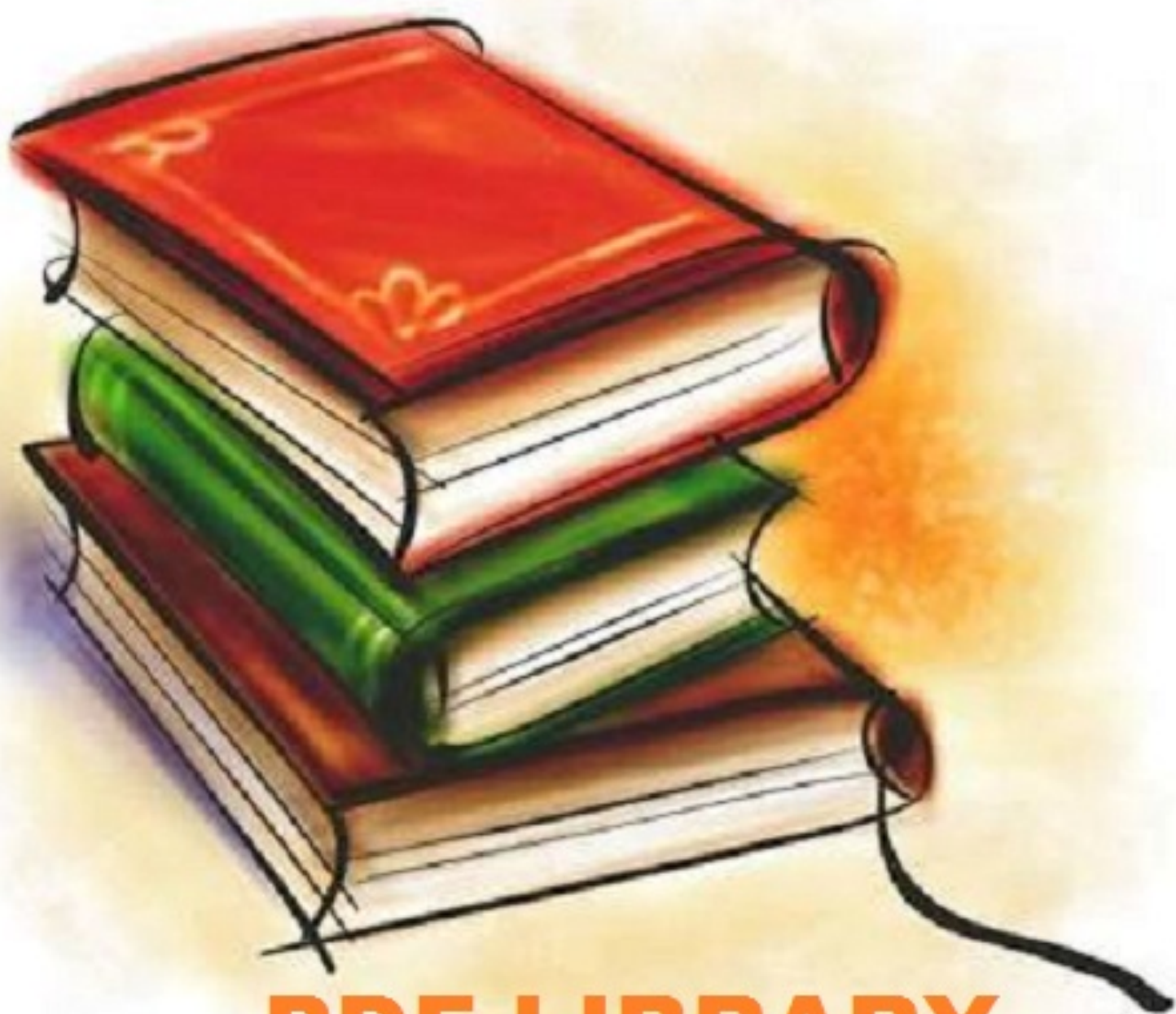
سے عبدالقادر کے گہرے مراسم تھے۔ اس کے باوجود اس نے ڈاکٹر کو حقیقت نہیں بتائی۔ اس کے سامنے غمزدہ ہو کر بولا۔ ”میری جوان بیٹی اللہ کو پیاری ہو گئی ہے۔“

ڈاکٹر نے اس کے گلے لگ کر افسوس کا اظہار کیا پھر کہا۔ ”میرے دوست! میں تمہارے غم میں برابر کا شریک ہوں۔ تمہاری ایک ہی اولاد تھی‘ وہ بھی اللہ کو پیاری ہو گئی۔ تمہیں صبر کرنا چاہئے۔“

وہ ماتمی آواز بنا کر بولا۔ ”ابھی شام سے پہلے تدفین ہو جائے گی۔ اس سے پہلے میں ڈیتھ سرٹیفکیٹ لینے آیا ہوں۔ تم ابھی چل سکتے ہو تو میرے ساتھ چلو۔ ورنہ مجھ پر بھروسا کرو اور طبعی موت کا ایک سرٹیفکیٹ لکھ دو۔“

”کیسی بات کرتے ہو؟ کیا میں تم پر بھروسہ نہیں کروں گا؟ ویسے وہ میری بھتیجی تھی‘ مجھے تمہارے ساتھ چلنا چاہئے لیکن یہاں مجھے ایک مرڈر کیس کے سلسلے میں پوسٹ مارٹم کے لئے جانا ہے۔ میں ابھی سرٹیفکیٹ لکھ دیتا ہوں۔“

ڈاکٹر نے یہ لکھ دیا کہ اس نے سبیکا کی لاش کا معائنہ کیا ہے۔ اس کی طبعی موت واقع ہوئی ہے۔ وہ ایک مستند اور مشہور و معروف ڈاکٹر تھا۔ اس کے جاری کئے ہوئے ڈیتھ سرٹیفکیٹ کو کوئی عدالت میں بھی چیلنج نہیں کر سکتا تھا۔ یوں ایک باپ نے اپنی زندہ بیٹی کا ناقابل انکار ڈیتھ سرٹیفکیٹ حاصل کر لیا تھا۔

وہ سلطان گوٹھ واپس آیا۔ وہاں میت کو غسل دے کر کفن پہنا دیا گیا تھا۔ عبدالقادر کے وہاں پہنچتے ہی گوٹھ والوں کو سبیکا کی موت کی اطلاع دی گئی اور کہا گیا کہ جنازہ تیار ہے۔ اسے قبرستان لے جانے والے ہیں۔

ایسے وقت سبیکا کو انجکشن لگایا گیا تھا۔ وہ نشے میں تھی۔ یہ نہیں جانتی تھی کہ زندہ ہونے کے باوجود اسی حویلی میں مر چکی ہے۔ اس کا جنازہ اٹھایا جا رہا ہے اور اسے دفن کرنے کے لئے قبرستان پہنچایا جا رہا ہے۔ وہ تھوڑی دیر تک نشے میں مست رہی پھر مدہوش ہو گئی۔ یہ بھی ایک طرح کی موت تھی۔ اپنی مرضی کے بغیر اپنے آپ سے غافل ہو جاتی تھی۔

عبدالقادر اسے اس طرح مارنا چاہتا تھا کہ کسی کو اس کے قتل کئے جانے کا شبہ نہ ہو۔ اگر وہ نشیلے انجکشن کے ذریعے مر جاتی تو یہ کہا جاتا کہ وہ نشے کی عادی ہو گئی تھی۔

اسے گولی مار کر یا کسی حادثے کا شکار بنا کر تمام گوٹھ والوں کو رازدار نہیں بنایا جا سکتا تھا اور نہ ہی طبعی موت کا ڈیتھ سرٹیفکیٹ حاصل کیا جا سکتا تھا۔

سکھاں کی قبر کے سرہانے سبیکا کے نام کا کتبہ نصب کر دیا گیا تھا۔ عبدالقادر نے نادر اور سچل سے کہا۔ ”میں کچھ عرصے کے لئے لندن جا رہا ہوں۔ ابھی سبیکا کی موت کی خبر عام نہ کی جائے۔ ہمارے مخالفین یقین نہیں کریں گے۔ شدید احتجاج کر کے قبر کھلوا کر دیکھنا چاہیں گے۔ میں دو ماہ بعد واپس آؤں گا تو اس وقت تک سکھاں ہڈیوں کا ڈھانچہ بن چکی ہو گی۔ قبر کھول کر دیکھنے والے اسے پہچان نہیں سکیں گے۔ انہیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ سبیکا ہے۔“

وہ دو ماہ کے لئے لندن چلا گیا۔ اپنے بھائی نادر اور سچل کو سختی سے تاکید کی تھی کہ سبیکا کو ہمیشہ مدہوش رکھا جائے‘ اسے ہوش و حواس میں نہیں رہنا چاہئے۔ وہ واپس آ کر مخالفین تک سبیکا کی موت کی خبر پہنچائے گا۔ جب ان مخالفین کو اس کی موت کا یقین ہو جائے گا تو پھر سبیکا کو رازداری سے گولی مار دی جائے گی۔

قانونی چارہ جوئی کرنے اور تمام زمینیں اپنے نام کرنے سے پہلے وہ اسے ہلاک نہیں کرنا چاہتا تھا۔

وہ بڑی چالبازی دکھا رہا تھا۔ سبیکا زندہ تھی لیکن اس کے حساب سے مر چکی تھی۔ سکھاں مر چکی تھی لیکن زندہ تھی۔ گوٹھ والوں سے کہا گیا تھا کہ وہ حویلی کی ملازمت چھوڑ کر کہیں چلی گئی ہے۔

☆======☆======☆

عبدالقادر نے لندن سے واپس آتے ہی اپنے وکیل کے ذریعے قانونی کارروائی کی۔ اپنے لئے ضمانت قبل از گرفتاری حاصل کی۔ اپنے پارٹی کے دو بڑے لیڈروں کے ساتھ تھانے میں حاضر ہو کر بیان دیا کہ وہ اپنی بیٹی سبیکا کو دو ماہ پہلے اس کی ننھیال لے گیا تھا۔ جس وقت پولیس والے اسے تلاش کرنے سلطان گوٹھ کی حویلی میں پہنچے تھے‘ اس وقت سبیکا ننھیال میں بیمار پڑی ہوئی تھی اور وہ اس بات سے بے خبر تھا کہ اس کے خلاف ایف آئی آر درج کرائی گئی ہے۔ اگر اسے معلوم ہوتا تو وہ اس ایف آئی آر کو جھوٹا ثابت کرنے کے لئے اپنی بیٹی کے ساتھ تھانے میں حاضر ہو جاتا۔

وہ اس کا ڈیتھ سرٹیفکیٹ تھانے میں پیش کر کے وہاں سے چلا گیا۔ تھانے والوں نے کمال احمد کو سبیکا کی موت کی اطلاع دی۔ انہیں عبدالقادر کا بیان سنایا اور ڈیتھ سرٹیفکیٹ کی ایک فوٹو اسٹیٹ کاپی انہیں دکھائی پھر کہا۔ "آپ لوگوں کا شبہ غلط تھا۔ اس نے اپنی بیٹی کو حبس بے جا میں نہیں رکھا تھا۔ وہ بیمار تھی اور بیماری میں چل بسی تھی۔"

کمال احمد نے گھر آ کر علی کو اور مرینہ کو یہ تمام تفصیلات بتائیں۔ مرینہ کے لئے اس سے بڑی خوش خبری اور کوئی ہو ہی نہیں سکتی تھی کہ سبیکا مر چکی ہے۔ ایک دم سے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ خوشی کے مارے اوپر کی سانس اوپر ہی رہ گئی۔ وہ بیٹھے بیٹھے تڑپنے لگی کیونکہ دوسری بار سانس نہیں لے پا رہی تھی۔ تڑپنے کے باعث رک رک کر سانس آنے لگی۔ کمال احمد نے اسے دیکھتے ہی گھبرا کر کہا۔ "علی! گاڑی نکالو۔ اسے فوراً اسپتال لے جانا ہے۔"

علی دوڑتا ہوا کوٹھی کے باہر آیا۔ وہاں ایک کار کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے ڈرائیور سے کہا۔ "مرینہ بی بی کو اسپتال لے جانا۔ گاڑی کو اسٹارٹ رکھو۔"

کمال احمد بیٹی کو سہارا دے کر کار تک لے آیا۔ وہ اِن ہیلر کے ذریعے اپنی سانسوں کو بحال رکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ سب گاڑی میں بیٹھ کر اسپتال پہنچ گئے۔ اسپتال کا عملہ انہیں اچھی طرح پہچانتا تھا۔ ڈاکٹروں سے بھی واقفیت تھی۔ مرینہ کو فوراً انتہائی نگہداشت کے کمرے میں پہنچایا گیا۔

کمال احمد اور علی اس کمرے کے باہر بے چینی سے ٹہلنے لگے۔ کمال احمد نے کہا۔ "میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ سبیکا کی موت کی خبر سن کر اسے اس قدر صدمہ پہنچے گا۔ اگر معلوم ہوتا تو میں کبھی اس کے سامنے یہ بات نہ کرتا۔"

علی بھی حیرانی سے سوچ رہا تھا۔ "یہ سبیکا سے حسد اور رقابت رکھتی ہے۔ اسے تو خوش ہونا چاہئے پھر اسے صدمہ کیوں پہنچ رہا ہے؟"

یہ سوچ کر وہ خود صدمے سے دوچار ہو رہا تھا۔ دل کو سمجھا رہا تھا۔ "یہ جھوٹ ہے۔ وہ نہیں مر سکتی۔ اس کا باپ جھوٹ بول رہا ہے۔ اس نے بیٹی کو کہیں حبس بے جا میں رکھا ہے۔ وہ ہمیں دھوکا دے رہا ہے۔ پتہ نہیں سبیکا کے ساتھ کیسا سلوک کر رہا ہو گا؟"

کمال احمد نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "تم پہلی بار مرینہ کی یہ حالت دیکھ رہے ہو اس لئے پریشان ہو۔ خدا کرے اسے زیادہ صدمہ نہ پہنچا ہو۔ دعا کرو اس کے دل کی دھڑکنیں نارمل ہو جائیں۔"

اس نے کہا۔ "انکل! میرا دل نہیں مانتا کہ سبیکا مر چکی ہے۔ اس کا باپ جھوٹ بول رہا ہے۔ کسی مصلحت سے حقیقت چھپا رہا ہے۔"

کمال احمد نے اسے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ ہونے والا داماد اس کی بیٹی کے لئے فکرمند ہے لیکن وہ تو سبیکا کے سحر میں ڈوبا ہوا تھا۔ اسے اس بات کی فکر نہیں ہے کہ مرینہ زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہے۔ جو مر چکی ہے اس کے لئے بڑی اپنائیت سے سوچ رہا ہے اور جو زندہ ہے اسے نظرانداز کر رہا ہے۔

وہ ناگواری سے بولا۔ "تم اسے زندہ سمجھو گے تو وہ زندہ نہیں ہو جائے گی۔ میں نے اس کا ڈیتھ سرٹیفکیٹ دیکھا ہے۔"

"ڈیتھ سرٹیفکیٹ جھوٹا ہو سکتا ہے۔ جعلی ہو سکتا ہے۔"

"حیدر آباد کے ایک بہت معزز اور معروف ڈاکٹر نے وہ سرٹیفکیٹ جاری کیا ہے۔ تم اس کے خلاف بولو گے تو اپنا سا منہ لے کر رہ جاؤ گے۔ اسے جعلی ثابت نہیں کر سکو گے۔"

اس نے کہا۔ "آپ دیکھتے آ رہے ہیں کہ عبدالقادر کس قدر چالباز ہے۔ وہ سبیکا پر ظلم کر رہا ہے۔ اگر وہ چالباز نہ ہوتا تو دو ماہ پہلے سبیکا کی موت کی اطلاع دے سکتا تھا۔ آپ ذرا سمجھنے کی کوشش کریں اس نے دو ماہ کی تاخیر سے اطلاع کیوں دی ہے؟"

"میرے پاس یہ سمجھنے کا وقت نہیں ہے۔ یہاں میری بیٹی کی جان پر بنی ہے اور تم ایک مرنے والی کو خواہ مخواہ زندہ کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔"

کمال احمد کے تیور دیکھ کر علی کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ وہ عاجزی سے بولا۔ "آپ مجھے غلط نہ سمجھیں۔ میں مرینہ کو اپنی جان سے زیادہ اہمیت دیتا ہوں۔ وہ ابھی ہمارے قریب ہے۔ اس بند کمرے میں ڈاکٹر پوری توجہ سے اٹینڈ کر رہے ہیں۔ میں چاہتا تھا کہ اس کی طبیعت بحال ہونے تک میں سبیکا کی بات کرتا رہوں۔ اس طرح آپ کا بھی دھیان بٹا رہے گا۔ آپ دوسرے معاملے پر گفتگو کرتے رہیں گے تو آپ کی پریشانیاں کچھ کم ہوتی

رہیں گی۔"

کمال احمد ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ بند دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ جب بیٹی کی ایسی حالت ہوتی تھی تو وہ مایوس ہو جایا کرتا تھا۔ ڈاکٹرز کہہ دیا کرتے تھے۔ "اسے صدمات سے دور رکھنے کی کوششیں نہیں کی جا رہی ہیں۔" اس بار بڑی خوش خبری نے اس کے دل کی دھڑکنوں کو جکڑ لیا تھا۔ کبھی کبھی خوشی کی شدت سے بھی دم نکل جاتا ہے۔

ابھی مقدر میں زندگی تھی۔ وہ موت کی دلہیز تک جا کر واپس آ جاتی تھی۔ اس کمرے کا دروازہ کھل گیا۔ ڈاکٹر باہر آیا تو وہ دونوں تیزی سے اس کے قریب آئے۔ کمال احمد نے سوالیہ انداز میں مخاطب کیا۔ "ڈاکٹر..........؟"

ایسے تخاطب کے پیچھے یہ سوال چھپا ہوا تھا کہ میری بیٹی کا کیا بنا؟

ڈاکٹر بہت پریشان تھا۔ تھکا ہوا سا لگ رہا تھا۔ ایک گہری سانس لے کر بولا۔ "خدا اس لڑکی پر رحم کرے۔ یہ جب صدمات سے دو چار ہو کر آتی ہے' مجھے آزمائش میں ڈال دیتی ہے۔ فی الحال خطرے سے باہر ہے لیکن اسے صبح تک I.C.U. میں رکھنا ہوگا۔ میرے علاوہ دوسرے ڈاکٹرز بھی اسے اٹینڈ کرتے رہیں گے۔ آپ گھر جائیں۔ کوئی تشویش کی بات ہوگی تو میں آپ کو اطلاع کر دوں گا۔"

شام ہو چکی تھی۔ وہ رات کو اسپتال میں نہیں رہ سکتے تھے۔ انہوں نے دروازہ کھول کر مرینہ کو دیکھا۔ وہ صاف و شفاف بستر پر چاروں شانے چت لیٹی ہوئی تھی۔ آنکھیں بند تھیں۔ ناک اور منہ پر آکسیجن ماسک چڑھا ہوا تھا۔ وہ بہت گہری نیند میں تھی۔ بہت آہستہ آہستہ سانسیں لے رہی تھی۔

کمال احمد اسے بڑی محبت سے دیکھ رہا تھا۔ علی سوچ رہا تھا۔ "تقدیر نے شاید سبیکا کو مجھ سے چھین لیا ہے۔ کیا اسے بھی چھین لے گی؟"

اس نے کمال احمد کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر وہاں سے چلنے کا اشارہ کیا۔ وہ دونوں کمرے سے باہر آئے۔ علی نے ایک کوریڈور سے گزرتے ہوئے کہا۔ "انکل! آپ گھر چلے جائیں۔ میں یہاں رہوں گا اور I.C.U. میں جا کر اسے دیکھتا رہوں گا۔"

"تم یہاں رات کیسے گزارو گے؟"

"یہاں کے ویٹنگ روم میں رہوں گا۔ آپ میری فکر نہ کریں۔ مرینہ میرے ساتھ

دو راتیں اسپتال میں رہی تھی۔ کیا میں اس کی خاطر ایک رات اسپتال میں نہیں رہ سکتا؟ آپ فکر نہ کریں۔ مرینہ کی طرف سے مطمئن ہو کر جائیں۔"

"ٹھیک ہے میں صبح اذان کے وقت ہی یہاں چلا آؤں گا پھر تم گھر جا کر آرام کرو گے۔"

وہ چلا گیا۔ اس نے اسپتال کے فون کے ذریعے جمشید کو مخاطب کیا اور کہا۔ "میں علی بول رہا ہوں۔ مرینہ یہاں اسپتال کے I.C.U. میں ہے۔ دوسری بری خبر یہ ہے کہ ہمیں سبیکا کی موت کی خبر ملی ہے۔ کیا تم یہاں اسپتال میں آ سکتے ہو؟"

"میں ابھی آ رہا ہوں۔"

علی نے ریسیور رکھا۔ اسی وقت اس کی امی مرینہ کے بھائی کے ساتھ وہاں آ گئیں۔ اس سے بولیں۔ "کہاں ہے میری بیٹی؟ کیسی ہے وہ؟ تم یہاں بیٹھے ہو' اس کے کمرے میں کیوں نہیں جاتے؟"

"امی! وہ I.C.U. میں ہے۔ وہاں بار بار جانے کی اجازت نہیں ہے۔"

"میں تو ضرور جاؤں گی۔ پتہ نہیں میری بچی کو کیا ہو گیا ہے' کس کی نظر لگ گئی ہے؟ مجھے وہاں لے چلو۔"

وہ اپنی امی اور مرینہ کے بھائی کے ساتھ اس کمرے کے پاس آیا۔ دروازہ بند تھا لیکن شیشے والی کھڑکی پر سے پردہ ہٹا دیا گیا تھا۔ شیشے کے اس پار مرینہ بیڈ پر لیٹی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ گیس ماسک کے ذریعے اسے آکسیجن پہنچائی جا رہی تھی۔ وہ آنکھیں بند کئے سو رہی تھی۔ ایک نرس اس کی نبض چیک کر رہی تھی۔ ہاجرہ بی اس کی یہ حالت دیکھ کر رونے لگیں۔ علی نے ان کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "امی! یہاں سے چلیں۔ ڈاکٹر نے دیکھا تو سخت اعتراض کرے گا۔"

وہ تینوں پھر ویٹنگ روم میں آ گئے۔ اس کے بھائی نے پوچھا۔ "ڈاکٹر کیا کہہ رہے ہیں؟"

علی نے کہا۔ "ڈاکٹر نے کہا ہے یہ خطرے سے باہر ہے لیکن صبح تک مسلسل نگہداشت میں رکھا جائے گا۔ آپ لوگ جائیں۔ کل صبح وزیٹنگ آورز میں آ جائیں۔ میں یہاں اس کا خیال رکھوں گا۔"

ہاجرہ بی نے کہا۔ ”بیٹے! میرا دل نہیں مانتا کہ میں اس کو چھوڑ کر جاؤں لیکن تم یہاں رہو گے تو مجھے اطمینان رہے گا۔“

انہوں نے جاتے جاتے تاکید کی۔ ”یہاں سو نہ جانا۔ ایک ایک منٹ میں جا کر اسے دیکھتے رہنا۔ اس نے رات رات بھر تمہاری تیمار داری کی ہے۔ تمہارا فرض ہے کہ صبح تک جاگتے رہو۔“

وہ اسپتال کے باہر تک بولتی ہوئی گئیں پھر مرینہ کے بھائی کے ساتھ کار میں بیٹھ کر چلی گئیں۔ تھوڑی دیر بعد جمشید آ گیا۔ علی نے اس کے ساتھ ویٹنگ روم میں آ کر اسے بتایا کہ عبدالقادر نے گرفتاری سے قبل اپنی ضمانت کرائی ہے اور اپنی صفائی میں بیان دیا ہے۔ اس کے بیان کے مطابق سبیکا کچھ روز بیمار رہنے کے بعد وفات پا چکی ہے۔ اس کی وفات کو دو ماہ گزر چکے ہیں اور اب اس نے بیٹی کی موت کی اطلاع دی ہے۔ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ اصل معاملات ہم سے چھپا رہا ہے۔ میرا دل کہتا ہے کہ سبیکا زندہ ہے۔

جمشید نے کہا۔ ”عبدالقادر نے اس کا ڈیتھ سرٹیفکیٹ ضرور پیش کیا ہو گا؟“

”ہاں۔ حیدر آباد کے ایک بہت معروف ڈاکٹر نے وہ سرٹیفکیٹ جاری کیا ہے۔ اسے کوئی جھٹلا نہیں سکے گا۔ تم میری بات مانو۔ وہ کم بخت مکاری دکھا رہا ہے۔ سبیکا زندہ ہے اور اس نے اسے کہیں قید کر رکھا ہے۔ میں وہاں جانا چاہتا ہوں۔ اسے تلاش کرنا چاہتا ہوں۔“

جمشید اس کی باتوں پر غور کرنے لگا۔ علی نے پوچھا۔ ”کیا سوچ رہے ہو؟“

اس نے کہا۔ ”اگر سبیکا زندہ ہے اور اس پر ظلم ہو رہا ہے تو ہمارا فرض ہے کہ ہم اسے ڈھونڈیں اور ظلم سے نجات دلائیں لیکن اس مقصد کے لئے ہمیں اس کے گوٹھ جانا ہو گا۔ ہم نے متحد ہو کر اس شہر میں اسے کتا بنا دیا ہے لیکن وہ اپنے گوٹھ میں ببر شیر ہو گا۔ وہاں اس کے سینکڑوں غلام اور حمایتی ہوں گے۔ وہ ہمیں وہاں سے زندہ نہیں آنے دیں گے۔“

”ہمیں کچھ تو کرنا ہی ہو گا۔ ہم اسے بے یار و مددگار تو نہیں چھوڑ سکتے۔“

”ہم پولیس کی مدد لے کر وہاں جا سکتے ہیں۔ میرے ابو عبدالقادر سے سخت نفرت کرتے ہیں۔ میں ابھی جا کر ان سے بات کروں گا۔ وہ پولیس کے اعلیٰ افسران سے مدد

حاصل کریں گے۔ اس طرح ہم ان کے ساتھ جا کر سبیکا کے سلسلے میں درست معلومات حاصل کر سکیں گے۔“

”ایسا نہ ہو کہ پولیس کی مدد حاصل کرنے میں دیر ہوتی ہے اور وہاں اس پر قیامت گزر جائے۔ میں کل ہی وہاں جانا چاہتا ہوں۔ میری خاطر ابھی اپنے ابو کے پاس جاؤ۔ ابھی ان سے بات کرو۔“

جمشید اٹھ کر کھڑا ہو گیا پھر اس کے ساتھ اسپتال کے باہر آتے ہوئے بولا۔ ”میں ابھی جا کر کوشش کرتا ہوں۔ بائی دا وے مرینہ کیسی ہے؟ کیا تم یہاں صبح تک رہو گے؟“

”ہاں۔ میں صرف صبح تک نہیں آخری سانس تک اس کے ساتھ رہوں گا۔ اس نے بار بار عملی طور پر اپنی محبت کا ثبوت دیا ہے۔ مجھ پر بڑے احسانات کئے ہیں۔ میری کوشش ہو گی کہ میں کبھی اسے صدمہ نہیں پہنچاؤں گا۔“

جمشید اپنی بائیک پر بیٹھ کر چلا گیا۔ وہ ویٹنگ روم میں آ کر سوچنے لگا کہ مرینہ کو کبھی صدمہ نہ پہنچانے کی بات کر رہا ہے لیکن سبیکا کے پیچھے دیوانے کی طرح بھاگتا رہے گا تو کیا مرینہ خوش ہوتی رہے گی؟ اور اگر یہاں رہ کر مرینہ کی دلجوئی کرتا رہے گا تو کیا وہاں سبیکا بے یار و مددگار رہ کر دنیا سے گزر جائے گی؟ وہ کس کا ہاتھ تھامے گا‘ کس کا ہاتھ چھوڑے گا؟ کعبہ میرے آگے ہے تو کلیسا میرے پیچھے۔ ان دونوں میں سے کون کعبہ ہے اور کون کلیسا؟ اس کا فیصلہ آنے والا وقت ہی کر سکتا تھا۔

وہ ایک آدھ گھنٹے کے وقفے سے I.C.U. کی اس کھڑکی کے پاس جا کر اسے دیکھتا رہا۔ وہاں ڈیوٹی دینے والی نرس سے اس کی خیریت معلوم کرتا رہا اور صبح تک سبیکا کو یاد کر کے بے چین ہوتا رہا۔

صبح ہوتے ہی کمال احمد اور ہاجرہ بی وہاں آ گئے۔ انہوں نے کھڑکی سے دیکھا۔ مرینہ لیٹی ہوئی تھی اور چھت کی طرف تک رہی تھی۔ اس کی ناک اور منہ پر اب تک آکسیجن ماسک چڑھا ہوا تھا۔ کمال احمد نے ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر سے کہا۔ ”میری بیٹی جاگ رہی ہے۔ پلیز ہمیں اس سے ملنے کی اجازت دیں۔“

ڈاکٹر نے کہا۔ ”یہ وزیٹنگ آورز نہیں ہیں۔ آپ مریضہ کو آرام کرنے دیں۔“

ہاجرہ بی نے کہا۔ ”ہم اپنی بیٹی سے صرف دو باتیں کریں گے‘ اسے حوصلہ دیں گے

پھر وہاں سے چلے آئیں گے۔"

وہ کسی طرح ڈاکٹر کو راضی کر کے اس کے کمرے میں آئے۔ مرینہ نے سب سے پہلے علی کو دیکھا۔ اس کی آنکھیں مسکرانے لگیں پھر اس نے ڈیڈی اور ہاجرہ کو دیکھا۔ دونوں سے ہاتھ کے اشارے سے کہا کہ اسے لکھنے کے لئے کاغذ اور قلم دیا جائے۔ نرس نے فوراً ہی کاغذ کا ایک پیڈ اور قلم اسے دیا۔ مرینہ نے لکھا۔ "میں آسانی سے سانسیں لے رہی ہوں اور ایزی فیل کر رہی ہوں۔ ڈاکٹر سے ماسک ہٹانے کے لئے کہا جائے۔"

کمال احمد نے وہ تحریر پڑھ کر ڈاکٹر کو دی۔ ڈاکٹر نے اسے پڑھ کر مرینہ کا معائنہ کیا پھر نرس سے کہا۔ "ماسک ہٹا دو۔"

نرس نے حکم کی تعمیل کی۔ ماسک کو اور گیس سلنڈر کے اسٹینڈ کو وہاں سے ہٹا دیا۔ وہ سب مرینہ کے قریب آ گئے۔ باپ نے اس کے ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر کہا۔ "کیسی ہو بیٹی؟"

"ٹھیک ہوں ڈیڈ! میں آپ کو بہت پریشان کرتی ہوں نا؟"

"نہیں بیٹے! تم جان بوجھ کر ایسا نہیں کرتی ہو۔ تمہارا دل کمزور ہے، تم خود کو سنبھال نہیں پاتی ہو۔"

ہاجرہ بی نے کہا۔ "تمہاری مثال تو وہی ہے کہ سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے۔ تمہیں سبیکا کی موت کا صدمہ اٹھانے کی کیا ضرورت تھی؟ ایک بلا تھی، ٹل گئی۔ تمہیں تو خوش ہونا چاہئے۔"

مرینہ نے علی کو دیکھا۔ علی نے کہا۔ "واقعی یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ تم ہمیشہ اس کی مخالفت کرتی رہیں پھر تمہیں کیوں اتنی شدت سے اس کی موت کا صدمہ پہنچا ہے؟"

مرینہ نے اسے بڑے پیار سے دیکھا پھر کہا۔ "تم یہ دیکھتے آئے ہو کہ میں کبھی تم سے جھوٹ نہیں بولتی۔ کبھی دھوکا نہیں دیتی۔ آج بھی تمہیں دھوکے میں نہیں رکھوں گی۔ مجھے سبیکا کی موت کا صدمہ نہیں پہنچا تھا۔"

سب نے چونک کر اسے حیرانی سے دیکھا۔ باپ نے پوچھا۔ "جب صدمہ نہیں پہنچا تھا تو پھر تمہاری ایسی حالت کیوں ہو گئی تھی؟"

وہ علی کو دیکھتے ہوئے بولی۔ "مجھے اس کی موت پر صدمہ نہیں ہوا تھا۔ یہ کہتے ہوئے ندامت سی ہو رہی ہے کہ مجھے اچانک اتنی زیادہ خوشی ہوئی تھی کہ میرے دل کی دھڑکنیں بے قابو ہو گئی تھیں۔ نہ میں اس خوشی کی شدت کو روک سکی اور نہ ہی اپنی دھڑکنوں پر قابو پا سکی۔"

اس نے اپنا ہاتھ علی کی طرف بڑھایا۔ علی نے اس کے ہاتھ کو تھام لیا۔ وہ بولی۔ "میں شرمندہ ہوں۔ مجھے کسی کی موت پر خوش نہیں ہونا چاہئے لیکن کیا کروں؟ ہر طرف سے خوشیوں نے مجھے اس طرح جکڑ لیا تھا کہ مجھے اپنی سانسیں رکتی ہوئی سی محسوس ہو رہی تھیں۔ وہ بے اختیاری جذبہ تھا۔ مجھے معاف کر دو۔"

علی نے اس کے ہاتھ کو تھپکتے ہوئے کہا۔ "کوئی بات نہیں۔ اچانک حاوی ہونے والے جذبات پر قابو پانا مشکل ہو جاتا ہے۔"

کمال احمد نے کہا۔ "ہم آج تک یہی دیکھتے آئے تھے کہ صدمات کی شدت سے تمہارا دل ڈوبنے لگتا تھا۔ آج پہلی بار خوشی کی شدت سے تمہارے دل کی دھڑکنیں پاگل ہو گئی تھیں۔"

علی نے کہا۔ "تمہیں یہ باتیں یاد رکھنی چاہئیں۔ نہ زیادہ صدمہ اٹھانا چاہئے اور نہ ہی کسی بات سے زیادہ خوش ہونا چاہئے۔"

مرینہ پوچھا۔ "کیا آپ سب تمام رات یہاں رہے تھے؟"

اس کے ڈیڈی نے کہا۔ "ہم ابھی آئے ہیں۔ علی تمہارے پاس تھا۔ یہ تمام رات جاگتا رہا ہے۔"

مرینہ نے خوش ہو کر بڑے فخر سے اسے دیکھا۔ اسے یہ سن کر اپنی جیت کا احساس ہو رہا تھا کہ وہ اس کی محبت میں تمام رات جاگتا رہا ہے پھر اس بات کی بھی خوشی تھی کہ تقدیر اس پر مہربان ہے۔ اب اس کے محبوب کا دھیان بٹانے کے لئے کوئی دوسری نہیں رہی ہے۔

☆======☆======☆

وہ سوئنگ چیئر پر نیم دراز تھی۔ جسمانی طور پر بہت کمزور ہو گئی تھی۔ وہ سوچتی تھی پھر بھول جاتی تھی، کیا سوچ رہی تھی؟ ابھی کوئی اس کے پاس تھا۔ اس سے پیار بھری

باتیں کر رہا تھا۔ وہ کون تھا؟ وہ کبھی اسے پہچان لیتی تھی۔ کبھی بھول جاتی تھی۔

نشہ آور انجکشنوں نے اسے ذہنی طور پر مفلوج کر دیا تھا۔ عبدالقادر نے اپنے رازدار ڈاکٹر سے کہا تھا کہ اسے ہر دوسرے تیسرے دن کم سے کم مقدار میں نشے کی دوا دی جائے۔ ایسا نہ ہو کہ دوا کی زیادتی سے وہ مر جائے۔ وہ بیٹی سے زمینوں کے کاغذات پر دستخط کرانا چاہتا تھا۔ اس کی ماں کی وصیت کے مطابق اپنی حمایت میں اس سے لکھوانا چاہتا تھا کہ وہ باپ سے بہت محبت کرتی ہے۔ وہ شادی کے بعد بھی شوہر سے زیادہ باپ پر اعتماد کرتی رہے گی۔ اس لئے اپنی زمینیں باپ کے نام لکھ رہی ہے۔ باپ سے خون کا رشتہ ہے اور وہی سب سے زیادہ قابل اعتماد ہے۔

وہ ایسی کوئی تحریر لکھنے سے انکار کرتی آ رہی تھی۔ اس کے دستخط بھی اتنے مشکل تھے کہ آسانی سے ویسے ہی جعلی دستخط نہیں کئے جا سکتے تھے۔ کامیابی سے نقل کرنے والا کوئی جعل ساز اسے نہیں مل رہا تھا۔ وہ دنیا والوں کے سامنے بیٹی کی طبعی موت ثابت کر چکا تھا۔ آئندہ مرحوم بیٹی کی تمام جائیداد قانوناً باپ کو ہی مل سکتی تھی۔ اس کے باوجود وہ پکا کام کرنا چاہتا تھا۔

وہ نشہ آور دوا ایک طرح سے سلو پوائزن تھی۔ وہ بہت دھیرے دھیرے اسے جسمانی اور ذہنی طور پر مارتی جا رہی تھی۔ اب تو وہ اپنا نام بھی بھولنے لگی تھی۔ ڈاکٹر نے اسے نام یاد دلاتے ہوئے کہا۔ "اپنا نام کاغذ پر لکھو۔"

وہ سوچ سوچ کر لکھنے لگی۔ اپنے نام کے ہجے غلط لکھنے لگی۔ ڈاکٹر نے کہا۔ "اپنے دستخط کرو۔"

اس نے الٹے سیدھے دستخط کئے۔ وہ صحیح دستخط بھول چکی تھی۔ عبدالقادر نے کہا۔ "ڈاکٹر! یہ تم کیا کر رہے ہو؟ تم نے تو اس کے دستخط بھلا دیئے۔ اگر یہ نام بھول جائے گی، دستخط بھول جائے گی تو میرے کسی کام کی نہیں رہے گی۔ اسے یہ اہم باتیں یاد دلاؤ۔ اسے دی جانے والی نشہ آور دوائیں مجھے نقصان پہنچا رہی ہیں۔"

ڈاکٹر نے کہا۔ "آپ فکر نہ کریں۔ میں اس دوا کا توڑ جانتا ہوں۔ ایک ہفتے میں اس کے دماغ سے ضرر رساں دواں کے اثرات ختم ہو جائیں گے۔ اسے بھولی ہوئی باتیں یاد آ جائیں گی۔"

اسے پچھلے ایک ہفتے سے جسمانی اور دماغی توانائی کے لئے دوائیں دی جا رہی تھیں۔ تازہ پھل، خشک میوے، دودھ اور پھلوں کے جوس کھانے پینے کے لئے دیئے جا رہے تھے۔ اس طرح اسے نشہ آور دواؤں سے نجات مل گئی تھی۔ عبدالقادر اپنی خواب گاہ میں آ کر ٹہل رہا تھا اور پریشانی سے سوچ رہا تھا۔ یہ لڑکی مصیبت بن گئی ہے۔ اس سے پیچھا چھڑانا ہی ہوگا۔

کیا کوئی اپنی اکلوتی اولاد کا دشمن ہو سکتا ہے؟ ایسا ہوتا ہے کہ بیٹوں کو اپنا وارث بنایا جاتا ہے۔ بیٹی کی شادی قرآن مجید سے کرا دی جاتی ہے۔ ایسی مذموم رسم کے ذریعے بیٹی کے حقوق چھین لئے جاتے ہیں۔ اس طرح نہ کوئی داماد آتا ہے نہ بیٹی کی اولاد ہوتی ہے۔ تمام زمین جائیداد اپنے بیٹوں تک محدود رہتی ہے۔

عبدالقادر کا کوئی بیٹا نہیں تھا۔ صرف وہی ایک بیٹی تھی۔ کوئی اور جائیداد کا وارث نہیں تھا۔ اس کے باوجود وہ اکلوتی بیٹی کی جان کا دشمن تھا۔

یہ دشمنی بے مقصد نہیں تھی۔ اس کے پیچھے یہ حقیقت تھی کہ سبیکا اس کی اپنی بیٹی نہیں تھی۔ اپنا خون نہیں تھی۔ اس نے سبیکا کی بیوہ ماں سے شادی کی تھی۔ وہ اس وقت تقریباً پچاس کروڑ کی زمینوں کی مالک تھی۔ بیوہ ہونے کے بعد لندن چلی گئی تھی۔ وہاں عبدالقادر نے اسے شادی کی پیشکش کی تھی۔

اس بیوہ نے کہا۔ "میں ماں بننے والی ہوں۔ ایک آدھ برس کے بعد شادی کے متعلق سوچوں گی۔"

اس نے کہا۔ "زچگی کے بعد نکاح پڑھوا لو۔ تم جس بچے کو جنم دو گی، وہ پاکستان میں میرا بچہ کہلائے گا۔ اس بچے کو کبھی یہ نہیں بتانا کہ میں اس کا سوتیلا باپ ہوں۔ اسے معلوم ہوگا تو وہ مجھے دل سے نہیں چاہے گا۔"

بیوہ نے کہا۔ "میں اپنی تمام زمینیں اور جائیداد اپنے بچے کے نام لکھوں گی۔ اگر تم دوسری شادیاں کرو گے اور ان سے اولادیں ہوں گی تو انہیں میری زمینوں اور جائیداد میں سے ایک تنکا بھی نہیں ملے گا۔"

ایسے تمام اہم معاملات طے ہونے کے بعد وہ بیوہ عبدالقادر کے نکاح میں آ گئی۔ پاکستان میں تمام رشتے داروں کو یہ خوشخبری سنا دی گئی کہ وہ سلطان گوٹھ کی ایک دولت

مند بیوہ سے شادی کر چکا ہے۔ چار ماہ بعد خبر سنائی کہ وہ باپ بننے والا ہے۔ ادھر سبیکا جنم لے چکی تھی۔ زچگی کے وقت کچھ ایسی پیچیدگیاں پیش آئی تھیں جن کے باعث ڈاکٹر نے کہہ دیا تھا کہ وہ آئندہ ماں نہیں بن سکے گی۔ سبیکا کی ماں آئندہ عبدالقادر کے لئے کسی بیٹے یا بیٹی کو جنم نہیں دے سکے گی۔

ہر دولت مند وراثت کے لئے ایک یا ایک سے زیادہ بیٹوں کی تمنا کرتا ہے۔ عبدالقادر نے وقتی طور پر اس خواہش کو بھلا دیا۔ دوسرے سال وہ اپنی بیوی اور بیٹی سبیکا کے ساتھ لندن سے پاکستان آ گیا۔ یہاں سب ہی سبیکا کو اس کی اپنی بیٹی سمجھتے رہے۔ اس نے یہ راز اب تک اپنے سگے بھائی سے بھی چھپا رکھا تھا۔ جب سبیکا کی ماں کا انتقال ہوا تو اس نے اپنی اولاد کے لئے دوسری شادی کی۔ دوسری بیوی کو پہلی رات وارننگ دی کہ لڑکی پیدا نہ کرے۔ اسے ہر حال میں بیٹا چاہئے۔ ایک سال کے بعد اس نے بتایا کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ عبدالقادر نے پھر کہا کہ وہ بیٹا چاہتا ہے۔ بیٹی ہو گی تو اسے طلاق دے دے گا۔

اس نے زچگی سے پہلے الٹرا ساؤنڈ کروایا۔ رپورٹ ملی کہ وہ بھی ایک بیٹی کو جنم دینے والی ہے۔ وہ رونے اور گڑگڑانے لگی کہ اسے طلاق نہ دی جائے۔ اس کے سالے سچل نے بھی التجا کی۔ وہ برسوں سے عبدالقادر کا فرمانبردار منشی تھا۔ اس کا سالا بننے کے بعد حویلی میں آ کر رہنے لگا تھا۔

اس نے اپنی بیوی پر الزام لگایا کہ وہ بدچلن ہے۔ وہ اپنے کسی یار کی بیٹی کو جنم دینے والی ہے۔ ایسا شرمناک الزام سن کر وہ باغی ہو گئی۔ اس نے کہا۔ ”اپنی بیٹی کو تسلیم نہیں کرو گے۔ مجھے طلاق دو گے تو میں یہاں سے جا کر تمہیں بدنام کروں گی کہ تم شادی کے قابل نہیں ہو۔ تمہاری پہلی بیوی نے بھی ناجائز بیٹی پیدا کی تھی۔“

اس نے اپنے بھائی سچل سے کہا۔ ”تم بھی یہ حویلی چھوڑ دو۔ میرے ساتھ چلو۔“

سچل نے کہا۔ ”کیا تم ان وڈیروں کے مزاج کو سمجھتی نہیں ہو۔ یہ ہم دونوں کو گولی مار دے گا۔ عقل سے کام لو۔ طلاق مل چکی ہے۔ اسے چیلنج نہ کرو کہ آئندہ اس پر کیچڑ اچھالو گی۔ اس سے معافی مانگنے کے بعد جاؤ۔“

اس نے معافی نہیں مانگی۔ ایک گاڑی پر بیٹھ کر دوسرے گوٹھ کی طرف اپنے میکے

جانے لگی۔ وہ گاڑی والا عبدالقادر کا زرخرید تھا۔ آگے ایک ویرانے میں گڑھا کھودا گیا تھا۔ عبدالقادر نے اس کی گاڑی کا راستہ روکا۔ سچل اپنے بہنوئی کے ساتھ آیا تھا۔ بہن کے لئے رحم کی بھیک مانگ رہا تھا لیکن اس نے اس کی آنکھوں کے سامنے بہن کو گولی مار دی اور وہ قاتل بہنوئی کا ہاتھ نہ پکڑ سکا۔ وہ اب تک اس کا غلام بنا ہوا تھا۔

اس نے سچل کو اپنے کمرے میں بلا کر کہا۔ ”سبیکا کو اب نشہ آور دوا نہیں دی جا رہی ہے۔ اس دوا کا توڑ دیا جا رہا ہے۔ وہ رفتہ رفتہ نارمل ہو گی تو پھر میرے لئے دردِ سر بنے گی۔ اب اس مصیبت کو پالنا دانشمندی نہیں ہو گی۔“

وہ بولا۔ ”بھائی صاحب! آپ جو بھی فیصلہ کریں۔ میں تو آپ کے ساتھ رہتا ہوں۔ آپ حکم کریں۔“

”اپنی بہن کے قریب ایک گڑھا کھدواؤ۔ اندھیرا ہونے کے بعد ہم سبیکا کو وہاں لے جائیں گے۔“

”سمجھ گیا بھائی صاحب! اندھیرا ہونے سے پہلے گڑھا تیار ہو جائے گا۔“

وہ حکم کی تعمیل کے لئے چلا گیا۔ عبدالقادر' سبیکا کے کمرے میں آیا۔ دروازے پر پہنچ کر ٹھٹک گیا۔ وہ کمرے میں اِدھر سے اُدھر جوگنگ کر رہی تھی۔ اس نے ڈانٹ کر پوچھا۔ ”یہ کیا ہو رہا ہے؟“

دونوں نوکرانیاں ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو گئیں۔ ایک نے کہا۔ ”سائیں! یہ اسی طرح اچھلتی کودتی رہتی ہیں۔ یہ اب پہلے جیسی کمزور نہیں ہیں۔“

سبیکا اسے دیکھ کر رک گئی تھی۔ تولئے سے چہرے اور گردن کا پسینہ پونچھ رہی تھی۔ وہ اس کے قریب آتے ہوئے بولا۔ ”ہوں۔ تو تم توانائی حاصل کر رہی ہو؟“

وہ کچھ نہ بولی۔ چپ چاپ پلکیں جھکائے بغیر اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگی۔ وہ غصے سے بولا۔ ”تم میرے سامنے چپ کیوں ہو جاتی ہو؟ میری باتوں کا جواب کیوں نہیں دیتیں؟ کیوں مجھے غصہ دلاتی ہو؟“

وہ خاموش رہی۔ اس نے طمانچہ مارنے کے لئے ہاتھ اٹھایا۔ سبیکا نے ہاتھ پکڑ لیا۔ اس نے حیرانی اور غصے سے اسے دیکھا۔ اتنے عرصے بعد اس نے پہلی بار اس کا ہاتھ پکڑا تھا۔ وہ اپنا ہاتھ چھڑا کر پیچھے ہٹ گیا۔ عقل سمجھا رہی تھی' اب اسے مارنا پیٹنا مناسب

نہیں ہے۔ اس کی چند گھنٹوں کی زندگی رہ گئی ہے۔ اسے سرکشی کرنے دی جائے۔ وہ خواہ مخواہ اسے مارتے مارتے خود ہی تھک جاتا ہے۔

وہ پیچھے ہٹ گیا۔ پلٹ کر کمرے سے باہر آگیا۔ اس کا بھائی تیزی سے اس کی طرف آ رہا تھا۔ وہ قریب آ کر دھیمی آواز میں بولا۔ ”بہت بری خبر ہے۔ وہ علی رمزی پولیس والوں کے ساتھ حویلی کی طرف آ رہا ہے۔“

وہ پریشان ہو کر بولا۔ ”وہ کم بخت اچانک کیسے آگیا؟ فوراً مسلح گارڈز کے ذریعے سبیکا کو قابو میں کرو۔ اس کے منہ پر ٹیپ چپکاؤ اور تہہ خانے میں لے جاؤ۔ میں ان لوگوں سے نمٹنے جا رہا ہوں۔“

وہ حویلی سے باہر آیا تو دور سے پولیس وین آتی دکھائی دی۔ اس نے اپنے خاص کارندے سے کہا۔ ”تمام ملازموں سے کہہ دو کہ پولیس والے آگئے ہیں۔ ان کے سامنے انہیں وہی بیان دینا ہے‘ جو انہیں سمجھایا گیا ہے۔ کسی کے چہرے سے گھبراہٹ ظاہر ہوگی تو میں اسے گولی مار دوں گا۔“

وہ کارندہ وہاں سے چلا گیا۔ پولیس وین قریب آ کر رک گئی۔ ایک پولیس افسر نے گاڑی سے اترتے ہوئے کہا۔ ”مسٹر سومرو! آپ نے تو شہر کی طرف آنا ہی چھوڑ دیا ہے۔ کیا بات ہے‘ گوٹھ سے باہر نہیں نکل رہے ہیں؟“

اس وین کے پیچھے ایک کار آ کر رکی۔ اس میں سے علی اور جمشید باہر آ رہے تھے۔ عبدالقادر نے کہا۔ ”آفیسر! میری بات چھوڑیں۔ یہ بتائیں کس مقصد سے آئے ہیں؟“

”ہم حویلی کی تلاشی کا وارنٹ لے کر آئے ہیں۔ یہ شبہ کیا جا رہا ہے کہ آپ کی بیٹی زندہ ہے اور آپ نے اسے حبس بے جا میں رکھا ہے۔“

وہ بولا۔ ”میری بیٹی یہاں نہیں ہے۔ آپ میرے ساتھ چلیں۔ وہاں چل کر آپ اسے دیکھ سکیں گے۔“

وہ افسر کے ساتھ پولیس وین میں آ کر بیٹھ گیا۔ علی اور جمشید اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ کار میں آ گئے۔ وہ گاڑیاں وہاں سے چل پڑیں۔ عبدالقادر انہیں گوٹھ کے باہر قبرستان میں لے آیا۔ پولیس افسر نے پوچھا۔ ”یہاں کیوں لائے ہو؟“

”میری بیٹی یہاں رہتی ہے۔“

وہ انہیں ایک قبر تک لے آیا۔ اس قبر کے سرہانے کتبے پر سبیکا کا نام اس کی پیدائش اور موت کی تاریخیں لکھی ہوئی تھیں۔ اس کی قبر دیکھ کر اور کتبے پر اس کا نام پڑھ کر علی کا دل ڈوبنے لگا۔ اس کے اندر ایک شور ابھرنے لگا۔ ”نہیں۔ وہ نہیں مر سکتی۔ وہ زندہ ہے۔ مجھے یقین نہیں آ رہا ہے کہ وہ مجھ سے روٹھ کر یہاں قبر میں چھپی ہوئی ہے۔“

وہ تڑپ کر پولیس افسر سے بولا۔ ”سر! مجھے یقین نہیں آ رہا ہے۔ سبیکا کے نام کا کتبہ کسی کی بھی قبر کے سرہانے نصب کیا جا سکتا ہے۔“

افسر نے تائید میں سر ہلا کر عبدالقادر سے کہا۔ ”ہم اپنے اطمینان کے لئے حویلی کی تلاشی لیں گے۔“

”مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ آپ حویلی میں چلیں۔“

وہ جانتا تھا کہ اتنی دیر میں سبیکا کو تہہ خانے میں پہنچا کر اسے خاموش رہنے پر مجبور کر دیا گیا ہوگا۔ پولیس آفیسر نے سپاہیوں نے اور علی اور جمشید وغیرہ نے حویلی کے اندر آ کر ایک ایک کمرے اور اسٹور روم وغیرہ کی تلاشی لی۔ وہاں کام کرنے والی عورتوں اور مردوں سے سوالات کئے۔ سب نے یہی بیان دیا کہ سبیکا بی بی اللہ کو پیاری ہو گئی ہیں۔ ان کی میت سب نے دیکھی ہے۔

اس کے بعد شبے کی کوئی گنجائش نہیں رہی۔ علی کو اس کی موت کا یقین آتے ہی‘ وہ چکرا کر بیٹھ گیا۔ جمشید وغیرہ نے اسے صبر کی تلقین کی۔ اسے سہارا دے کر کار میں بٹھایا پھر وہ قافلہ وہاں سے واپس چلا گیا۔

عبدالقادر کی جان میں جان آئی تھی لیکن اس کا اطمینان ختم ہو گیا۔ عقل کہہ رہی تھی‘ یہ کالج کے سرپھرے لڑکے ہیں پھر کسی دن آ سکتے ہیں۔ اب کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہئے۔ آج یہ قصہ تمام کر دینا چاہئے۔

سبیکا کو تہہ خانے میں رکھا گیا تھا۔ وہاں گرمی اور گھٹن سے برا حال تھا۔ رات کو تاریکی پھیلنے کے بعد اسے وہاں سے نکالا گیا۔ اس کے دونوں ہاتھ پیچھے کی طرف بندھے ہوئے تھے اور منہ پر ٹیپ چپکا دیا گیا تھا۔ وہ تہہ خانے سے نکلنے کے بعد حویلی کے باہر نہیں جانا چاہتی تھی۔ اسے جبراً اٹھا کر پجارو کی پچھلی سیٹ پر ڈالا گیا۔ سچل اور ایک خاص

کارندے نے اسے جکڑ رکھا تھا۔ سچل اسے ریوالور دکھا کر دھمکی دے رہا تھا۔ عبدالقادر گاڑی اسٹارٹ کر کے گوٹھ سے باہر جانے لگا۔

وہ آنکھیں پھاڑے آس پاس بیٹھے ہوئے زر خرید غلاموں کو دیکھ رہی تھی۔ یہ اندازہ کر چکی تھی کہ اسے کہیں لے جا کر موت کے گھاٹ اتارا جائے گا۔

اسے گرفت میں رکھنے والے تگڑے تھے۔ گاڑی رکنے پر وہ ان کی گرفت سے نکل کر بھاگ نہیں سکتی تھی۔ دعائیں مانگ رہی تھی کہ کوئی غیبی مدد حاصل ہو جائے۔ پولیس موبائل وین ادھر سے گزرے اور اسے دیکھ کر اس کی جان بچالے۔ کوئی راہ گیر اسے دیکھ کر جان کی بازی لگائے۔ وہ اپنی تمام دولت اسے دے دے گی۔

ایسا کوئی معجزہ نہیں ہو رہا تھا۔ پجارو اس ویرانے میں آکر رک گئی' جہاں بہت عرصہ پہلے عبدالقادر نے اپنی دوسری بیوی کو طلاق دینے کے بعد بغاوت کی سزا دی تھی۔ اسے اس کے بھائی کے سامنے گولی مار کر ایک گڑھے میں چھپا دیا تھا۔ اس گڑھے میں مٹی بھر دی گئی تھی۔ اس کے برابر دوسرا گڑھا کھودا گیا تھا۔

سچل اس کارندے کی مدد سے سبیکا کو کھینچ کر گاڑی سے باہر لے آیا پھر اسے دھکا دیا۔ وہ گڑھے کے کنارے آکر گر پڑی۔ عبدالقادر رائفل لئے کھڑا تھا۔ اس نے کہا۔ ”تو ایسے وقت میں بہت کچھ بولنا چاہے گی۔ تجھے یہ بات حیران اور پریشان کر رہی ہوگی کہ ایک باپ قصائی کیوں بن گیا ہے؟ تجھے مرنے سے پہلے معلوم ہو جانا چاہئے کہ تو میری سوتیلی بیٹی ہے اور میں تیرا سوتیلا باپ ہوں۔“

وہ بے یقینی سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھنے لگی۔ اس نے کہا۔ ”بس اتنا ہی بتا دینا کافی ہے۔ اب تو اپنی ماں کے پاس جا کر باقی باتیں پوچھ لے۔“

اس نے نشانہ لیا لیکن ٹریگر دبانے سے پہلے ہی ”ٹھائیں“ سے گولی چلنے کی آواز سنائی دی۔ اس نے چونک کر دیکھا۔ اس کا خاص کارندہ زمین پر گر کر تڑپ رہا تھا پھر اس نے دم توڑ دیا۔ سچل کے ریوالور کا رخ اپنے بہنوئی کی طرف تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”ہم انسان ہیں۔ ہمیں اپنے آقا سے وفاداری کرنا چاہئے لیکن وفاداری میں کتا نہیں بننا چاہئے۔ میں مجبوراً کتا بن کر رہتا تھا اور میری بہن میرے خوابوں اور خیالوں میں آکر گالیاں دیتی رہتی تھی۔“

وہ غصے سے دھاڑتے ہوئے بولا۔ ”یہ کیا بکواس کر رہے ہو۔ ریوالور پھینک دو۔“

”نہ میں ریوالور پھینکوں گا نہ تم رائفل پھینکو۔ اس سے اچھا موقع' اس سے اچھی جگہ نہیں ملے گی۔ میری بہن کی قبر کے ساتھ تمہاری قبر بنے گی۔ گولیاں دونوں طرف سے چلیں گی۔ میں بھی جان دے کر بہن کا قرض ادا کروں گا۔“

”کتے! تو پاگل ہو گیا ہے۔“ اس نے گرجتے ہوئے گولی چلائی۔ دوسری طرف سے بھی گولی چل گئی۔ عبدالقادر کے حلق سے ایک کراہ نکلی۔ ہاتھوں سے رائفل چھوٹ گئی۔ زندگی نے بھی ساتھ چھوڑتے چھوڑتے اسے گڑھے میں گرا دیا۔ اس گڑھے کے کنارے سبیکا پڑی ہوئی تھی۔ سوتیلے باپ نے اس کے لئے گڑھا کھودا تھا اور خود اس میں گر پڑا تھا۔ اس کی رائفل سے چلی ہوئی گولی سچل کے قریب سے گزر گئی تھی۔ وہ اس کی رسیاں کھول رہا تھا۔

☆======☆======☆

علی نے اس کی قبر دیکھی تھی۔ اس کی میت دیکھنے والوں کے بیانات سنے تھے پھر اس کی موت کا یقین ہونے کے بعد لوٹ آیا تھا۔ مرینہ یہ دیکھ کر پھر اداس ہو گئی تھی کہ وہ سبیکا کو ڈھونڈنے سلطان گوٹھ گیا ہے لیکن جلد ہی اس کی اداسی دور ہو گئی۔ وہ آدھی رات کے بعد ناکام و نامراد واپس آیا تھا۔ اس بار یقین کر چکا تھا کہ وہ واقعی اس دنیا میں نہیں رہی۔

وہ اسپتال سے گھر آ گئی تھی۔ دل ہی دل میں بہت خوش تھی۔ بظاہر افسوس کر رہی تھی۔ علی کی دلجوئی کر رہی تھی۔ وہ دوسری صبح بولی۔ "آج چاند رات ہے۔ کل عید ہو گی لیکن ہم عید نہیں منائیں گے۔ میں تمہارے غم میں برابر کی شریک رہوں گی۔ تم بہت حوصلہ مند ہو۔ تمہیں صبر کرنا چاہئے۔"

وہ دن گزر گیا۔ شام ہی سے لوگ ہلالِ عید دیکھنے کے لئے بے چین تھے۔ بازار میں خریداروں کا ایسا ہجوم تھا کہ مرد، عورتیں، بوڑھے اور بچے سب ہی ایک دوسرے سے ٹکراتے ہوئے گزر رہے تھے۔ ایسے ہی وقت اسے سبیکا کی جھلک دکھائی دی۔ وہ چونک گیا۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ وہ مرچکی تھی پھر زندہ کیسے ہو سکتی تھی؟

وہ اس ہجوم کو چیرتا ہوا ادھر گیا، جہاں وہ نظر آئی تھی۔ اب دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ بازار کے ایک ایک حصے میں جا کر اسے تلاش کرتا رہا۔ شام سے آدھی رات ہو گئی۔ آدھی رات سے صبح ہونے لگی۔ وہ خوش نصیبی کی ایک جھلک دکھا کر اسے بدنصیب بنا گئی تھی۔ صبح کی اذان ہونے لگی تو وہ مایوس ہو کر گھر واپس آ گیا۔

سبیکا بھی اس کے لئے بھٹکتی رہی تھی۔ پہلے تو اس نے عبدالقادر کے خلاف پولیس کارروائی کرائی۔ سچل کی حمایت میں بیان دیا کہ اس نے اس کی جان بچانے کے لئے عبدالقادر پر گولی چلائی تھی۔ یوں بھی اس مرنے والی کو زندہ دیکھ کر یہ ثابت ہو گیا تھا کہ وہ

وڈیرا اسے حبس بے جا میں رکھ کر قتل کرنا چاہتا تھا۔

دوسرے دن شام کو واپس آتے ہی علی کے گھر گئی۔ پتہ چلا، وہ اس علاقے سے جا چکا ہے۔ اس نے نئی کوٹھی خریدی ہے۔ بازار کے قریب سے گزرتے وقت اس نے وہاں سے علی کے لئے ایک پرفیوم خریدا تھا۔ وہیں علی نے اس کی ایک جھلک دیکھی تھی۔

وہ اس نئی کوٹھی کے سامنے آئی تو نائٹ چوکیدار نے بتایا کہ وہ مرینہ کی کوٹھی میں گیا ہے۔ وہ چوکیدار سے اس کوٹھی کا پتہ معلوم کر کے اپنے گھر آ گئی۔ اسے یہ خیال پریشان کر رہا تھا کہ وہ مرینہ کی طرف مائل ہو چکا ہے۔ کیا اسے ان کے درمیان جانا چاہئے؟ وہ تو اسے مردہ سمجھ کر دوسری طرف بہل رہا ہے۔

وہ عید کی صبح تک پریشان رہی۔ دل علی کی طرف کھنچا جا رہا تھا پھر سچل نے بتایا کہ دو نوجوان پولیس والوں کے ساتھ اسے حویلی میں تلاش کرنے آئے تھے۔ دل کہہ رہا تھا کہ علی اسے تلاش کر رہا ہے۔ ایک بار اس سے مل لینا چاہئے۔

علی، کمال احمد اور اس کے دونوں بیٹوں کے ساتھ عید کی نماز پڑھ کر آیا۔ ہاجرہ بی نے ان کے لئے سویاں تیار کی تھیں۔ اسے عید کی خوشی نہیں تھی۔ وہ صرف اللہ تعالیٰ کے سامنے سر جھکانے گیا تھا۔ مرینہ خوش ہو کر سوچ رہی تھی۔ یہ صدمہ عارضی ہے۔ کوئی کسی کے لئے ساری عمر ماتم نہیں کرتا۔ علی بھی سب کچھ بھول کر اس کے وجود میں کھو جائے گا۔

وہ سب ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ایسے ہی وقت سبیکا وہاں آ گئی۔ اسے دیکھتے ہی علی خوشی کے مارے اچھل پڑا۔ سب ہی حیران ہوئے۔ مرینہ کے ہاتھوں سے سویوں کی پیالی چھوٹ گئی۔ اس نے پہلے علی کو خوشی سے اچھلتے ہوئے دیکھا پھر سبیکا کو دیکھتے ہی اوپر کی سانس اوپر ہی رہ گئی۔

صدمے کی شدت کو صرف وہی سمجھ سکتی تھی۔ دل نے یکبارگی دھڑکنے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ دوسری سانس بھی نہ لے سکی۔ بیٹھے بیٹھے ایک طرف ڈھلک گئی۔

بے شک، آدمی بلبلہ ہے پانی کا۔ خوشی کی شدت سے یا صدمے کے ایک جھٹکے سے پانی ہو جاتا ہے۔

☆======ختم شد======☆